موت سے واپسی









شورش کاشمیری



عرضِ ناشر

یہ کتاب پہلی مرتبہ آج سے سولہ سال قبل طبع ہوئی۔ ہر چند کہ تاخیر و تعویق کے اس طویل عرصہ میں اس کی مسلسل طلب رہی۔ لیکن رسد کے فرائض ہم پورے نہ کر سکے۔ اس کی وجوہ چونکہ سراسر ہمارے اشاعتی نظام کے حالات کی نامساعدت کا ایک حصہ ہیں۔ لہذا ان کی تفصیل بیان کرنے کا یہ ہنگام نہیں اور نہ قارئین کرام کو ان سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔

الحمد للہ کہ اب اسے زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے کی سعادت مجھ ناچیز کو حاصل ہوئی ہے۔ اور میں نے اپنے تئیں اسے مطبوعات چٹان کے معیار کے مطابق دیدہ زیب بنانے کی کوشش کی ہے۔

والد مرحوم آغا شورش کاشمیریؒ کے الفاظ میں یہ کتاب "ایک آزمائشی دور کی کہانی ہے اور اس کہانی کے ۲۳۲ دن ہیں، لیکن قید و بند کے ان دنوں میں جو کچھ بیتی، اب حیرت ہوتی ہے کہ اس نفسِ امّارہ پر واقعی یہ دن بھی نکل چکے ہیں۔ اور جو کچھ قلم سے نکلا ہے۔ کیا وہ اپنی ہی سرگزشت ہے۔

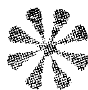
کتاب کے اس تعارف میں کسی قسم کا اضافہ میرے بس کی بات نہیں، اور مجھے اس ضمن میں اپنے عجز کا اعتراف بھی ہے۔

بہرحال کتاب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے اصرار پر میں اسے ان کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

محمود شورش

فہرس



آنکہ در کلبۂ احزاں پسر گم کردہ یافت

تو کہ چیزے گم نہ کردی از کجا پیدا شود

سرآغاز

یہ کتاب ——— میں کسی دیباچہ یا تعارف کے بغیر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب میں ہر چیز موجود ہے اس کے لئے کسی گذارش احوال واقعی کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہم ایک ایسے زمانہ میں سے گذر رہے ہیں یا ہمیں ایک ایسا عہد پیش آ گیا ہے کہ اپنی کہانی سُنانے سے قبل کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔

ایک بات جو میں نے اپنی کتابوں میں بہ التزام دہرائی ہے یہ ہے کہ اپنے بارے میں جو کچھ لکھتا ہوں نہ تو مجھے اس پر داد و تحسین کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کبھی یہ خواہش کی ہے کہ میرے سر پہ کلاہ شہرت رکھی جائے اور لوگ مجھے اس حکایت سرائی کے عوض بڑا آدمی سمجھیں ——— میں نہ چھوٹا ہوں نہ بڑا اور نہ مجھے اپنے متعلق کوئی سی غلط فہمی ہے، اپنے اللہ کا عاجز بندہ ہوں اور اس کی بارگاہ میں اتنا حقیر ہوں کہ میرے مقابلہ میں ایک ذرۂ خاک بھی عظیم ہے۔ لیکن جو لوگ کسی جمال و کمال کے بغیر اپنے خدا ہونے پر اصرار کریں اور خوان یزید کی ریزہ چینی کے باوجود اپنے تئیں اہل بیت کہلانے پر مُصر ہوں یا انہیں گمان ہو کہ وہ بڑے آدمیوں میں سے ہیں۔

انہیں نہ تو ذہن قبول کرتا ہے نہ دل مانتا ہے اور نہ قلم کے ہاں ان کے لئے کوئی عزت ہے۔ میں نے اس قسم کے خداؤں یا انسانوں سے ہمیشہ بغاوت کی ہے اور اکثر و بیشتر انہیں اعتنا سے محروم رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ہاں درد و الم کی حکایتیں چلی آتی ہیں اور غم و غصہ میرے طرز تحریر میں قلم کی شوخی و رنگینی کے باوجود راہ پیدا کر لیتے ہیں۔

"**موت سے واپسی**" میں ایسے ہی خداؤں کو عرش سے فرش پر لایا گیا اور اُن انسانوں کی نقابیں اتاری گئی ہیں جن کے اندر کا انسان مر چکا ہوتا لیکن انہیں بہرحال اپنے مافوق البشر ہونے پر اصرار ہوتا ہے۔

یہ کہانی بھی "**پسِ دیوارِ زنداں**" کی طرح کے ایک آزمائشی دور کی کہانی ہے۔ اس کہانی کے ۲۳۲ دن ہیں لیکن قید و بند کے اِن دنوں میں جو کچھ بیتی اب حیرت ہوتی ہے کہ اس نفسِ امارہ پر واقعی یہ دن بھی نکل چکے ہیں اور جو کچھ قلم سے نکلا ہے کیا وہ اپنی ہی سرگزشت ہے؟

غالباً **شیلے** نے کہا تھا کہ ہم ایک ایسے زمانہ میں رہ رہے ہیں جو کتابوں کا نہیں اخباروں کا ہے۔ **شیلے** کے نزدیک کتابیں ہی پڑھنے کی چیز ہیں لیکن لوگ پڑھتے نہیں اور اخبار پڑھنے کی چیز نہیں لیکن لوگ ہر صبح ان پر پتنگوں کی طرح ٹوٹے پڑتے ہیں۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے مجھے اندازہ ہے کہ لوگ اخباروں پر کیوں مرتے ہیں اور کتابوں سے ان کے گریز کا سبب کیا ہے؟ اصل وجہ یہ ہے کہ اخبار کسی موضوع کے بغیر ہمہ موضوع ہوتا اور اس میں ایک رقاصہ کی چھب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہر کتاب اپنے موضوع میں محصور ہوتی اور اس کے چہرے پر نقاب ہوتا ہے۔ اخبار نویسی زیادہ تر الفاظ کا کھیل ہے لیکن کتاب لکھنا اس صورت میں کہ آپ بیتی ہو یا جگ بیتی تصوف کی اصطلاح **احسان** کے ہم معنی ہے کہ تم خدا کے سامنے کھڑے ہو یا خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔

میں نے اپنے سوانح و افکار ہمیشہ احسان کے تابع لکھے ہیں، یہ تو ممکن ہے کہ میرے قلم سے کوئی چیز ادھوری رہ گئی ہو یا کسی واقعہ کے ضمن میں کوئی تسامح ہو گیا ہو لیکن کتاب لکھتے وقت میری خواہش ہی نہیں دُعا ہوتی ہے کہ ایسی کوئی چیز یا واقعہ مختصراً یا تفصیلاً قلمبند نہ ہو جو خلاف واقعہ ہو اور اس کے متعلق قاری کو احساس ہو کہ جو چیز کہی گئی ہے وہ غلط ہے۔ مجھے ہمیشہ ہی یہ احساس رہا ہے کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں اس کے لئے ایک دن خدا کے ہاں جوابدہی ہو گی۔ جھوٹ بول کر عاقبت خراب کرنے کی جسارت وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں خوفِ خدا نہ ہو، یا جو اپنے رب سے انکار کر چکے ہیں اور خیر و شر کو نہیں مانتے۔ **"موت سے واپسی"** میں یہ احتیاط خاص طور پر ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس کی بنیاد جس مسئلہ پر ہے وہ مسئلہ ہر مسلمان کے لئے عاقبت کا توشہ بھی ہے اور دنیا کا فخر بھی۔

(۱) اس قسم کی کتابوں میں میرا اصول یہ رہا ہے کہ جو کچھ پیش آ چکا ہے قارئین کے سامنے رکھ دوں، الفاظ کم مطالب زیادہ۔ اس کتاب میں یہی اصول سامنے رہا ہے۔

(۲) بعض مصنف یا مولف اپنے قارئین کو مرعوب کرنے کے لئے کہانیاں گھڑتے اور اچھالتے ہیں کہ اس قسم کی کہانیاں منشیات کا سرور ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس میرا معاملہ دوسرا ہے کہ اپنی تصویر دوسروں کے سامنے رکھ دو، وہ اس کے خط و خال سے اندازہ کر لیں گے کہ اس میں کیا ہے؟

کتاب کی صحیح تعریف یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے تمہارا یہ احساس قوی ہو کہ تم نے ایک اچھے دوست کی معیت میں اپنا وقت گزارا ہے۔

(۳) اس کتاب کے ساتھ ہی میرے سوانح "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل"

کے نام سے شائع ہو رہے ہیں، دوسری جلد ابھی زیرِ قلم ہے اور وہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات پر مشتمل ہو گی۔ اصولاً "موت سے واپسی" اُن سوانح کی جلد دوم کا حصہ تھا لیکن نہ جانے وہ سوانح کب مرتب ہوں اور لوگوں کے سامنے آئیں؛ چونکہ اس کتاب کے تقریباً سبھی حضرات زندہ ہیں اور بات بھی کل کی ہے لہٰذا ضروری تھا کہ یہ کتاب اس طرح اور ابھی شائع ہوتا کہ کوئی صاحب کسی واقعہ پر معترض ہوں یا اُن کے نزدیک امر واقعہ مختلف ہو تو نشاندہی فرما دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس سے بہت کم بیان کیا ہے۔ جو کچھ مجھ پر بیت چکی ہے اور جس کے شواہد و نظائر متعلقین کے پاس محفوظ ہیں میں نے کئی ایک چیزیں اِس لئے حذف کر دی ہیں کہ اُس وقت سنگین قسم کے الفاظ اقتدار کا غرور توڑنے کے لئے ضروری تھے اب اُن لوگوں کا اقتدار نہیں رہا تو ان الفاظ کو نقل کرنا بدزیب ہوتا۔ بہرحال نفسِ واقعہ کے لحاظ سے ساری کتاب میں کوئی خلا نہیں رکھا ہے۔

یہ کتاب بہت پہلے آجاتی لیکن طباعت کے مرحلے میں اس لئے رُک گئی کہ جسٹس بشیرالدین احمد نے بعض ایسی باتیں مدینہ طیبہ میں بتائی تھیں جو میرے لئے محیرالعقول ہی نہیں ہوشربا تھیں۔ کچھ ماہ پہلے جسٹس شوکت علی سے عجیب وغریب مواد مل گیا۔ خواجہ عبدالرحیم بار ایٹ لا کے بیٹے کی شادی پر مسٹر ایس آئی حق سابق ایکٹنگ گورنر اور چیف سیکرٹری مغربی پاکستان مل گئے تو ان سے بعض ظالمانہ قسم کی باتیں معلوم ہوئیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک اُن سے نہ ملوں "موت سے واپسی" ایک ادھوری کتاب ہو گی۔ ملاقات کی تو ایک ایسی کہانی معلوم ہوئی جو اس کتاب کے

آخری حصّے کا بین السطور ہے۔ انہوں نے ازراہِ کرم اپنے بیان کے وہ حصّے دستخط کر کے میرے حوالے کر دیئے جس بیان میں سابق صدر یحییٰ خاں کو لکھا گیا تھا کہ ملازمت سے ان کی سبکدوشی کے حقیقی محرکات کیا ہیں۔ جب گورنر ایک شخص کو جیل میں ڈلوا کے اُسے موت کی نذر کرنے پر تلا ہو اور ملک کا صدر ہم نوا کیا پس منظر میں ہو تو قائم مقام گورنر اور عدلیہ کے جج کی خفیہ مراسلت کے بعد کونسی شہادت باقی رہ جاتی ہے؟

میں خطرے مول لینے کا عادی ہوں اگر مسٹر ایس آئی حق اور جسٹس شوکت علی کے بیانوں وغیرہ کا پورا ریکارڈ اس سے پہلے میرے ہاتھ آیا ہوتا تو سب کچھ اسی کتاب میں درج ہوتا۔ لیکن یہ چیزیں مجھے اُس وقت ملیں جب اس کتاب کی طباعت کا مرحلہ تھا۔ بہرحال میں نے آخر میں ۱۶ صفحات بڑھا کر دونوں بزرگوں کی انگریزی تحریروں کے بعض اقتباس دے دیئے ہیں اور ساتھ ہی اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ جو کچھ —— بلکہ بہت کچھ باقی رہ گیا ہے اِنشاء اللہ اپنے سوانح حیات جلد دوم میں چھاپ دوں گا۔

ایام نظر بندی کی آخری بھوک ہڑتال میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرے معالج کو صوبہ کے ہیلتھ سیکرٹری نے مجھے غزلہ کر دینے کا مشورہ دیا ہے لیکن اُس وقت میں نے اپنے راوی کے بیان کو شاعری سمجھا۔ اب سوچتا ہوں تو مسٹر ایس آئی حق کے تحریری بیان کی روشنی میں وہ روایت سو فی صد سچی معلوم ہوتی ہے۔

اور وہ نرس بیٹی سے کم نہ تھی جس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں کھانا پہلے چکھوا لیا کرو انجکشن ترک کر دو اور صرف انہی ادویات پر اعتماد کرو جو پیٹنٹ ہوں اور خریدنے والے تمہارے اعزہ ہوں۔

میں نے اس ضمن میں اُس سے کچھ سوال کئے تو اس کی سرمئی آنکھوں سے آنکھوں کے موٹے موٹے قطرے ٹپک کر اس کے سرخ و سپید گالوں پہ آ گئے اور

ہیں۔ نے اس کے جھلملاتے ہوئے چراغوں میں سب کچھ پڑھ لیا۔ یہ کتاب میں اس کے نام معنون کرتا لیکن اللہ تعالیٰ نے عورتیں انتساب کے لئے نہیں حجاب کے لئے پیدا کی ہیں۔ ——— وما علینا الا البلاغ

لاہور — شورش کاشمیری

۲۸ جون ۱۹۷۲ء







موت سے واپسی



شورش کاشمیری

وہ کمرہ جہاں مولف مقیم تھا

میو ہسپتال میں

۲۲ اپریل ۱۹۶۸ء ——— معمول کے مطابق صبح چار بجے اٹھا تو محسوس کیا طبیعت سخت مضمحل ہے، اٹھنا چاہتا ہوں لیکن اُٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا، خون میں حدت ہے، اعضا لوٹ رہے ہیں اندازہ ہو گیا کہ ذیابیطس بے قابو ہو گئی ہے چنانچہ صحت کو متزلزل پا کر ۹ بجے صبح میو ہسپتال لاہور کے فیملی وارڈ کمرہ نمبر ۲۶ میں داخل ہو گیا۔ ڈاکٹری ٹسٹ کئے گئے تو معلوم ہوا خون میں شوگر بڑھی ہوئی ہے، کچھ دن یہاں ٹھہرنا ہو گا، ہر انسان جینے کی کوشش کرتا ہے میں نے بھی جم کے علاج کرانے کا ارادہ کر لیا۔

داخلہ کے چوتھے روز —— چھ بجے شام خواجہ صادق کاشمیری کمرے میں داخل ہوئے اور کہا کہ انار کلی کے ڈی ایس پی چودھری مختار احمد اور سی آئی ڈی کے ڈی ایس پی مسٹر ضیاء جیلانی آئے ہیں ان کے پاس چٹان کے متعلق کوئی حکم نامہ ہے، ضیا جیلانی وارد ہو گئے اس وقت ڈاکٹر جاوید اقبال عیادت کے لیے موجود تھے ضیا جیلانی نے اپنی روکھی پھیکی طبیعت کے مطابق فائل یا زنبیل میں سے ایک کاغذ نکالا اور کہا چٹان ۲۲ اپریل ۱۹۶۸ء کا شمارہ گورنر مغربی پاکستان کے حکم سے ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۵۲ کے تحت ضبط کیا گیا ہے —— جرم کیا ہے؟ ایک شذرہ بعنوان "الحمد للہ" سنسر کرائے بغیر چھاپا گیا ہے اور یہ اس حکم کی خلاف ورزی ہے جو یکم اپریل کو گورنر کی طرف سے مسٹر ایم ایم عثمانی سی ایس پی، ڈپٹی سکریٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ کے دستخطوں سے جاری

کیا گیا تھا کہ آئندہ کوئی اخبار، رسالہ یا پریس سنسر کرائے بغیر ایسا مواد شائع نہیں کرے گا جس میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے متعلق نقد، خبر یا تبصرہ کیا گیا ہو،

اس قسم کے حکم نامے ایک مدت سے جاری ہو رہے تھے لیکن اب کے الہامات کو بھی تحفظ دیا گیا تھا، یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس حکم نامہ کا حقیقی مصنف کون ہے ؟ بہرحال حکم نامہ ظاہر کرتا تھا کہ کس جماعت اور اس کے وجود کا تحفظ مقصود ہے ؟ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ تشویش ہوتی، حکومت نے بیسیوں دفعہ اس قسم کے حکم نامے جاری کئے اور بیسیوں دفعہ اس جماعت کے الہامات یا شطحیات پر بحث ہوتی رہی، حکومت نے اولاً نوٹس ہی نہ لیا تا نیا کچھ کہا تو زیادہ سے زیادہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا پریس برانچ کی معرفت وارننگ دے دی اور معاملہ ختم ہو گیا۔

الحمد للہ کل گیارہ مختصر سطروں کا ایک کالمی شذرہ تھا، متن یہ تھا کہ

"مشرقِ وسطیٰ کا مکتوب بہ قلم اقبال سہیل مطبوعہ نوائے وقت ۱۱ اپریل
پاکستان کے ایک خاص فرقے نے ربوہ سے نکل کر اپنی ریشہ دوانیاں
پھیلانی شروع کر دی ہیں حکومت سعودی عرب نے
اس کا جائزہ لیا ہے":

الحمد للہ الحمد للہ الحمد للہ۔ علماء کا فرض ہے کہ عربوں کو بتائیں کہ اس فرقہ کا مقصد محمدؐ عربیؐ کی اُمت میں نقب لگا کر قادیانی پیغمبر کی اُمت تیار کرنا ہے ان کا وجود سخت دینی احتساب کا مستحق ہے، خود ہمیں سوچنا چاہیئے کہ عرب اس اُمت کو قبول کر سکتے ہیں ؟ اور کیا ان لوگوں کا وہاں جانا ہمارے لئے عرب دنیا میں برگشتگی اور برہمی کا باعث نہیں بنتا ؟ کاش ہماری ان عاجزانہ درخواستوں پر کوئی غور کر سکتا"؟

میں نے فل سکیپ سائز کے اس حکمنامہ پہ الحمد للہ لکھا، دستخط کئے اور ڈی ایس پی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک کاپی میرے حوالہ کی دوسری کاپی دستخط لے کر اپنی

زنبیل میں ڈال لی، پھر اسی قد و قامت کا ایک اور کاغذ نکالا، میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ گورنر پنجاب ان اختیارات کے تحت جو ڈیفنس آف پاکستان رولز سے متعلق حکومت مغربی پاکستان کو حکومت پاکستان نے صدارتی سکرٹریٹ کے آرڈر نمبر ایس آر او۔ ۱۷۱ (آر) ۱۶۶ مجریہ ۱۶ نومبر ۱۹۶۶ء کی رو سے تفویض کیے ہیں چٹان کا ڈیکلریشن بمسرت منسوخ کرتے ہیں، جرم وہی — الحمد للہ

میں نے اس حکمنامہ کی پشت پر وہ الفاظ لکھے جو حکومت کے سان گمان میں نہ تھے، کسی شخص نے سرکاری احکام کو کبھی اس طرح ذلیل نہ کیا ہوگا جس طرح اس حکمنامہ کی پیشانی کو داغا گیا۔

ضیاء جیلانی دو چار لفظ کاٹ دینے کی خواہش کرتے رہے لیکن استبداد نے جذبات کو اتنا مشتعل کر دیا تھا کہ میرے لیے کوئی سا لفظ کاٹنا مشکل تھا، دستخطوں کے بعد یہ کاغذ بھی اُنہوں نے اپنی زنبیل میں رکھ لیا۔ تیسرا کاغذ جو انہی حکمناموں کا جڑواں بھائی تھا اسی زنبیل سے نکالا، اور یہ الحمد للہ کے عوض چٹان پرنٹنگ پریس کی ضبطی کا حکمنامہ تھا، عبارت وہی کہ گورنر مغربی پاکستان مسرت کے ساتھ چٹان پرنٹنگ پریس کو ضبط کیے جانے کا حکم صادر کرتے ہیں۔

غرض ہر چیز روشن ہوگئی یہ احکام محض الحمد للہ پر جاری نہیں ہوئے تھے ان کا ایک پس منظر تھا، الحمد للہ تو ایک بہانہ تھا، اگر یہی جرم ہوتا تو حکومت اتنی برہم نہ ہوتی، نوائے وقت بھی ماخوذ ہوتا کہ اصل مکتوب اس میں شائع ہوا تھا اور اسی کے حوالے سے یہ شذرہ لکھا گیا تھا، اصل وجہ کچھ اور تھی، تفصیل تو آئندہ آئے گی، مختصراً یہ کہ صدر ایوب، اور گورنر موسیٰ مجھے رام کرنے کی ہر کوشش سے مایوس ہو چکے تھے بعض معتمدوں اور وزیروں نے میرے قلم و زبان کی نکتہ چینیوں پر انہیں یہاں تک طیش دلایا کہ وہ اس اقدام پر تیار ہوگئے، طاقت کا خاصہ ہے پہلے نظر انداز کرتی پھر لالچ دے کہ

پھانسنا چاہتی جب خریدنے میں ناکام رہتی تب استبداد پر تُل جاتی ہے، جہاں تک نظر انداز کرنے کا تعلق ہے میں اس مرحلے سے ہارتے ہوتی نکل چکا تھا، ترغیبیں اور تحریصیں میرے لئے بیکار تھیں اور وہ بالمشافہ گفتگو میں ٹکا سا جواب پا چکے تھے اب باقی استبداد ہی رہ گیا تھا اور یہ تینوں حکمنامے اس کا سر آغاز تھے، پریس کی ضبطی کے حکمنامہ کی پشت پر میں نے ایک ایسا فقرہ لکھ دیا جو صوبائی وزیر اطلاعات احمد سعید کرمانی کے لئے پچانا مشکل تھا ایک جملہ اور بھی تھا لیکن وہ اس کے متعلق نہیں تھا وہ "الحمد للہ" میں زیر بحث جماعت سے متعلق تھا۔

ضیا جیلانی محض دستخط چاہتے تھے لیکن معاملہ دستخطوں سے آگے بڑھ گیا، چودھری مختار احمد ڈی ایس پی اُلٹے پاؤں واپس چلے گئے، ضیاء جیلانی اطمینان سے اُٹھے چٹان کے دفتر پہنچے، پریس کو تالا لگایا اور تالا پر کفن چڑھا کہ اس پر مُہر لگا دی مصافحہ کیا اور اس طرح رخصت ہو گئے گویا نپولین کو سینٹ ھیلنا کے جزیرے میں نظر بند کر آئے ہیں۔ حکومت کا حملہ اچانک ضرور تھا لیکن غیر متوقع نہیں تھا اس کی تیاریاں بہت دن سے کی جا رہی تھیں اور میں اس سے باخبر تھا لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ حکومت اس کھوکھلے پن سے حملہ کر دے گی۔

پاکستان بن جانے کے بعد میں نے حمید نظامی اور شہید سہروردی کے اصرار و خواہش پر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا، ایوب خان نے سکندر مرزا سے حکومت چھینی تو میرے سامنے تجربوں کا ایک انبار تھا لیکن ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء سے کچھ دن قبل میں سیاست سے ذہناً علیحدہ ہو گیا کسی راہنما یا جماعت سے سیاسی واسطہ نہ رکھا، چٹان کو ذہنی سرگرمیوں کا محور بنا لیا جو کہنا چاہتا اسی کے صفحات میں کہتا اور لکھتا، گو خیالات ذاتی تھے لیکن تا تہہ ان کا اجتماعی تھا کسی جلسہ میں کبھی چلا گیا تو موضوع غیر سیاسی ہوتے، ادبی، دینی، تعزیتی ورنہ سیاست عملاً ایک بھاری پتھر تھا، اٹھ نہ سکا چوم کے

چھوڑ دیا، ملک کا جو سیاسی مزاج بن چکا تھا اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ اس جھمیلے سے علیحدگی ہی بہتر ہے، کوئی سی غرض کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہی اور نہ کبھی کسی عہدہ و منصب کی خواہش کی ہے، حالانکہ سیاست میں عموماً اقتدار ہی کے لیے کوشش یا قربانی کی جاتی ہے، ہوسکتا ہے میں نے کوئی مسلک یا نظریہ قائم کرنے میں غلطی کی ہو لیکن سیاست میں کوئی سی چیز حاصل کرنے کے لئے میں نے کبھی حصہ نہیں لیا۔

حکومت وہی اچھی ہے جو عوام پر کم سے کم حکومت کرے لیکن ایسی حکومت شاید ہی کہیں ہو، ہر حکومت ایک منظم استبداد کا نام ہے اسی نظریہ نے مجھے ہر حکومت پر تنقید کی عادت ڈالی اور وہ پختہ ہوگئی، پاکستان کے حالات کچھ اس طرح نشو و نما پاتے رہے کہ ایوب خان کے عہد میں ابتداً ہی مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہاں عوامی جمہوریت کا پنپنا مشکل ہے، زنجیر کے حلقے بڑھیں گے ٹوٹیں گے نہیں، میرا یقین تھا کہ ایوب خان کے شیوۂ فرمانروائی کا آخری نتیجہ ملک کے لئے مہلک نہیں تو مضر ضرور ہوگا لیکن ایوب خان کا عہد قید محض کی سزا ہے تو آئندہ دور قید بامشقت ہوگا۔ شاید حبس دوام بہ عبور دریائے شور۔ چونکہ مزاج میں اپوزیشن کے اثرات غالب تھے اس لیے نظم و نثر میں اکثر و بیشتر چٹکی لیتا رہا — "صدر ایوب کیا کریں؟" کی پاداش میں ڈیفنس آف پاکستان رولنہ کے غلط استعمال کا چرکا سہہ کر رہا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ ایوب خان اور ان کے درباریوں کو روکا یا ٹوکا نہ گیا تو ملک کی روح مرجائے گی، عجب نہیں ایک طویل جمود کے باعث عوام نزاع کا شکار ہو جائیں اور یہ صورت حال ملک کے وجود کو معرض خطر میں ڈال دے، حکومت کو میرے اس ذہنی فیصلہ کا علم تھا۔

۲۳ دسمبر ۱۹۶۶ء کو رہائی کے فوراً بعد کوئی افسر ہسپتال آئے یاد نہیں آرہا کس آفیسر نے بہرحال وہ کوئی سکریٹری ہی تھا مجھ سے کہا گورنر صاحب سے مل لیجئے، یہ ایک ادھورا فقرہ تھا، اگلے روز یا شاید اسی روز صوبائی محکمہ اطلاعات کے ڈپٹی سکریٹری مسٹر جمیل الزمان آئے،

کہنے لگے مسٹر مسعود الرؤف دسکریٹری اطلاعات، ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ضرور۔ مسٹر مسعود الرؤف، سی ایس پی تو بہر حال تھے لیکن میرے تجربہ کے مطابق بھلے آدمی تھے۔ آئے تو کہنے لگے،

"آپ کو صحیح پیغام نہیں پہنچا، گورنر صاحب آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں"۔

میں نے کہا، ضرور ملوں گا، فی الحال ہسپتال سے نکلنے کی ہمت نہیں،

وہ۔ کار موجود ہے میرے ساتھ چلئے، تھوڑی سی دیر میں لوٹ آئیں گے۔

میں۔ طبیعت سخت مضمحل ہے کسی اور دن سہی،

مسعود الرؤف نے فیملی وارڈ ہی سے گورنر ہاؤس فون کیا، جانے کیا بات کی، لوٹ کے فرمایا۔

"گورنر کی خواہش ہے کہ آپ انہیں فوراً ملیں، آج نہیں تو کل پانچ بجے شام گورنر کہتے ہیں کہ وہیں روزہ افطار کریں۔

میں نے مذاقاً کہا، گورنر صاحب اور میرے روزے کے افطار میں دس منٹ کا فاصلہ ہے دوسرے میں بیمار ہوں روزہ نہیں رکھتا، رہی ملاقات تو انشاء اللہ وقت پر حاضر ہو جاؤں گا۔

مسعود الرؤف شاید میرے گریز و فرار کی عادت سے واقف تھے کہنے لگے، کل خود آکر لے جاؤں گا اگلے روز وہ آئے اور میں ان کے ساتھ گورنر ہاؤس چلا گیا، گورنر موسیٰ نہایت خندہ پیشانی اور خوش روئی سے ملے، دوران گفتگو، میں نے اندازہ کیا کہ وہ سیاسی فہم بالکل نہیں رکھتے، اکل کھرے انسان ہیں، ان کے نزدیک غالباً ہر شخص کی قیمت ہے، اور ہر قضیہ کسی معاوضہ سے چکایا جاتا ہے۔ صدر ایوب کے متعلق فرمایا کہ "انہیں تمہارے قید کئے جانے کا ملال تھا، لیکن تمہارے اداریہ کی بیرون ملک اشاعت سے انہیں صدمہ ہوا تھا، ان سے مل لو۔

میں نے عرض کیا کہ اس اداریہ سے میرا مقصد ان کی رسوائی یا توہین نہیں تھا، لوگوں کی پھیلائی ہوئی کہانیوں سے انہیں آگاہ کرنے کے لئے میں نے وہ اداریہ لکھا افسوس اُنہیں غلط فہمی ہوئی کہ میں نے اُن کی اہانت کی ہے۔

گورنر نے کہا — "اُن کے شبہ کا ازالہ ہو گیا ہے، ان سے مل لو۔"

میں نے عرض کیا جب بھی یاد کریں گے ضرور جاؤں گا۔

کہنے لگے — "ان سے وقت لو اور چلے جاؤ۔"

میں نے ایک پچھلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ اسی گورنر ہاؤس میں ملک امیر محمد خان گورنر اور شیخ خورشید احمد وزیر قانون کی موجودگی میں صدر سے ملا تھا، وہ مجھ سے تین سوا تین گھنٹہ گفتگو کرتے رہے اور اپنے الطاف سے نوازنے کے خواہاں تھے، میں نے ان سے کہا سیاست میں روپیہ لے کر کام کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان خودکشی کر لے یا ماں، بہن بیٹی کو بالاخانے پر بٹھا کے ان کی کمائی کھاتا رہے، وہ میرے جواب سے حیران ہوئے اور خوش بھی، ملک امیر محمد خان نے ان سے کہا کہ شورش کی یہی ادا مجھے پسند ہے، میں نے کئی دفعہ اسے یہی کہا ہے لیکن اس نے ہمیشہ یہی جواب دیا ہے کہ مجھے کوئی سی خواہش نہیں ہے۔ صدر نے مجھ سے زور کا مصافحہ کیا اور زینہ تک چھوڑنے آئے، میرے ہاتھ بھینچتے ہوئے کہا اِنشاءاللہ عمر بھر دوست پاؤ گے۔

گورنر موسیٰ بولے، وہ اب بھی دوست ہیں، ان سے ملو اب وُہ مصافحہ نہیں معانقہ کریں گے۔

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا — مصافحہ پر چھ مہینے کی نظر بندی ملی معانقہ پر تو گلے کا رستہ ملے گا۔

اس پر گورنر بہت ہنسے، وُہ مُصر تھے کہ صدر سے ضرور ملوں، میں ہوں ہاں کر کے چلا آیا۔ باتیں ان سے ہر موضوع پر ہوئیں، مثلاً وہ ذوالفقار علی بھٹو کے سخت خلاف

تھے کہنے لگے میں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران انہیں کنٹرول روم میں داخل ہوتے سے روک دیا تھا، موضوع دلچسپ تھا تقریباً ڈھائی گھنٹہ ملاقات رہی پھر جانے کس طرح بھٹو کو اطلاع ہوگئی کہ گورنر نے ان سے متعلق میرے ساتھ فلاں فلاں بات کی ہے، وہ دوسرے یا تیسرے روز اچانک دفتر "چٹان" میں آگئے، پہلے سے کوئی ملاقات نہ تھی، مجھ سے تخلیہ میں کہا کہ گورنر نے آپ سے فلاں فلاں بات کی ہے، میں ششدر رہ گیا، کہنے لگے کہ ایوب خان تو موسیٰ کو نکالنا چاہتا تھا اور نکال دیا تھا میں نے صدر کی خواہش سے بالا بالا موسیٰ کو ایران کا سفیر مقرر کیا، ایوب خان ناراض ہوگئے لیکن ایکا ایکی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ملک امیر محمد گورنری سے نکالے گئے ان کی جگہ موسیٰ خان لائے گئے۔

گورنر سے اس طویل ملاقات کے بعد باہر نکلا تو معلوم ہوا احمد سعید کرمانی کو چھ بجے کا وقت دیا تھا، اب ڈیڑھ گھنٹہ اُوپر ہو چکا ــــ وہ اس دوران میں استفسار کرتا رہا کہ اندر کون ہے؟ پہلے تو اسے ٹالا گیا جب وہ مضطرب ہوا تو اسے بتایا گیا، تمہارا رقیب ہے، یہ ایک مذاق تھا میں کسی معاملہ میں اس کا رقیب نہ تھا اسے یہ کیوں کہا گیا؟ وہ مجھ سے بدظن کیوں ہوتا گیا خدا جانتا ہے، کرمانی کے والد سید جلال شاہ میرے دوست تھے، موری دروازہ سے موہن لال روڈ کے دائیں نکڑ پر مرحوم ایک چھوٹی سی دکان میں جلد سازی کرتے تھے، وہ مسلمانوں کی مختلف تحریکوں میں حصہ لیتے رہے، مولانا ظفر علیخاں سے انہیں ہمیشہ ارادت رہی، شہید گنج کی تحریک کے دنوں میں لاہور کی شاہی مسجد میں رضاکاروں کے لئے چائے بناتے اور پلاتے تھے، انہی کی وجہ سے آخری ایوبی الیکشن کے سوا جس میں کرمانی ہار گیا میں نے اُس کو ہمیشہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ووٹ دلوائے اور زبانی کلامی مدد کی تھی، لیاقت علی کے زمانہ میں بھی جب وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہوا تھا اور میں شہید سہروردی کے ساتھ تھا اپنے ووٹوں کی حد تک میں نے اس کی معاونت کی تھی، لیکن کرمانی شاید اس لئے بدظن ہو گیا کہ نواب کالا باغ کے پاس خان بہادر شیخ عنایت اللہ کے عجمی مذاق کا ایک خط تھا

اُس کی ایک فوٹوسٹیٹ کاپی نواب صاحب نے مجھے دی تھی کہ صدر ایوب کو دکھاؤں کیونکہ نواب کالاباغ کرمانی کو وزیر بنانے کے حق میں نہ تھے اور صدر ایوب کرمانی پر مہربان تھے۔ کرمانی کو غالباً شبہ تھا کہ صدر ایوب کو اس کے متعلق میں نے خط دکھایا یا ایسی ویسی کوئی بات کہی ہے، میں نے ملک امیر محمد خان سے ہامی بھر لی تھی لیکن اس آلودگی میں آنا نہیں چاہتا تھا بس اتنا ہی گنہگار تھا کہ وہ خط ان سے لیا ضرور تھا لیکن رکھ کر عمداً بھول گیا۔ یوں بھی اس وقت میرے دل میں کرمانی کے لئے کوئی غبار نہ تھا، نواب کالاباغ حریفوں کے عیب جمع کرنے کے عادی تھے اور میں ہاتھیوں کی اس لڑائی میں آنا نہیں چاہتا تھا، کرمانی کے وزیر ہونے سے میرا کیا بگڑتا تھا پہلے ہی کون سے نادرۂ روزگار لوگ وزیر تھے کہ اس کے وزیر ہونے سے ملک، و قوم مجروح ہوتے، حقیقت یہ ہے کہ میں نے صدر یا گورنر سے اُس کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کی بلکہ اس کی قدر کرتا رہا۔

بنیادی جمہوریتوں کے الیکشن میں اس نے چودھری عبید محمد سے شکست کھائی تو اس شکست کے خلاف اُس نے مرافعہ دائر کیا، میں اس میں گواہ تھا لیکن شہادت کے روز بیمار تھا، ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھجوا دیا، کرمانی نے میرے متعلق عدالت میں ریمارکس کئے کہ میں نے بہانہ کیا ہے اور شہادت دینے سے گریز کر رہا ہوں، ٹریبونل نے کوئی لمبی تاریخ دے دی میں یہ سُن کر اگلے ہی روز پیش ہو گیا عدالت سے کہا کہ شہادت دینے سے پہلے میں یہ مطالبہ کروں گا کہ مسٹر احمد سعید کرمانی نے کل میرے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ پر جو کلمات کہے اور مجھ پر غیر حاضری میں جو طنز کیا ہے وہ اس کی معافی مانگیں، کرمانی نے فٹافٹ معافی مانگ لی۔ ممکن ہے اسے یہ رنج ہو، سب سے بڑی بات جو اس کے لئے پھانس ہو گئی وہ میری تقریریں تھیں، جلسوں میں لوگ میرے لئے اصرار کرتے اور اس طرح دوسروں کو پیچھے ڈالتے تھے، کشمیر کے مسئلہ پر مختلف الخیال راہنماؤں کا ایک مشترکہ جلسہ تھا میں بھی مدعو تھا کرمانی تقریر کر رہا تھا، میں پہنچا، تو لوگوں نے تالیاں پیٹیں،

کرمانی کی تقریر رُک گئی، دوبارہ شروع کی تو لوگوں نے شورش، شورش کا شور مچا دیا، کرمانی کٹ گیا، اُسے خیال ہوگا گویا وہ لوگ میرے ساتھ آتے ہیں اور میں نے کرایا ہے، دونوں میں سے کوئی سی بات درست نہ تھی میں نے کبھی اس سفلہ پن کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو جس سے کرمانی نے یہ محسوس کیا ہو کہ میں اس کا دشمن ہوں تو میرے علم میں نہیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ میرے نزدیک ایسی بڑی چیز کبھی نہ تھا کہ میں اس پر سوچوں یا اسے مدمقابل سمجھوں۔ وزیر ہو جانے سے آدمی بڑا نہیں ہو جاتا۔ کرمانی وزیر ہو کر اور بھی چھوٹا ہو گیا، چٹان کی تنسیخ پریس کی ضبطی اور میری گرفتاری سے متعلق اکثر یہی کہا گیا کہ اس کے پس پردہ کرمانی کا ہاتھ ہے لیکن اس کا ہاتھ کیا ہوتا؟ ہاتھ تو صدر ایوب اور گورنر موسیٰ کا تھا جو مجھے منانے کی ہر کوشش سے مایوس ہو کر برھم ہو گئے اور اس میں حق بجانب تھے ان کے سامنے بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہوتا اور میں کوئی سی طاقت نہ رکھنے کے باوجود اینٹھا ہوا تھا میرے قلم و زبان سے وہ اور اُن کے حوالی موالی چوٹیں سہہ رہے تھے بلکہ اُن کے زخم اس ناوک افگنی سے رسنے لگے تھے۔ کرمانی کی خواہش ہی خواہش تھی اس کا اپنا کوئی فیصلہ نہ تھا، وہ اس مقدمہ میں زیادہ سے زیادہ مُخبر تھا۔ اس سارے ڈرامہ میں اس کا پاٹ ویلن کا تھا، بظاہر دوستوں کو یہی تاثر دیتا رہا کہ وہی سب کچھ ہے، اور اب اُس کا بسمل کیونکر بچ سکتا ہے؟ اخباروں کو میری خبریں چھاپنے سے روک دیا گیا بعض پیشہ ور قلم کاروں سے میرے خلاف کالم لکھوائے گئے، لُطف کی بات یہ ہے کہ اس باب میں صدر ایوب کے لاڈلے سکریٹری الطاف گوہر پیش پیش رہے جو بعض روایتوں کے مطابق کرمانی کے مُشفقِ خاص تھے، حالانکہ یہی الطاف گوہر تھے جن کے انفرمیشن آفیسر، آغا حسام الدین جو آجکل ایران میں پریس اتاشی ہیں میری رہائی کے فوراً بعد راولپنڈی سے پرواز کر کے سیدھا میو ہسپتال پہنچے، اور ان کی طرف سے مبارکباد دی، اس کے بعد کتھا سُنائی کہ الطاف گوھر نے بڑی مشکل سے صدر کو راضی کیا اور آج ہی کامیاب ہوئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ الطاف گوہر میری گرفتاری

کے مشورہ میں برابر کے شریک تھے اور میرے اخلاص کے باوجود مجھ سے کبھی مخلص نہیں تھے، میرے ساتھ جو سلوک ہوا وہ اُس کے کرتا دھرتا تھے اور میں یہ کیونکر بھول سکتا تھا۔ آغا حسام الدین کو میں نے ٹال دیا اور وہ یہ تاثر لے کر چلے گئے کہ الطاف گوہر سے مجھے کوئی رنج تھا تو اب نہیں رہا، لیکن ایک سوراخ سے دوبارہ ڈسا جانا مشکل تھا، راولپنڈی سے اسی دوران میں دو تین دفعہ فون آیا کہ انفرمیشن سکریٹری بات کرنا چاہتے ہیں، میں ٹالتا رہا آخر ایک دن میں نے اپنے منیجر مسٹر صلاح الدین اور جنرل منیجر میر منظور حسین سے کہا کہ دیکھئے کہ وُہ اِن سے بات نہیں کرنا چاہتے، ان کا بار بار فون آرہا تھا، صلاح الدین نے انہیں یا اِن کے پی اے کو میرے الفاظ پہنچا دیئے، صاحب زادہ فیض الحسن شاہ کئی دفعہ صدر اور گورنر کی طرف سے مجھے راضی کرتے آ چکے تھے، وہ اچانک راولپنڈی سے لاہور پہنچے، کہنے لگے الطاف گوہر بڑا اچھا آدمی ہے، اس کے دل میں تمہارے لئے بڑی قدر ہے، ناراضی کا سبب کیا ہے؟ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے تو باہمی ملاقات سے رفع کر لو، وُہ تمہیں فون کرتا رہا تم نے انکار کیا، فلاں دن اُس کو بلا رہا ہوں اپنا معاملہ سامنے رکھ دے گا سُن لو میں نے انکار کیا، صاحب زادہ صاحب اڑے رہے، نہیں وہ ضرور آئے گا۔

میں نے صاحب زادہ صاحب سے کہا جس روز کے لئے آپ کہہ رہے ہیں اس روز یوم اقبال ہے، میں مرکزیہ مجلسِ اقبال کا سکریٹری ہوں اور مجھے اجلاس نپٹانا ہوتا ہے، صاحبزادہ نہ مانے، کہنے لگے اجلاس ڈیڑھ بجے ختم ہو جائے گا وہ آپ کے پاس اس کے بعد آجائے گا۔ اب یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ یونیورسٹی ہال سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو الطاف گوہر موجود تھے یا میرے آنے کے بعد وارد ہوئے، دیر تک اپنی صفائی پیش کرتے رہے، باتیں اُن کی دلچسپ تھیں لیکن میرا دل مطمئن نہ ہو سکا، بہر حال وہ میرے گھر چل کے آئے تھے جو کچھ ہو چکا تھا میں نے بھول جانے پر اتفاق کیا اور وُہ چلے گئے، صدر کے متعلق انہوں نے بہت کچھ کہا [illegible] ن یہ اُس تذکرہ کا محل نہیں، دوسرے تیسرے روز آغا حسام الدین

اس ملاقات سے متعلق میرا تاثر معلوم کرنے آ گئے، وہ ایک خوش گفتار نوجوان ہیں کہنے لگے خدا کا شکر ہے آپ میں اور الطاف صاحب میں غلط فہمی رفع ہو گئی، میں نے اتنے ہی خوبصورت الفاظ بول کر انہیں خوش کر دیا اور وہ راضی ہو کر چلے گئے، ان کی گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ مجھ سے جو ملاقات بھی ہوتی ہے صدر اس سے آگاہ رہتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اس قید سے جو رنج مجھے پہنچا ہے اس کی تلافی ہو جائے۔

صاحبزادہ فیض الحسن پاکستان بن جانے تک احرار میں تھے، پاکستان بن گیا تو شاید ختمِ نبوت کی تحریک کے اختتام تک احرار میں رہے پھر وہ بریلوی علماء کے ساتھ ہو گئے وہاں سے صدارتی انتخاب میں ایوب خان کے ہو گئے، ایسا تعلق پیدا کیا کہ ایوب خان اور ان کے معتمدین ان سے بے حد راضی تھے اور وہ ان پر جان چھڑکتے تھے۔

۱۹۶۲ء میں دیوبند اور بریلوی مسئلہ پر چٹان میں شد و مد سے لکھا گیا تو صاحبزادہ صاحب مجھے کافر قرار دیتے رہے، میں اُن کے خلاف لکھتا رہا نتیجۃً علیک سلیک ہی ختم ہو گئی کئی سال اسی طرح گذر گئے، ۱۹۶۷ء کی ابتدائی سہ ماہی کا ذکر ہے ایک دن صاحبزادہ صاحب ناگہاں دفتر چٹان میں آ گئے، مجھے حیرت ہوئی، وُہ عام مخلوق خدا کے سامنے ہم ایسوں سے کبھی معانقہ نہ کرتے بلکہ موج کی طرح ہٹ جاتے اُس دن معانقہ فرمایا موجب حیرت تھا کہ اس سے پہلے ملتے ملاتے تو ہماری خواہش یا اصرار کے باوجود وُہ پانی کی ایک بوند تک نہیں پیتے تھے۔ آج چائے خود طلب کی۔ دس پندرہ منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر فرمایا۔ اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے متعلق صدر اور گورنر سے تعریفی کلمات سُن کر بڑی خوشی ہوئی اُن کی تمہارے بارے میں بڑی اُونچی رائے ہے۔

میں ۔ ان کی مہربانی ہے

ص ۔ آپ اُن سے ملیں

میں ۔ مل چکا ہوں دو دفعہ

ص - پھر ملیں، گورنر اور صدر دونو سے

میں - گورنر سے باتیں ہو چکی ہیں اب کیا ضرورت ہے؟

ص - نہیں آپ گورنر سے فوری طور پر مل لیں

میں - جب یاد کریں گے مل لوں گا، خود کسی سے کبھی نہیں ملا، یہ میرا شعار ہے ہمیشہ سے۔ - پھر فائدہ کیا ہے مجھے کچھ لینا نہیں؟

ص - لینا کیوں نہیں؟ کیا بچوں کو اپنے دکھ منتقل کرنے ہیں پھر جو کچھ لینا ہے وہ کسی کی ذاتی ملک تھوڑی ہے ملک کا ہے اور ملک ہم سب کا ہے۔

میں - "نہیں صاحبزادہ صاحب، میں اس مذاق کا نہیں"

صاحبزادہ صاحب آخر یہ کہہ کر چلے گئے کہ میں انتظام کرتا ہوں، رات گوجرانوالہ سے فون کیا، صبح آ رہا ہوں، گورنر نے صبح ۹ بجے کا وقت دیا ہے، گورنر سے دو گھنٹہ باتیں ہوئیں اُن سے کچھ نہ کچھ لے سکتا تھا اور اس دوران میں اگر کوئی نقصان ہوا تھا تو اس سے بیس گنا زیادہ لے سکتا تھا، ہر پیش کش موجود تھی، روٹ پرمٹ چھواروں کی طرح بٹ رہے تھے یہ رشوت تھی جو حقداروں سے کہیں زیادہ خود فروشوں کو دی جاتی، اس کے علاوہ اراضی تھی، کوٹھیوں کے لئے قطعات تھے، مختلف صنعتوں اور خام مال کے لائسنس تھے جو لوگ صدر سے فائدہ اُٹھا رہے اور اُٹھا چکے تھے ان میں بہت سے جاہل و اجہل تھے لیکن صدر نے ان کے انداز خود سپردگی سے خوش ہو کر انہیں مل اونر بنا دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ بعض اپنے نام کی املا نہیں کر سکتے تھے میں چاہتا تو بہت کچھ پا سکتا تھا اور یہ دن وہ تھے کہ صدر اور گورنر بہت کچھ دینے کو تیار تھے لیکن میں اس طبیعت کا آدمی نہ تھا، گورنر موسیٰ صرف یہ چاہتے تھے کہ حکومت کے خلاف قلم روک کر بھٹو کی معاونت سے ہاتھ اُٹھا لوں، اس وقت اخبار نویسوں میں مجید نظامی اور میں صرف دو ہی تھے جو بھٹو کا ساتھ دے رہے تھے ورنہ ملک میں کوئی اخبار ان کا اچھی طرح نام چھاپنے کو تیار نہ تھے، میرا معاملہ یہ تھا کہ میں تحریر کے علاوہ تقریر

میں بھی اُن کا ساتھ دے رہا تھا۔

یوم حمید نظامی پر ہم نے بھٹو کو پلیٹ فارم مہیا کیا لاہور میں بھٹو کا یہ پہلا جلسہ تھا جو ہجوم کی بے پناہی کے باعث حکومت کی پریشانی کا باعث ہوا، کسی اخبار نے کورج (Coverage.) نہ دیا، صرف چٹان ہی تھا جس نے آرٹ پیپر کے سرورق پر بھٹو کے استقبال کو اس طرح پیش کیا کہ اس شمارے کی بہت سی کاپیاں خود بھٹو نے بعض امریکی وقائع نگاروں کو نذر کیں، اُن کے علاوہ بھی کئی ممالک میں وہ پرچہ بھیجا گیا، بھٹو کا اخبارات میں چھپنا ایک طرف رہا کوئی سا ملکی پریس ان کی تحریریں چھاپنے کو تیار نہ تھا ان کے قلم سے سیاسی حالات پر دو کتابچے تھے ہر پرنٹر چھاپتے ہوئے ڈرتا تھا یہ کام بھی چٹان پرنٹنگ پریس نے بلا مُزد انجام دیا، چھپائی، کاغذ اور بنوائی سب مُفت، بھٹو نے لاڑکانہ سے اپنا منشی رغالباً منشی ہی تھا، اُجرت دے کر بھیجا لیکن میں نے جواب دیا کہ چٹان کی طرف سے ہدیہ سمجھیں، بھٹو نے تشکر کے طور پر جو خط لکھا اس کے الفاظ دس بارہ سطروں سے زیادہ نہ تھے لیکن تھے نہایت خوبصورت، یہ خط راقم کے پاس سیاست دانوں کی فن کاریوں کی یادگار کے طور پہ محفوظ ہے۔

اسی زمانہ میں بھٹو کی سوشلزم سے متعلق ایک تقریر پر کوثر نیازی نے بہ لطائف الحیل ہنگامہ کھڑا کیا، بعض ملاؤں سے جمعہ کے خطبات میں تقریریں کرائیں، پوسٹر نکالے اور فتوے ترشوائے، چٹان نے کوثر اور اس کے اعمال و انکار کا محاسبہ کیا لیکن یہ محاسبہ سرکار میں اس کے قرب کا باعث ہوگیا، ایسے ہی کارناموں پر اُس نے روٹ پرمٹ، امپورٹ لائسنس اور ہر مقام پر کچھ نہ کچھ حاصل کیا، یہ شخص ایوب خان کی سبکدوشی تک ان کے خوانِ اقتدار سے ریزے چنتا رہا آج بھٹو کی جماعت میں سکریٹری اطلاعات ہے، اس نے اپنے متعلق یہ فریب دے رکھا ہے کہ وُہ جماعت اسلامی کے باب میں ایکسپرٹ ہے، ہر وُہ طاقت جو جماعت اسلامی سے خائف ہو اُس سے فائدہ اُٹھانے پر آمادہ ہو جاتی ہے یہی اُس کا

فن ہے۔

صاحب زادہ صاحب چاہتے تھے کہ صدر اور گورنر جو چاہتے ہیں وہ ہو جائے میں اپنی روش پر قائم رہا، پہلے سیاسی جلسوں میں حصہ نہ لیتا تھا اب اپوزیشن کے جلسوں میں شامل ہونے لگا، صدر، گورنر اور ان کے حواری موالی برافروختہ ہو گئے اور یہ ایک قدرتی امر تھا، وہ تمام لوگ جو میرے قلم کی زد میں تھے صدر اور گورنر سے شکایت کرتے اور یہ ان کا طبعی حق تھا، صدر ایوب کے گرد اس قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے کہ چند ایک کو چھوڑ کر ان سے کسی قومی کردار کی توقع ہی نہ تھی، ان کا کوئی سیاسی ماضی نہ تھا وہ صرف طاقت کے پجاری تھے، صدر ایوب اس کھیپ کی ذمہ داری سے بری نہیں تھے جس مال کی طلب ہو وہی مال آجاتا ہے، یہ لوگ خوشامد کی اس انتہا پر تھے کہ خود خوشامد ان سے شرمسار تھی، میرے تجزیہ کے مطابق ایوب خان کے زوال کا باعث جو چیزیں تھیں ان میں نمایاں یہ تھیں۔

۱۔ انہوں نے اپنے تئیں ایک ایسی طاقت سمجھ لیا تھا جو فراست کو چھوڑ کر اپنی ذات پر بھروسہ کرتی ہے۔

۲۔ وہ بغیر کسی حسن و خوبی کے عقل کل بن گئے تھے اور زندگی کے ہر عنوان میں اپنے مخصوص خیالات کے قطعی ہونے پر اصرار کرنے لگے تھے۔

۳۔ اُن کے گرد و پیش سیاسی اعتبار سے عموماً وہ لوگ جمع ہو گئے تھے جو پاکستان کی تحریک کے دنوں میں اپنی کوئی شخصیت نہ رکھتے تھے اور جن کا واحد شعار طاقت کی خوشنودی کا حصول اور طاقت کی پرستش کا اصول تھا۔

۴۔ بنیادی جمہوریتوں کا نظام اکثر و بیشتر خود غرض لوگوں کے بدترین افراد پر مشتمل تھا۔ اکثر ارکان ملک کے قبرستان میں گورکن کی حیثیت رکھتے اور معمولی سے شخصی فائدے کے لئے ہر قومی متاع کا سودا کر سکتے تھے، کلام اللہ کی جھوٹی قسمیں کھانا ان کا شعار ہو گیا تھا، لاہور کے بی ڈی ممبروں کی ایک بڑی اکثریت کے کرتوت دیکھتے ہوئے میں نے

ایک اداریہ میں لکھا "قرآن سستا اور مرغ مہنگا ہو گیا ہے"، فی الجملہ پاکستان کی بدترین مخلوق بنیادی جمہوریتوں کے ارکان میں شامل ہو گئی تھی۔ صدر اُنہیں اپنی طاقت سمجھتے تھے حالانکہ وہ ہر طاقت کا مال تھے۔

۵ - اُنہوں نے بعض ایسے آفیسر اپنے معتمدوں میں شامل کر لیئے جو کنونشن لیگ کے عہدیداروں اور بنیادی جمہوریتوں کے ووٹروں کی طرح اپنا قرب قائم رکھنے کے لئے انہیں دھوکا دے رہے تھے ان میں سچ بات کہنے کا حوصلہ نہ تھا وہ صحیح معنوں میں جی حضوریے تھے وہ انہیں یقین دلاتے رہے کہ آپ ایشیا کے دو تین بڑے آدمیوں میں سے ایک ہیں۔

۶ - اُن میں حُبِ مال نے غلبہ پا لیا۔

۷ - اپنے بیٹوں اور خاندان کے بعض دوسرے افراد کے استیلاء و استبداد کو نظر انداز کیا اور یہ محسوس ہی نہ کیا کہ لوگ اس بارے میں کیا سوچتے یا کہتے ہیں۔

۸ - ایوب خان اپنی ہی ذات میں محصور نہ ہوتے تو کئی بہترین لوگوں سے فائدہ اُٹھا سکتے تھے لیکن انہوں نے بدترین لوگوں ہی کو اپنے گرد جمع کیا یا اُن دانشوروں کو جو ہر طاقت اور ہر اقبال سے سمجھوتہ کر کے زندگی گزار سکتے ہیں اور جن کی ذہانت ہی ان کی جنس ہے۔

صدر ایوب اس کھیپ کے ذہنی طول و عرض سے واقف تھے لیکن ملک کی سیاسی ذہانت سے اتنا "خائف" تھے کہ انہی لوگوں کو اپنے گرد و پیش رکھنے پر مجبور تھے۔

مغربی پاکستان سی آئی ڈی کے ڈی آئی جی نے ایک دن مجھے اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا، میرا ان سے پہلا تعارف تھا کہنے لگے ایوب خان نے کہا ہے کہ مختلف واقفانِ حال سے پوچھا جائے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد میری مقبولیت میں کمی آنے کا باعث کیا ہے؟ اسی لئے آپ کو تکلیف دی ہے۔

میں نے ان سے کہا میری طرف سے لکھئے،

"شدہ مقبول ہی کب تھے ؟ کہ انہیں مقبولیت میں کمی کا احساس ہوا ہے"۔

انہی دنوں مجھے ایک بہت بڑے افسر نے بتایا کہ الطاف گوہر سے بچنا وہ تمہارا دشمن ہے۔ اور اس کا مجھے یقین ہو چکا تھا۔

اسی سال (۱۹۶۸ء) فروری میں یوم حمید نظامی راولپنڈی کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے میں نے الطاف گوہر پر کڑی نکتہ چینی کی کہ وہ اپنے ذہن میں یہ بات ضرور رکھیں کہ کسی بھی شخص کی خدائی نہیں چلے گی۔ کئی سی ایس پی ایوب خان کے ہاتھوں نکالے گئے اور وہ بھی آئندہ انقلاب میں نکالے جا سکتے ہیں، الطاف گوہر نے صدر ایوب پر اپنی دانشوری کا نقش بٹھانے کے لئے بہت سے دانشور اپنے گرد جمع کر رکھے تھے اور ان سے مختلف سرکاری یا درباری مہمات میں کام لیتے رہے دانشور کا لفظ انہی کے عہد میں رواج پایا، ایک زمانہ تھا ان لکھاڑیوں کو اہل قلم کہتے تھے پھر ادیب و شاعر، ترقی پسند مصنفین نے فن کار کے لفظ کو رواج دیا، جب لکھنے پڑھنے کی عادت شل ہو گئی تو وہ لوگ، جن کی چرب زبانی کو تنقید یا تجزیہ کی چاٹ لگی ہوئی تھی دانشور کہلانے لگے، وہ شخص جو اپنی کوئی تصنیف یا تالیف نہ رکھتا ہو لیکن ہر تصنیف اور تالیف پر تنقید کر سکے دانشور تھا، الطاف گوہر نے ان سب کو جمع کیا، بیشتر ان کا ہار ہو گئے۔

ان دانشوروں کو میں نے نظم و نثر میں بُری طرح لتاڑنا شروع کیا، ہر شمارہ اور ہر جلسہ میں اُن کا مذاق اُڑایا، سبھی چلا اُٹھے، اپنے مرکز کی طرف جاتے اور مرکز انہیں تسلّی دلاتا کہ اور تھوڑے دن انتظار کرو۔ وہ چیز جو ہونی چاہیئے ہو رہی ہے اور ہو کے رہے گی۔

گورنر موسیٰ تین دفعہ بلوا چکے تھے، پہلی دفعہ مسعود الرؤف کے ہمراہ دوسری دفعہ فیض الحسن لے گئے، تیسری دفعہ شاید وہی میرے ساتھ تھے یا مجھے ان کے سکریٹری نے

فون کیا تھا کہ گورنر سے مل لوں، خلاصہ اُن کی ملاقاتوں کا یہ تھا کہ حکومت کے بارے میں جو نکتہ چینی پھیلتی جا رہی ہے اس میں حصہ نہ لوں، وہ سمجھتے تھے کہ میرے قلم اور زبان دونو گرم رو ہیں، نوابزادہ نصراللہ خان کے متعلق فرمایا کہ سیاست میں ان کے ہم خیر رہے ہو ان کو سمجھاؤ، اپوزیشن کے میدان میں گلی ڈنڈا کھیلنے سے بہتر ہے کہ اپنے علاقہ میں کوئی ہل لگالیں، میں نے ان سے کہا نوابزادہ نصراللہ خان غیرت مند آدمی ہیں وہ ہلوں سے اپنے خیالات کا سودا نہیں کرتے اور میرا ان سے کچھ کہنا مشکل ہے، آپ خود بات کریں، کہنے لگے وہ بے ڈھب آدمی ہے ضدی ہے مانتا ہی نہیں بھٹو کے متعلق موسیٰ خان اشتعال کی حد تک ناراض تھے اور ان کی ہنوائی ترک کر دینے کے خواہاں تھے، ان کی بات نہ مان کر میں نے ان کے اشتعال اور غضب کو بھڑکا دیا تھا۔

صدر ایوب نے دو دفعہ یاد کیا، لیکن میں دونو دفعہ طرح دے گیا، ایک دفعہ ایک بہت بڑے افسر کی معرفت جو براہ راست ان کے ماتحت تھا اور جس کا کام ملک کے صحیح صحیح حالات اُن کے سامنے رکھنا تھا۔ وہ سوجھ بوجھ کے لحاظ سے بڑا جہاں دیدہ انسان تھا میں نے صدر ایوب سے متعلق اس سے کہا کہ جن لوگوں پر وہ گذارا کر رہے ہیں وہ آڑے وقت اُن کے نہیں ہوں گے، ان صاحب نے مجھ سے کہا کہ ایوب خان کو گلا ہے کہ ان کے پاس جو آتا ہے کچھ لینے کو آتا ہے میں نے کہا صدر ایوب غلط کہتے ہیں، جو ان کے پاس جاتا ہے وہ بکنے کے لئے جاتا ہے اور جس کو وہ بلاتے ہیں خریدنے کے لئے بلاتے ہیں۔

میں نے رہائی کے فوراً بعد چٹان کی ادارت سنبھالتے ہی "کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے" کے زیر عنوان اداریہ میں لکھا تھا کہ

۱۔ میں قلم کو ہمیشہ ضمیر کی آواز پر اٹھاتا ہوں، لہذا کسی لفظ پر اس لحاظ سے ندامت نہیں ہوتی کہ اس میں کوئی مخفی اشارہ ہے یا اس پر کسی اور کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔[1]

---

[1] "صدر ایوب کیا کریں" کے متعلق صدر کو فسانہ سازوں نے یہ تاثر دیا تھا کہ اس اداریہ کے محرک ملک امیر محمد خان گورنر مغربی پاکستان تھے۔ اور ان کی سبکدوشی کے چارج شیٹ میں ایک جرم یہ بھی تھا۔

۲ - کسی ماں نے آج تک وہ بچہ ہی نہیں جنا جو میرے قلم و زبان کو خرید سکے میرے نزدیک قلم فروشی عصمت فروشی سے کم نہیں بلکہ اس سے بھی قبیح اور مکروہ ہے۔ قدرت نے قلم اس لئے نہیں دیا کہ بیچا جائے اس سے بہتر ہے کہ ہاتھ شل ہو جائیں، زبان اس لئے نہیں بخشی کہ مرہون غیر ہو، ایسی زبان پر فالج گر جائے تو خدا کا احسان ہے۔

۳ - میں نے جو کچھ لکھا وہی لکھا جو خود محسوس کیا، میں زبان و بیان میں ٹھوکر کھا سکتا ہوں لیکن ضمیر مطمئن رہتا ہے کہ آواز اس کی اپنی ہوتی ہے وہ لوگ جو قلم کا کاروبار کرتے ہیں میں انہیں شر الدواب عند اللہ سمجھتا ہوں، میرے نزدیک وہ تمام ادیب، شاعر، صحافی، واعظ مقرر اور خطیب پالا تالوں کی مخلوق ہیں جنہوں نے جوہر قلم اور جوہر زبان کو بازار کی جنس بنا دیا ہے اور جن کا خیال ہے کہ انہیں درباروں کی چوکھٹ پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے، تاریخ میں اسی کا نام عبرت ہے۔

۴ - چٹان یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو نکلا تھا، شروع سال ۱۹۴۹ء سے باقاعدہ ہو گیا، آج اس کو اُنیس سال ہوتے ہیں اس پہلی تاریخ سے اس کا بیسواں سال شروع ہو گیا ہے، پہلے دن بھی اس کا طغرائے امتیاز یہی تھا کہ جس بات کو حق سمجھو اس کو بے کم و کاست کہہ ڈالو آج بھی اس کا شیوۂ افتخار یہی ہے کہ حق کا ساتھ دو، خواہ وہ مسجد کے فرش پر ہو یا میکدہ کی چوکھٹ پر، ہم اجتماعی طور پر ذاتی حیثیت سے جو محسوس کرتے ہیں وہ حوالہ قلم کرتے ہیں، کوشش یہی ہے کہ کلمۃ الحق کی پشتیبانی ہو، اس کے لیے ہم نے ماضی مرحوم سے لے کر اب تک بے شمار صعوبتیں اُٹھائی ہیں اور جو کچھ حاصل کیا وہ قوت بازو سے حاصل کیا، اس پر آج تک کسی دوسرے کے انعام و احسان کی مُہر نہیں لگی، صرف اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم شریک حال رہا ہے، چٹان کسی تنظیم کا پرچہ نہیں، نہ مستعمل معنوں میں وہ کسی مکتب خیال کا نمائندہ ہے یا اُس کے حلقہ بگوشوں میں ہے وہ ایک

آزاد خیال ہفتہ وار ہے جس کا دل لوگوں کے دلوں کی اجتماعی دھڑکنوں کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ اس کا ہمیشہ ہی یہ شعار رہا ہے کہ سیاسی مجاوروں، ادبی نٹ کھٹوں، شرعی جیب تراشوں اور مجلسی لفندروں کا پردہ چاک کیا جائے، قیمت اس کی خواہ کچھ ہی ادا کرنی پڑے۔ جب تک ان لوگوں کا وجود باقی ہے اور چٹان بفضل تعالیٰ زندہ ہے سیاسی عجائب گھروں کی مورتیوں، ادبی بتکدوں کے کھلونوں، منبر و محراب کے آوارہ مصرعوں اور مجلسی روز بازار کے مہنتوں کی باز پرس جاری رہے گی۔ ع

لوٹ تو سکتے ہیں لیکن ہم لچک سکتے نہیں

۵ جس دن چٹان نہ رہا اور اس کے ایڈیٹر کا سفر دنیا پورا ہو گیا اس دن یہ تعاقب بھی ختم ہو جائے گا، اللہ کی کائنات کسی بھی انسان کی محتاج نہیں، لوگ اپنا اپنا سفر پورا کر کے دارالبقا کو پہنچ جاتے ہیں، جہاں ہر شخص یکساں ہے اور اپنے اعمال و افکار کے لئے جوابدہ، البتہ ان کی جوابدہی ذرا زیادہ سخت ہو گی جو مخلوق خدا کے اجارہ دار تھے لیکن مخلوق خدا ہی کی تجارت کرتے تھے۔

جب تک دریاؤں میں پانی بہتا ہے، پہاڑوں کے سینے تنے ہوئے ہیں سورج نکلتا ہے ستارے چمکتے ہیں، چاند دمکتا ہے، ہوائیں چلتی ہیں، کائنات قائم ہے خدا کا نام لیا ہی جائے گا، آزادی کی حفاظت کی جائے گی، جنگ کے دنوں میں ملک کی اور امن کے دنوں میں ضمیر کی، زندہ قوموں کا یہی شعار رہا ہے کہ وہ دشمن سر پہ ہو تو اپنے ملک کی حفاظت کرتی ہیں اور زمانہ امن میں اپنے حقوق کی، ان کے حقوق کی بحالی کا نام ہی قومی آزادی ہے۔ انسان فانی ہے نہ کسی انسان کی مصیبت ہمیشہ رہتی ہے نہ اقتدار۔ وما علینا البلاغ

(چٹان ۱۶ جنوری ۱۹۶۷ء)

الطاف گوہر اور احمد سعید کرمانی اس معاملہ میں مخلص تھے کہ دونوں ہی نہیں چاہتے

تھے کہ صدر یا گورنر سے میرے تعلقات قائم ہوں، الطاف گوہر کے وجوہ کیا تھے وہ خود جانتے ہیں، احمد سعید کرمانی کو اپنے وجود کے ہل جانے کا اندیشہ تھا میں نے آخر کار یہ بات گورنر موسیٰ سے کہدی تھی کہ احمد سعید کرمانی کیا ہے اور کیا نہیں؟ بھٹو کے خلاف یکم مارچ ۱۹۶۷ء کو کرمانی نے ایک بیان جاری کیا جس میں بعض سوال کئے گئے، کچھ نوجوانوں نے، جو اس زلہ ربا کے زلہ ربا تھے، بھٹو سے جلسہ عام میں ان سوالات کا جواب مانگا۔

بھٹو نے کرمانی کے متعلق تعریضاً کہا

"ہو از شی؟" (Who is she ?) محترمہ کون ہے؟

میں نے یہ فقرہ چٹان میں نقل کیا اور لکھا کہ یہ جواب نہیں استفسار ہے، چونکہ اور کسی اخبار نے ان کے وزیر اطلاعات ہونے کے باعث یہ فقرہ نقل نہیں کیا تھا، صرف چٹان ہی نے نقل کیا تھا اس لئے کرمانی نے کوہستان کو جو ان دنوں اس کی نگرانی میں تھا میرے خلاف بیہدہ گوئی پر لگا دیا، اس غرض سے ایک ایسے لنگڑے کو مامور کیا جو پاک جمہوریت کا نیوز پرنٹ ہضم کرنے کے الزام میں ماخوذ تھا، الطاف گوہر کے محکمۂ اطلاعات نے ہمارے خلاف اس کو یہاں بھجوا دیا اور اس حُسنِ خدمت کے صلہ میں اس کا جرم معاف کر دیا۔ کرمانی قلم کی سنجیدگی کا مستحق نہ تھا اور وہ قلمکار ان کتوں کی طرح تھا جنہیں بڑے بڑے زمیندار مخالفوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کے لئے چارہ کھلاتے ہیں۔

"نوائے وقت" کے سوا اُس دور کے اخبارات حکومت کی جیبی گھڑی ہو گئے تھے، ان میں ہمارے دوست اخبار بھی تھے لیکن مجبور تھے، ان کے دل ہمارے ساتھ تھے، الطاف گوہر نے میرے متعلق انہیں یہ ہدایات جاری کی تھیں کہ میرا نام تک نہ آئے اور یہ بات مجھ سے ٹرسٹ ہی کے ایک ایڈیٹر نے بیان کی تھی، میں نے قلم کو تیز کر دیا اور ایسے تمام لوگوں کو جو ایوب خان کی مُونچھ کا بال بنے ہوئے تھے رگیدنا شروع کیا۔

ان دنوں خان انعام اللہ خان مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے

انہوں نے ہائی کورٹ کا صد سالہ جشن منایا، تو صدارت و افتتاح کے لیے صدر ایوب کو بلوایا ان کا استقبال اس طرح کیا کہ ایک طرف چوبداروں کے ہاتھ میں قرآن اور دوسری طرف دستور پاکستان کا نسخہ تھا، پنجاب پولیس نے صد سالہ جشن جس میں مشرقی پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس سردار سنت سنگھ کو مدعو کیا تھا میں نے اس وقت بھی اس تقریب کے انعقاد پر احتجاج کیا تھا اس وقت جسٹس انعام اللہ خان کو ایک خط لکھا، ان کے پرائیویٹ سکریٹری نے ۱۸ مارچ کو دستی وصول کیا، متن یہ تھا۔

۱۷ مارچ ۱۹۶۷ء — حوالہ نمبر ۳۳-پ ح-۶۷

گرامی منزلت،

سلام مسنون،

بہت دنوں سے میرا جی چاہ رہا تھا آپ کو خط لکھوں لیکن آپ کے منصب کی توقیر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ارادہ باندھ کر توڑتا رہا، عدالت عالیہ کے لئے میرے دل میں ہر لحاظ سے بے پناہ احترام ہے کیونکہ اس گئے گزرے دور میں آپ لوگ ہی ہماری عزتوں کے محافظ ہیں، احترام کی یہی تھاہ مجھے آمادہ کر رہی ہے کہ آپ کو نقد و نظر کے ان دو چار پہلوؤں سے مطلع کروں جو مختلف دماغوں سے اُبھر کر اکثر زبانوں کی روزمرہ گفتگو میں رنگینی و سنگینی پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں،

اولاً: ہائی کورٹ کا صد سالہ جشن ہماری قومی آزادی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی تاریخ غیر ملکی غلامی کی تاریخ ہے۔

ثانیاً: قرآن پاک کلام الٰہی ہے، رسول اللہ پر نازل ہوا اور حشر تک تغیر و تبدل کی ہر آنچ سے محفوظ کیا گیا ہے اس کے کسی ایک شوشے اور نقطے میں بھی ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی، اس کے برعکس ہمارے دستور حلف لینے کے بعد

توڑے گئے اور ایک حلف نے دوسرے حلف کی جگہ لی، ظاہر ہے کہ ان دساتیر کے معاملہ میں ثبات ایک تغیر کو ہے، قرآن مجید کو دستور کی ان جلدوں کے حاشیہ میں لینا اول تو بجائے خود غور طلب تھا دوم آپ کی بالغ نظری اس سے آگاہ ہے کہ ہمارے ضابطہ ہائے قانون کو اجتماعاً قرآن و اسلام سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

یہ تاریخی پہلو بھی خاصا دلچسپ ہے کہ ساری تاریخ اسلام میں قرآن پاک کی نمائش کے دو ہی واقعات ہیں، ایک قرن اول میں جنگ جمل کا واقع ہے، جب اس کتاب مظلوم کی نمائش نیزوں پر ہوئی تھی اور دوسرا یہ واقعہ ہے کہ چوبداروں کے ہاتھ میں قرآن اور ہم پہلو دستور پاکستان کی جلدیں تھیں۔

ثانیاً: اگر سو سال کی عمر ہی اصل معیار ہے تو ہائی کورٹ کی تاریخ میں آج تک ایسی کسی دعوت استقبالیہ کا سراغ نہیں ملتا جو شالیمار میں قبول کی گئی ہو۔ پھر جن دو آدمیوں کی طرف سے اہتمام کیا گیا ان کا وجود عامۃ الناس میں قانون و سیاست کی رو سے بحث و نظر کا موضوع چلا آتا ہے۔

غرض آپ کی عزت و تکریم کے حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ تمام گذارشات عرض کر دی ہیں جن کا اضطراب ان الفاظ کا محرک ہوا ہے، اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں عدالت عالیہ اور اس کے اعضاء و جوارح کو متاع عزیز سمجھتا اور عدل جو امر ربانی ہے اس کا سرچشمہ خیال کرتا ہوں۔

ادب و احترام کی گہرائیوں کے ساتھ

آپ کا شورش کاشمیری ایڈیٹر ہفت روزہ چٹان لاہور

بخدمت گرامی

عالیجناب خان انعام اللہ خان صاحب۔

چیف جسٹس ہائی کورٹ مغربی پاکستان، لاہور

جن دنوں تحریک تاشقند کے اسیروں نواب زادہ نصر اللہ خان، چودھری محمد حسین چٹھہ خواجہ محمد صفدر، اور میاں منظر بشیر وغیرہ کا مقدمہ ہائی کورٹ میں چل رہا تھا انہی دنوں سید محبوب مُرشد چیف جسٹس مشرقی پاکستان کسی تقریب کی صدارت کے لئے لاہور آئے تو خواجہ عبدالرحیم کے ہمراہ میں بھی اُنہیں ایئرپورٹ لینے گیا، وہاں وی آئی پی روم میں جسٹس انعام اللہ خان بھی انہی کے لئے آئے تھے، وہ خواجہ صاحب سے ہائی کورٹ میں اپنے اصلاحی و انتظامی کاموں کا تذکرہ کرنے لگے۔ اُن کا خیال تھا کہ انہوں نے وکلاء کی بعض موکل آزاریوں کو روکا ہے۔ اپنی گُل افشانی گفتار میں اس قدر محو تھے جیسے کوئی سحر پھونک رہا ہو، میں نے محسوس کیا کہ اپنے وجود کا احساس دلا رہے ہیں، عرض کیا مجھے ایک گذارش کرنی ہے، کہنے لگے کیا؟

> میں نے کہا ـــ پولیٹیکل لوگ ہی کسی ملک کی عزت ہوتے ہیں، یہ نہ ہوں تو ملک متحرک رہنے کی بجائے شل ہو کر رہ جاتے، ان لوگوں کے مقدمات کی سماعت کے لئے ان لوگوں کو مقرر نہ کریں جو پولیس افسروں کی اولاد ہیں اور جن کی تعلیم و تربیت اس خاص فضا میں ہوئی ہے، میرا اشارہ جسٹس محمود کی طرف تھا جو خان بہادر عبدالعزیز او بی ای (مشہور قائم مقام انسپکٹر جنرل پولیس) کے فرزند اور میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کے داماد تھے۔

خان انعام اللہ خان چُپ سے ہو گئے، اتنے میں سید محبوب مُرشد کا جہاز آ گیا اور ہم انہیں لینے باہر چلے گئے۔

خوشامد، گھٹن، بے حسی، دنائت اور مداہنت اس انتہا کو پہنچ چکی تھیں کہ جن اداروں اور راہنماؤں سے کلمۃ الحق کی توقع ہو سکتی تھی وہ الا ماشا اللہ سب کے سب مُہر بلب ہو گئے تھے، وہ زبانیں جو تحریک جمہوریت میں آگے آئیں اُن سے بلاشبہ ایک ولولہ اُبھر

رہا تھا لیکن اس کے مقابلہ میں انجماد بہت زیادہ تھا۔ فاطمہ جناح ایک چراغ روشن کر کے واصل بحق ہو گئیں، خواجہ ناظم الدین بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، چودھری محمد علی، نوابزادہ نصر اللہ خان، میاں ممتاز دولتانہ قبرستان کے اس سناٹے میں اذان دے رہے تھے کہ بھٹو بھی آ گئے لیکن ابھی تک عوامی تحریک کے برگ و بار پیدا نہ ہوتے تھے، پہلے ذکر آ چکا ہے کہ روزناموں میں نوائے وقت کے سوا تقریباً سبھی اخبار حکومت کے اعلیٰ کیا ادنیٰ افسروں کے انتداب میں تھے، پریس ٹرسٹ کے اخباروں کی مجبوری واضح تھی لیکن کئی اخبار جو انفرادی ملکیت میں تھے حکومت کی منشا کے خلاف اپوزیشن کی معمولی سی خبر دیتے ہوئے بھی اختلاج قلب کا خطرہ محسوس کرتے تھے، منعم خان نے ڈھاکہ میں اتفاق کا ڈیکلریشن منسوخ کر کے اس کا پریس ضبط کر لیا تھا، مالک و مدیر مسٹر تفضل حسین عرف مانک میاں کو جیل میں ڈال دیا تھا، نوائے وقت کے متعلق بھی کچھ ایسی ہی تیاریاں کی گئیں لیکن کسی وجہ سے ٹل گئیں، چٹان پکڑا گیا نتیجۃً بعض دوست کنی کترا گئے بعض کو نقصان پہنچ گیا، فرموں اور ایجنسیوں کو ہدایت کی گئی کہ چٹان کو اشتہار نہ دیں، ایک مرکزی وزیر نے ایک صنعت کار دوست کو خبردار کیا کہ صدر ان سے ناراض ہیں کہ وہ نوائے وقت اور چٹان کی مدد کرتے ہیں، مدد کیا تھی؟ کہ ان کی سٹیشنری چٹان پریس میں چھپتی تھی، اس مکرم دوست نے کہا کہ وہ اس جبر کا مقابلہ نہیں کر سکتا پریس ضبط ہو گیا تو بلا ٹل گئی۔

چٹان نے اس گھٹن میں ادبی زبان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور یہ امر حکومت کے لئے اور بھی پریشان کن تھا، مثلاً ۱۰ اپریل ۱۹۶۷ء کے اداریہ کا عنوان تھا "آخری چارہ کار" ملاحظہ ہو،

"یونان کا ایک نامور فلسفی جب عوام کی ناقدری سے عاجز آ گیا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے فکر و نظر اور علم و حکمت پر لوگ توجہ نہیں دیتے بلکہ مذاق اڑاتے ہیں اور اس پر پتھراؤ کرتے ہیں تو اس نے دشنام و اتہام سے تنگ آ کر رقص و سرود کا ایک طائفہ بنایا، پھٹے پرانے

کپڑے پہن کر ڈھول گلے میں ڈالا، چہرہ پر بھبوت مل لی، ہاتھوں میں کنگن ڈال لئے ، گانے بجانے کا سوانگ رچایا اور پاگلوں کی طرح بازاروں میں ناچنے لگا، وہ رقص وغنا کے ابجد سے بھی واقف نہ تھا لیکن رسمی دانشوروں نے سر پہ اُٹھا لیا۔ اس کے رقص پہ محاکمہ ہونے لگا کہ اس فن میں اس نے نئی راہیں نکالی ہیں تب پاگل تھا، اَب مجتہد ہے۔

جب یونان میں اُس کے اِس نئے روپ کا شہرہ عام ہو گیا تو اس نے اعلان کیا کہ فلاں دن وہ اوپن ایئر تھیٹر میں اپنے طائفہ سمیت رقص وسرود کے نئے انداز پیش کرے گا، تمام ایتھنز ٹوٹ پڑا، اس نے رقص کا نیا انداز پیش کیا، سراپا دیوانہ ہو گیا ناچ نہیں جانتا تھا لیکن پاگلوں کی طرح ناچتا رہا، عوام وخاص اور امراو شرفا لوٹ پوٹ گئے، جب وہ تھک گیا اور محسوس کیا کہ جو لوگ اس کے سامنے بیٹھے ہیں اس کی مٹھی میں ہیں تو یکایک سنجیدہ ہو کر کہا:

"یونان کے بیٹو! میں تمہارے سامنے علم ودانائی کی باتیں کرتا رہا میں نے تمہاری برتری کے لئے فکر ونظر کے موتی بکھیرے تم نے میری باتیں سننے سے انکار کر دیا، میرا مذاق اڑایا، مجھے گالیوں سے نوازا، پتھراؤ کیا اور خوش ہوتے رہے، تم نے حق وصداقت کی ہر بات سننے سے انکار کیا، مجھے پاگل قرار دے کر خود پاگلوں کی سی حرکتیں کرتے رہے، تم نے اپنے دماغ حکمرانوں کے پاس رہن رکھ دیئے، تمہارے جسموں کی طرح تمہاری عقلیں بھی امراء وحکام کی جاگیر ہو گئی ہیں۔

میں عاجز آ گیا تو میں نے یہ روپ اختیار کیا، میں فلسفی کی جگہ بھانڈ ہو گیا، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ ناچ کیا ہوتا ہے اور گانا کسے کہتے ہیں، لیکن تم نے میرے اس بھانڈپن پر تحسین و ستائش کے ڈونگرے برسائے، پہلے تم میں سے چار آدمی بھی میرے گرد جمع نہیں ہوتے تھے آج انسانوں کا جم غفیر میرے سامنے بیٹھا ہے گویا تم نے مٹ جانے والی قوم اور ایک فنا ہو جانے والے معاشرے کی تمام نشانیاں قبول کر لی ہیں تم ایک انحطاط پذیر ملک کی ذلیل روحوں کا انبوہ ہو۔

تم پر خدا کی پھٹکار ہو تم نے دانائی کو ٹھکرایا اور رسوائی پسند کی۔

تم خدا کے غضب سے کیونکر بچ سکتے ہو کہ تمہارے نزدیک علم ذلیل ہو گیا ہے اور عیش شرف و آبرو۔ جاؤ میں تم پر تھوکتا ہوں، میں پہلے بھی پاگل تھا آج بھی پاگل ہوں۔

جب علم و نظر اور فکر و معروف کو یہ مرحلہ جانکنی پیش آجائے۔ خوشامد کا بول بالا ہو اور حکمت و دانائی احمقوں کے گھرانے میں چلی جائے اور وہ اپنے دماغ کی علالت کو صحت کا نام دینے لگیں۔ علم کے مالک جاہل، ادب کے اجارہ دار گاؤدی، سیاست کے متولی کاسہ لیس اور دین کے مسند نشین بکاؤ ہو جائیں تو اس فضا میں یونان کے فلسفی کی طرح پاگل ہو کر ناچنا بھی عین عبادت ہے اور نہیں تو اس سے خدا کا غضب ہی ٹھنڈا ہوتا ہے۔

وما علینا الا البلاغ۔

اس افتتاحیہ کے تحت درج ذیل ضمنی اداریہ بھی تھا ـــــ **ایک اور چارہ**

حجاج بن یوسف اپنے مصاحبوں کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا اس نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔

تمہارا حجاج کے متعلق کیا خیال ہے؟ راہ گیر نے کہا،

صاحب کچھ نہ پوچھیے وہ پرلے درجے کا سفاک اور اسفل ترین انسان ہے، حجاج نے ساتھیوں سے کہا،

اسے ساتھ لے لو،

وہ ساتھ لے کر چلے تو راہ گیر نے پوچھا۔

"یہ کون ہے"

ایک نے کہا ـــ "حجاج بن یوسف"

وہ بھونچکا رہ گیا، اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر کہا۔

امیر! مہینہ میں تین دن میں پاگل ہو جاتا ہوں، آج میرا پہلا دن ہے۔

حجاج مسکرایا، مصاحبوں سے کہنے لگا۔

"اسے چھوڑ دو۔"

اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تو دو گیارہ ہو گیا۔

بالفاظ دیگر کلمۂ حق کبھی یوں بھی ادا ہو جاتا اور انسان قہر و غضب کے مجسموں سے محفوظ بھی رہ جاتا ہے۔

یہ دونو اداریہ پریس برانچ کے لئے دردسر ہو گئے، لیکن اس میں قانونی پکڑ کہیں نہ تھی، ایوب خان کے سوانح حیات فرینڈز ناٹ ماسٹر Friends not Masters کا اردو نام "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" کے بعض حصے ملک بھر کے اخبارات میں اس کروفر سے چھپوائے گئے گویا ملک کی سب سے بڑی تصنیف ہو، کئی زبانوں میں ترجمے شائع کئے گئے حتیٰ کہ اسکولوں اور کالجوں کیلئے اقتباسات اس طرح انتخاب کئے گئے، کہ ہر درجہ کے نصاب میں شریک کئے جائیں، ٹیلیویژن، ریڈیو اور اخبارات میں دانشوروں نے اس تواتر سے ستائش کی، جیسے کسی رئیس زادے کی شادی پر خواجہ سرا بدھائی دینے چلے آتے ہیں، ایوب خان کے سامنے ان کے وزرا کی جو حالت تھی میں اس سے کما حقہٗ آگاہ تھا، اس کی تصویر کشی ۴ ستمبر ۱۹۶۷ء کے شمارے میں دربار اکبری کے تحت ایک ڈرامائی فیچر میں کی گئی، یہ ایک حملۂ ترکانہ تھا جس سے کئی وزیروں اور افسروں کا غصہ تیز ہو گیا۔ نتیجتہً چغل خوروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا وہ صدر یا گورنر سے ملتے تو ملاقات کے نسخہ میں رتی بھر چغلی شامل کرتے، میں ان کے ردعمل سے محظوظ ہوتا، گورنر موسیٰ آتش مزاج تھے انہیں مذاق سخن نہیں تھا، صدر ایوب سیانے تھے اور سب کچھ جانتے تھے لیکن مانتے انہی کی تھے جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ محض ان کے وفادار ہیں۔

دربار اکبری

شہنشاہ عالم پناہ جلال الدین اکبر ہشت پہلو تخت پر اپنے تمام دبدبے کے ساتھ

فروکش ہیں، تخت کیا ہے سونے اور چاندی سے مسجع، الماس، لعل، یاقوت اور موتیوں سے مرصع بہ قول محمد حسین آزاد دریا نے دل اور پہاڑ نے جگر چیر کر بنایا ہے، سر پہ چتر زرکار زرتار، جواہر نگار جھالروں میں مروارید و جواہرات جھلمل جھلمل کرتے، دربار میں امرار و روسا، وزرا۔ وفقہا، علمار و فضلا۔ مراتب کے زینوں پر ایستادہ

نورتن۔ علامہ اجل ابوالفضل، ملک الشعرار فیضی، حکیم ابوالفتح، حکیم ہمام، راجہ بیر بر راجہ ٹوڈرمل، عبدالرحیم خان خاناں، راجہ مان سنگھ، مرزا کوکلتاش خان۔

جہاں پناہ فرماتے ہیں۔

جس ملک پر ہم نے اپنے اقبال کا پرچم لہرا رکھا ہے یہ ملک ودوانوں کا ملک ہے، عالموں کی نگری ہے، دانشمندوں کا گھر ہے، عقلمندوں کا حصار ہے، اس اقلیم نے بڑے بڑے رشی اور منی پیدا کئے، تاریخ سے پہلے بھی یہاں علم کا سراغ ملتا ہے، آریہ آئے تو علم و عقل کی دولت کے ڈھیر لگا دیئے، گنگا اور جمنا کا پانی ان کے ہاتھوں سونا ہو گیا، آخر میں اسلام آیا، اس نے اس زمین کو اتنا سر سبز کیا کہ چاروں طرف علم و تہذیب کا لالہ زار کھل گیا، آج بھارت کی ساری رونق اسلام کے دم قدم سے ہے لیکن اے اعیان سلطنت ہمیں کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ناخواندہ ہیں: قرطاس و قلم سے آشنا نہیں، اقبال ہمارا ضرور ہے لیکن علم ہمارے دربار میں تو ہے ہمارے پاس نہیں؟

تمام درباری مبہوت کھڑے ہیں، شہنشاہ جہاں پناہ کے روبرو، کسی کو یارائے سخن نہیں، شہنشاہ دوبارہ گویا ہوتے ہیں۔

اے اعیان سلطنت، ہمارے دل میں اپنے ناخواندہ ہونے کی خلش ہے۔

ابوالفضل: جہاں پناہ علم آپ کا غلام ہے اور یہی منشائے ایزدی ہے۔

حکیم ابوالفتح: ظل اللہ آپ کے ہونٹوں کی ہر جنبش علم ہے۔

راجہ بیربر: آپ علم کا منبع ہیں۔

راجہ ٹوڈرمل = علم آپ کے مندر میں دیوداسیوں کی طرح رہتا ہے۔

حکیم ہمام = آپ جو کچھ بولتے ہیں علم اس سے جلا پاتا ہے۔

عبدالرحیم خان خاناں = آپ کی تلوار سے علم پھوٹتا ہے۔

راجہ مان سنگھ = علم آپ کی چوکھٹ ہے۔

مرزا کوکلتاش = علم آپ کا خانہ زاد ہے، ادب آپ کے سامنے باادب کھڑا ہوتا ہے۔

فیضی = جہاں پناہ "پیغمبر با صلوٰۃ اللہ علیہ ہم امی بودہ"

(دربارِ اکبری صفحہ ۱۳۷)

(۲)

فتح پور سیکری کی ایک شام

(قصرِ شاہی میں)

شہنشاہ = ہم محسوس کرتے ہیں کہ رعایا کے بعض گروہوں میں کھسر پھسر ہوتی ہے انہیں رام کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں، ادھر ممالک محروسہ میں اعمال و افعال کی نگرانی بہت ضروری ہوگئی ہے۔

ابوالفضل = گیتی پناہ! فکرِ معلیٰ میں وہ کون لوگ ہیں جن کے اعمال و افعال کی نگرانی ضروری خیال کی گئی ہے۔

شہنشاہ = بظاہر کوئی خاص جماعت نہیں، لیکن وقائع نویسوں کے بین السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ رعایا کو مٹھی میں رکھنے کے لئے بعض طبقوں کو مٹھی میں رکھنا سلطنت کے فرائض میں شامل ہے، مثلاً امرائے سلطنت۔

ابوالفضل = جہاں پناہ! امرائے سلطنت ہمیشہ طاقت کی مٹھی میں رہتے ہیں ربِ ذوالجلال نے آپ کی طاقت کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا ہے، ان سے کسی اندیشے کی ضرورت نہیں کسی نے سرکشی کے عنوان سے سوچا بھی تو اس کا بھرکس نکال دیا جائے گا۔

شہنشاہ: وزرائے سلطنت؟

ابوالفضل: ظل اللہ ان کا وجود پیشانی مبارک کی شکنوں کے اُتار چڑھاؤ پر ہے ناراضی کی ایک شکن ان کے لئے مدفن بن سکتی ہے۔

شہنشا علما؟

ابوالفضل: آپ کے دست پناہ ہیں۔

شہنشاہ: مشائخ۔

ابوالفضل: کچھ گوشہ نشین ہیں جن سے کوئی خطرہ نہیں، باقی خوشہ چین ہیں جنہیں چوب شاہی کہا جاتا ہے۔

شہنشاہ: دور اُفتادہ راجے مہاراجے، جاگیردار، تعلقہ دار وغیرہ۔

ابوالفضل: جہاں پناہ ان کے لئے بستر عیش سے بڑی کوئی چیز نہیں، یہ لوگ دن کو سوتے اور رات کو جاگتے ہیں۔

شہنشاہ: تاجر پیشہ۔

ابوالفضل: وہ صرف نفع کے لئے جیتے ہیں۔

شہنشاہ: رعایا؟

ابوالفضل: راعی کی پرستار ہوتی ہے۔

شہنشاہ: ہم چاہتے ہیں یہ سلطنت جاوداں ہو جائے۔

ابوالفضل: جہاں پناہ یہ سلطنت جاوداں ہے جب تک پہاڑ کھڑے ہیں، سمندر موجود ہیں، دریا بہتے ہیں، میدان قائم ہیں، اس سلطنت کا آفتاب نصف النہار پر رہے گا یہی امر ربی اور اسی کا نام دین الٰہی ہے۔

شہنشاہ: ابوالفضل ہم چاہتے ہیں ہماری کوئی تصنیف ہو۔

ابوالفضل: جہاں پناہ یہ عظیم سلطنت آپ کی سب سے بڑی تصنیف ہے، ظل الہ

نے تلوار سے لکھی ہے، اعلیٰ حضرت صاحبقران تیمور نے تصور کیا، اعلیٰ حضرت ظل الہٰی ظہیر الدین بابر نے خیال باندھا، اعلیٰ حضرت نصیر الدین ہمایوں نے سرنامہ لکھا اور حضرت گیتی پناہ نے متن تحریر فرمایا۔

شہنشاہ: ہم ایک ایسی تصنیف چاہتے ہیں جو قلم سے لکھی جائے، دماغوں پر نقش ہو، دلوں میں جگہ پائے، زبانوں پر چرچا رہے، اہل علم اس کا تذکرہ کریں، اہل سخن اس کے قصیدے لکھیں، اہل نقد تبصروں سے چار چاند لگائیں جہاں تہاں اس کا شہرہ ہو۔

ابوالفضل! تلوار کی سلطنت آنی جانی ہے قلم کی سلطنت دائم رہتی ہے۔

ابوالفضل: جہاں پناہ منشائے ہمایونی سے غلام زادہ مطلع ہوتا ہے، ظل اللہ کی خواہش کے مطابق تزک اکبری تیار ہو گی اور رہتی دنیا اس پر فخر کرے گی۔

(۳)

بیت ابوالفضل

(ملا مبارک، ابوالفضل، فیضی)

ملا مبارک: ملا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبد النبی بہر حال ان دونو کا پتہ کٹ چکا ہے، ہمارا فرض ہے کہ شاہ کو شیشہ میں اتاریں، بادشاہوں کا شعار ہے کہ اپنی متابعت اور اطاعت چاہتے ہیں، جو لوگ دربار میں موجود ہیں وہ متابعت کا فرض بکمال وتمام ادا کر رہے ہیں، ان کے لئے شاہ کا ہر حکم حرز جان ہے، جہاں تک اطاعت کا تعلق ہے اس کا جوا بھی انہوں نے گردن میں ڈال رکھا ہے، وہ دربار کی نوکری نہیں بندگی کر رہے ہیں، ہمارا فرض ہے کہ اس اطاعت کو پروان چڑھائیں اور عبادت بنا دیں۔ بادشاہ ناخواندہ ہو تو خوشامد اس کی معراج ہوتی ہے وہ بلد ہی فریب نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے، ہمیں بادشاہ کو عملاً ظل اللہ بنا دینا چاہیئے، کلمہ اس کا پڑھیں اور اس قسم کی حدیثیں وضع کریں جس سے مترشح ہو کہ بادشاہ مامور من اللہ ہے، ایک گمراہ دماغ کو گمراہی پر جما دینا چنداں دشوار

نہیں، ایک دفعہ وہ گمراہی کا ہو جائے تو پھر کوئی سی شے بھی اس کو راہ راست پر نہیں لا سکتی ہے۔

ابوالفضل: ابا جان آپ نے جو کچھ فرمایا ہر عنوان سے صحیح ہے، اب صرف اس کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔

فیضی: ہمارا علم کس کام ہے یہ نہ کر پائے تو پھر حیف ہے اس زندگی پر! آیئے بسم اللہ کریں۔

قلعہ معلّے میں

(عمائدین سلطنت کے ساتھ)

ابوالفضل: دین الٰہی قائم ہو چکا، حضرت گیتی پناہ امام عادل ہیں، آئندہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ کہا جائے، سلام علیک کی جگہ اللہ اکبر جواب میں جل جلالہ، دین الٰہی اکبر شاہی کے چار ستون ہیں۔

اولاً ترک مال، ثانیاً ترک جان، ثالثاً ترک ناموس، رابعاً ترک دین۔

اور سب نے سر جھکا دیا، ملا بشیری نے قصیدہ شروع کیا۔

اے بحر و بر کے حکمران،

تیری سلطنت صرف اس سرزمین ہی پر نہیں جو اس وقت ترے زیر نگیں ہے تیری سلطنت عرش و فرش پر ہے عرش پر کہ پہلے وہاں لا الہ الا اللہ لکھا ہوا تھا اب اکبر خلیفۃ اللہ بھی نقش ہو گیا ہے۔

فرش پر کہ علم و حکمت فکر و نظر اور دین و دانش کے خزانے تیرے پاؤں کی ٹھوکر میں ہیں۔

تو امامِ عادل ہے تیرے ظہور کی پیش گوئی کتابوں میں ہو چکی ہے۔

تو نے مذاہب کو بکھیرا انہیں اکٹھا کیا ہے تو عظیم ہے۔ تو خود مذہب ہے

خود شریعت ہے خود طریقت ہے خود علم ہے خود فلسفہ ہے خود دین ہے، خود تاریخ ہے، الفاظ نے تجھ سے نطق پایا معانی نے آبرو، افکار نے وسعت، خیال نے تنوع، قلم نے روانی، بلاغت نے زور، فصاحت نے جادو، سلاست نے حسن۔

اے ظل الٰہ ہم تیرے خوان کرم کے ریزہ چیں ہیں،

زندہ باد ظل اللہ

پائندہ باد دین الٰہی۔

ملک جس سانچے میں ڈھل گیا تھا اس کے پیش نظر میرا قطعی خیال تھا کہ اب یہاں پارلیمانی جمہوریت اور عوامی حکومت کا امکان خارج از بحث ہے، مجھے ان تمام عزائم کا علم تھا جو صدارتی انتخاب (۱۹۶۴ء) میں صدر ایوب یا نواب کالاباغ کے ذہن میں تھے، فاطمہ جناح کا جیتنا ناممکن تھا، جیت جاتیں تو ایوب سے حکومت لینا مشکل تھا، شیخ خورشید احمد وزیر قانون میرے ذاتی دوست تھے اپنے ساتھ ایوب خان کے انتخابی جلسہ میں لے گئے۔ لیکن مجھے اس جلسہ میں اپنی حاضری کا اتنا ملال تھا کہ ہفتوں میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا، تاہم مطمئن بھی تھا کہ اس کے پس منظر میں کوئی سی آلودگی نہیں، چوٹ دوستی میں سہی تھی — پہلی اور آخری!

بیان کیا جاتا ہے کہ الطاف گوہر (Friends, Not Masters. کے محرر تھے، اب کئی سال سے وہ میرے قلم کی زد میں تھے اس سوانح میں انہوں نے ایسا گل کھلایا جو شاید ان کے نزدیک میری خامہ فرسائیوں کا مسکت جواب تھا، یا وہ اس طرح بدلہ لینا چاہتے تھے میں نے یہی محسوس کیا، انتخاب کی بحث میں لکھا ہے۔

" ہم نے لاہور کے جلسہ کی خاطر چند شاعروں اور کچھ مقامی مقرروں کا انتظام کیا تھا، لیکن ہجوم اُن میں سے کسی کو سننے کے لیے تیار نہ تھا، وہ صرف مجھے سننے

کے لئے آیا تھا اور کسی شاعر یا پیشہ ور مقرر کو نہیں "

جن مقررین کو اس جلسہ سے خطاب کرنے کے لئے مدعو کیا گیا اور وہاں موجود تھے ان میں مقامی صاحبزادہ فیض الحسن اور ملک غلام نبی تھے اور باہر سے علامہ رشید ترابی اور مولانا جمال میاں آئے تھے، اگر یہ الفاظ ان کے متعلق تھے تو ناشکر اپن تھا اور اگر اس کا ہدف میں بھی تھا تو یہ گھٹیا پن تھا، میں نے چھ دسمبر ۱۹۶۷ء کو صدر ایوب کے نام ایک رجسٹرڈ خط بہ اخذ رسید لکھا جس میں محولا اقتباس کو نقل کرتے ہوئے لکھا کہ

۱ - آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ خلاف واقعہ ہے، آپ کی تقریر کو لوگوں نے شوق سے نہیں سُنا بلکہ عوام نے غل مچایا اور یہ غل وہ مسلسل کئے جارہے تھے ملٹری سیکرٹری نے آپ کے کان میں کچھ کہا اور آپ نے یکایک تقریر ختم کردی۔

۲ - چونکہ آپ کے سوانح ایک گفتگو ہے جو ریکارڈ ہوئی ہے لہذا میرا احساس یہی ہے کہ میری روشنیٔ طبع کو آج تک جن دانشوروں کی بے بصری کے زخم سہنے پڑے ہیں انہیں میں سے کسی نے یہ کلوخ اندازی کی ہے، افسوس ہے کہ آپ کے سیاسی سوانح حیات میں اس انداز کا ایک مخفی دشنہ چھپا ہوا ہے۔

۳ - آپ کو یاد ہوگا صدارتی انتخاب کے دنوں میں آپ نے یاد کیا تھا تو میں اور میرے ساتھ ماسٹر تاج الدین انصاری اور شیخ حسام الدین گورنر ہاؤس میں حاضر ہوئے تھے، ملاقات خاصی طویل تھی، میں نے آپ کے ایک ارشاد پر عرض کیا تھا کہ ہم لوگ تہی دست ضرور ہیں لیکن ہمارا فقر غیور ہے، پیسہ لے کر سیاسی کام کرنا یا خطابت کا معاوضہ چاہنا ایمان کی جانکنی ہے، اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان ماں بہن کو چکلے میں بٹھا کر روزی پیدا کرے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے آپ کی طبیعت اس پر خوش ہوئی تھی اور جب ہم چلنے لگے تو آپ نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے فرمایا تھا ہم ایک دوسرے کے دوست

ہیں اور یہ رشتہ انشاء اللہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔

۴۔ آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ آپ کی مملکت میں ایک شہری ایسا بھی ہے جس کے قلم و زبان کی کوئی قیمت نہیں، اس فقیر کی یہی متاع ہے اگر یہ بک جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے زمین کی پیٹھ سے زمین کا پیٹ بہتر ہے، پیشہ ور لوگ خواہ سیاست میں ہوں خواہ خطابت میں، لفظاً نہ سہی معناً کنجن ہی ہیں۔

۵۔ آپ کے پاس بے پناہ ذرائع ہیں، تحقیق کرالیں کہ آج تک اس عاجز کا ایک کلمہ بھی خریدنے کی کسی شخص کو ہمت ہوئی ہے یا میں نے کبھی اقتدار کے کسی دروازہ سے کوئی فائدہ اٹھایا ہے؟

یار لوگ کچھ ہی کہتے رہیں مجھے یقین ہے کہ حشر کے روز بارگاہ ایزدی میں اس عنوان سے سرخرو ہوں گا میں اپنے آقا و مولا سرورِ کائنات کے سامنے شرمندہ چہرے کے ساتھ پیش نہیں ہونا چاہتا۔

قلم و زبان قدرت کا عطیہ ہیں، انہیں پیشہ بنانے کا وہی لوگ حوصلہ کر سکتے ہیں جن کی غیرت آوارہ مصرعوں کی طرح اڑتی پھرتی ہے۔

۶۔ آپ کی سوانح عمری کے محولہ الفاظ سے میرا دل سخت مجروح ہوا ہے۔

المخلص

شورش کاشمیری

یہ خط چھ دسمبر کو پوسٹ کیا گیا، رسید آگئی لیکن جواب پانچ ہفتہ بعد ۱۲ جنوری ۱۹۶۸ء کو موصول ہوا، بحوالہ ۶۸ - پی آر - ۹۹/۴ - ان کے پبلک ریلیشنز آفیسر کسی صاحب قاضی احمد سعید کی طرف سے تھا، میرا قلم اس دوران میں پہلے سے بھی خشمگین ہو چکا تھا اور میں ان کی حکومت پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا، جواب میں لکھا تھا کہ

۱۔ صدر نے آپ کا خط ملاحظہ فرمایا ہے۔

۲۔ جو اقتباس آپ نے نقل کیے ہیں اس کا ہدف کوئی شخص نہیں، آپ بالکل نہیں۔
۳۔ صدر آپ کی قدر کرتے ہیں۔

اسی مہینے انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر صلاح الدین قریشی نے مجھے یاد کیا اور ایک ایسی بات کہی جو دشمنوں نے وضع کر کے مجھ سے منسوب کی لیکن میرے علم میں نہ تھی، میں ہنس دیا اور وہ مطمئن ہو گئے، مجید نظامی سے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی کوئی ایسی ہی روایت سُن چکے ہیں وہ چاہتے تھے گورنر سے مل لوں، میں نے کہا آپ مسعود الروف سے کہہ دیں کہ وہ گورنر سے وقت لے دیں، میں نے خود آج تک یہ عادت نہیں ڈالی ہے، مجید نے انہیں فون کر دیا، مسعود الرؤف نے مجھے فون کیا اور میں ان کے دفتر چلا گیا، کہنے لگے مجید نظامی نے مجھے کہا تھا میں نے گورنر سے پوچھا، گورنر کہتا ہے شورش سے پوچھو کیا کام ہے؟ میں نے کہا ان سے کہہ دیجیے مجھے آپ سے کوئی کام نہیں ہے، اس فقرہ کا جواب یہی ہو سکتا تھا۔ مسعود الرؤف نے بتایا گورنر ان سے کئی دفعہ کہہ چکا ہے کہ فلاں فلاں بات آپ سے کہوں اور میں نے ہمیشہ احتراز کیا ہے وہ بھٹو کے حق میں آپ کے قلم کی جولانیوں سے سخت نالاں ہیں جب بھی آپ کسی بے پناہ ہجوم کے ساتھ بھٹو کی تصویر چھاپتے ہیں انھیں غصہ آتا ہے۔ آج ہی کہہ رہے تھے اس سے کہو باز آجائے۔

میں نے کہا رؤف صاحب مجھے معلوم نہیں آپ گورنر تک کوئی بات کس طرح پہنچاتے ہیں لیکن میری بات ان تک پہنچا سکیں تو عرض کروں؟ کہنے لگے ضرور پہنچا دوں گا۔ میں نے کہا ان سے کہیے شورش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور کہا ہے کہ میں وہی کروں گا جو میرا ضمیر کہتا ہے میں آپ کا یا کسی اور کا نوکر نہیں ہوں اخبار میرا ہے آپ کا نہیں، میں نہیں کہہ سکتا مسعود الرؤف نے میری بات اُن تک پہنچائی یا نہیں لیکن اس کے بعد یہ اطلاعیں برابر ملتی رہیں کہ گورنر ناراض ہے۔

پاکستان ٹائمز میں ایک دانشور نے لکھا کہ ایوب خان ایشیا کے ڈیگال ہیں، اور یہ مسلم لیگ

(کنونشن) کے زعما کہتے ہی رہتے تھے، میں نے اس پر اداریہ لکھا کہ :۔

"بڑے آدمی یونہی نہیں بنتے انہیں طویل جدوجہد عظیم قربانی اور محیر العقول ذہانت بڑا بناتی ہے، وہ لوگ جو بلاوجہ بڑا بننے کی کوشش کرتے ہیں اور جن کی خدمات کا طول وعرض ان کے اقتدار سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ ملک کا کوئی گوشہ ان کے کمالات ومحاسن سے آگاہ تھا وہ جنت الحمقا کے باشندے ہیں بھلا خذف موتی ہو سکتے اور ڈھیلے کندن بن سکتے ہیں اگر قصیدے کسی انسان کو بڑا بنا سکتے تو بہادر شاہ ظفر کے متعلق ذوق نے جو قصیدے لکھے ہیں ان کے الفاظ اتنے پرشکوہ اور عظیم ہیں کہ بہادر شاہ ظفر واقعی جہاں پناہ ہوتے لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ وہ خود پناہ ڈھونڈھتے پھرتے تھے۔"

(اداریہ ۲ ردسمبر ۱۹۶۷ء)

ایوب خان نے اپنے ارد گرد اکثر وبیشتر بڑے ہی گھٹیا لوگ جمع کر لئے تھے، سچ کہا ہے نطشے نے کہ بلندیاں نہیں پستیاں خطرناک ہوتی ہیں، اُن نظموں کے یہاں نقل کرنے کی گنجائش نہیں جو اس مخلوق کی طنز وتضحیک میں ہر ہفتہ چٹان میں لکھتا رہا۔ میں نے ان تمام خاندارئی مصرعوں اور بازاری روڑوں کو آڑے ہاتھوں لیا جو ادب وسیاست کے نام پر ایوب خان کے دستر خوان نعمت پر جمع ہو گئے تھے، اس مخلوق کو جاننے کے لئے چٹان ۸ راگست ۱۹۶۶ء کا وہ سپاسنامہ ان کی صحیح تصویر ہے جو راقم الحروف کے قلم سے ان کے سیاسی خدوخال پر بھرپور طنز تھا، جس کے متعلق نواب کالاباغ نے مجھ سے کہا تھا کہ صدر سے شکایت کی گئی انہوں نے منگا کر پڑھا، لطف لیا لیکن چغل خوروں نے جو نشتر بھیجیں کیں اس سے بدمزہ ہوئے، لطف یا ستم کہ نواب کالاباغ کی روایت کے مطابق شکایت کنندوں میں دو عزیز دوست بھی تھے مگر اِن دنوں وہ صرف صدر کے وفادار تھے۔

سپاسنامہ

عالیجاہ۔ ہم اصابی خجالت نگر کاذب آباد کے اس علاقہ میں آپ کی تشریف آوری اپنے لئے عزت و افتخار کا سرمایہ سمجھتے اور اپنے درمیان آپ کو موجود پاکر محسوس کرتے ہیں کہ اپنے قدوم میمنت لزدم سے آپ نے تملق پیشہ ارکان کی اس مجلس کو سرفراز فرمایا ہے، اس میں شک نہیں کہ ہم ہر آنے والے کا خیر مقدم کرتے اور ہر جانے والے سے کنی کترا جاتے ہیں، لیکن اس میں ہمارا قصور نہیں اور نہ ہمارے خون میں کوئی خرابی ہے یہ خجالت نگر کی آب وہوا کا اثر ہے، ہماری تربیت ہی اس نہج پر ہوئی ہے کہ چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کریں اور جو ستارہ ٹوٹ رہا ہو اس کو اتنی اہمیت بھی نہ دیں جتنی مچھر یا مکھی کے خون کو دی جاتی ہے، ہم صرف کرسیوں کی پوجا کے لئے پیدا کئے گئے ہیں یہی ہمارا شرف اور یہی ہمارا وقار ہے۔

گرامی منزلت۔ اس وقت انسانوں کا یہ گروہ جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے یہ آزمودہ کار لوگ ہیں انہیں انجمن ستائش باہمی کے اعضاو جوارح ہونے کی حیثیت حاصل ہے، ان کا نصب العین خوشامد ہے، ان کا رب اقتدار ہے، ان کی کتب میں حصولِ منفعت سب سے بڑی عبادت ہے ان کے معابد پولیس کے تھانے ہیں، ان کی نمازیں چغل خوریاں ہیں، ان کا حج کوٹھیوں کا طواف ہے ان کا جہاد دوستوں کی مخبری ہے اُنہیں اس وقت تک کھانا ہضم نہیں ہوتا جب تک یہ شوشہ چھوڑ کر فساد کا الاؤ نہیں رچا لیتے، ان کی ٹکسال میں بہتان کے سکے ڈھلتے اور ان کے کارخانہ میں اتہام کا سوت اٹیرا جاتا ہے۔

جناب والا۔ ہم نے جو مخادق آپ کی خاطر یہاں جمع کی ہے وہ نوادرات روزگار میں سے ہے، یہ شاہجہانی عہد کی اشرفیاں ہیں یہ اکبری عہد کے نورتن ہیں، یہ اموی خلفا کے درہم ودینار ہیں، یہ نورجہاں کے حمام کا عطر ہیں، یہ تاج محل کے تعویذ کا پتھر ہیں، یہ فتح پور سکری کے کھنڈروں کی آب ہیں، یہ لال قلعہ کی موتی مسجد کے حوض کا پانی ہیں، یہ جامع مسجد

کی سیڑھیوں پہ بجنے والا لال کٹورہ ہیں، یہ بہادر شاہ ظفر کے گھی کبابی کا پراٹھا ہیں، یہ واجد علی شاہ کا طنبورہ ہیں، یہ زاہدہ پروین کے گلے کی گراری ہیں، یہ نور جہاں کی آواز کا رس ہیں، یہ آصف الدولہ کا تیری ہیں، یہ جہانگیر کے نشۂ شب کا خمار ہیں، یہ لارڈ کلایو کی روح کا عکس ہیں، یہ وارن ہیسٹنگز کا نالۂ جانکنی ہیں، یہ تانا ری ری کی آواز ہیں، یہ پرانے اور سیانے کن رسیا ہیں، یہ بچھیا کے باوا ہیں، یہ بندے علی خان کے سانڈ ہیں، یہ ظلم کی پکار ہیں، یہ بھیڑ چال کی یادگار ہیں، یہ خلیل خان کی فاختہ ہیں، یہ گھڑ منہا ہیں، یہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہیں، یہ آٹھوں گانٹھ کمید ہیں، یہ اقبال کے کرگس ہیں، یہ زاغ دخمہ ہیں، یہ ٹیڑھی کھیر ہیں، یہ بور کے لڈو ہیں، یہ امچور کی چٹنی ہیں، یہ محنت کی میت ہیں، یہ اچھوت کی ارتھی ہیں، یہ درزی کی سوئی ہیں، یہ حجام کا حقہ ہیں، یہ استاد کا ساز ہیں، یہ ستار کے بول ہیں یہ جماعت نہیں ریوڑ ہیں، یہ حلقہ نہیں گلا ہیں، یہ مجلس نہیں چونا ہیں، یہ محفل نہیں جھاڑ ہیں یہ طاقت نہیں بھیڑ ہیں، یہ ڈار نہیں ٹکڑی ہیں، یہ دستر نہیں ٹولی ہیں یہ کیلوں کی کہل اور پانوں کی ڈھولی ہیں ؎

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

گرامی قدر۔ آپ انہیں قرآن سناتے ہیں انہیں دیوان سناتیے، آپ انہیں اسلام سکھاتے ہیں انہیں دشنام پڑھائیے، غالب ان کے فہم کی چیز نہیں، انہیں امراؤ جان ادا پڑھائیے، اقبال ان کے بس کا روگ نہیں وہ پاکستان میں رہ گیا اور دانشوروں کی ایک کھیپ نے اس کی تکا بوٹی کر لی، آپ اقبال کو طاق نسیاں پر رکھئے اور داغ کی طرف لے جائیے، وہ غزلیں گوائیے جو منی جان گایا کرتی تھیں۔

عالیجاہ۔ اس کھیپ سے زیادہ وفادار کھیپ آپ کو کرہ ارضی کے کسی حصے میں نہیں ملے گی، جو صرف کرسی کے لئے ہو، جس کا ایمان ہی کرسی ہو، جو عاقبت کی خیر بھی کرسی ہی میں سمجھتی ہو، جس نے قومی خدمت کا نام سن رکھا ہو لیکن قومی خدمت کے "عذاب" سے دور

ہی رہی ہو، اپنے آپ کو عذاب کے حوالے کرنا مومن کی شان نہیں، فی زمانناً مومن وہی ہے
جو اللہ کے سوا ہر شے سے ڈرتا ہے۔

فضیلت مآب! ہمیں یقین ہے کہ آپ کی صدارت کے زمانہ میں انجمن ستائش باہمی دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گی، اس کا آفتاب نصف النہار پر ہوگا، اور لوگ ان تمام تجربوں سے فائدہ اٹھائیں گے جو آپ نے ہر دور میں حاصل کئے ہیں اور جن سے آپ کی شخصیت تعمیر ہوئی ہے، آپ ہمیں کسی سفر میں پیچھے نہیں پائیں گے بشرطیکہ آپ اس کرسی پر فروکش رہیں، اگر آپ کو اس کرسی سے اُتارا گیا تو پھر ہماری وفاداری بھی کانٹا بدل لے گی کیونکہ ہم لوگ بسوا اور ہوا کی فطرت لے کر پیدا ہوتے ہیں، ہم لوگ صرف خوشیوں کے ساتھی ہیں جب تک کوئی شخص اقتدار پر ہے ہم اس کے ساتھ ردیف و قافیہ کی طرح چپکے رہتے ہیں جو نہی اس کا آفتاب ڈھلتا ہے ہم اس سے آنکھیں پھیر لیتے اور اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جس طرح رات کی رانی اپنے مسافروں کو تکتی رہ جاتی ہے۔

والاقدر۔ ہم میں سے بعض لوگ تھیٹریکل کمپنی کے اداکار ہیں، انتخاب فرما لیجئے۔ اس طائفہ میں بعض لوگ لیلیٰ بننے کے اہل ہیں بعض شیریں، بعض سسی، بعض ہیر، بعض عذرا بعض سوہنی، لیکن ہم میں کوئی بھی نجد کا مجنوں نہیں، ہم صرف دودھ کے مجنوں ہیں، ہم ناٹک کے فرہاد ہیں، ہم کاغذی رانجھا ہیں، ہم وامق ہیں خیالی، ہم مہینوال ہیں لیکن چکنا گھڑا، ہمارے پاس قربانی و ایثار یا حوصلہ و استقامت کا سوال ہی نہیں، ہم بشرط ضرورت صرف زندہ باد کے نعرے لگا سکتے اور مردہ باد کی راگنیاں چھیڑ سکتے ہیں۔

جناب عالی۔ ہمیں آویزۂ گوش بنا لیجئے لیکن اس وقت تک جب تک عروس اقتدار آپ کے حبالۂ عقد میں ہے، ہمیں پان کی گلوری سمجھ کر کلے میں رکھ لیجئے اور تھوکئے نہیں لیکن جو نہی اقتدار ڈھلا، وزارت نکلی، صدارت اڑنچھو ہوئی ہم بارود کی طرح بھک سے اُڑ جائیں گے ہم بوسہ کا چٹخارہ ہیں۔

والامرتبت۔ بالآخر ہم ایک دفعہ پھر خجالت نگر میں آپ کی تشریف آوری پر ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرتے اور بہ صمیم قلب شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں مفتخر فرمایا، ہمیں عزت بخشی، ہمارے خرابہ آباد کو چار چاند لگائے، ہمارے لئے حصول منفعت کی راہیں کھولیں، ہمیں بتایا کہ فن خوشامد سے کون کون دروازوں کے قفل کھلتے ہیں، انشاء اللہ ہم اس صدری نسخہ کو ابد الآباد تک استعمال کریں گے، اور اس وقت تک استعمال کریں گے جب تک کہ آپ کا اقبال بلند ہے، وزارت آپ کی لونڈی ہے، صدارت آپ کی خانہ زاد ہے، اور چاپلوسی کے دریا کا پانی خشک نہیں ہوتا ہے،

زندہ باد بزرجمہر خان

پائندہ باد انجمن ستائش باہمی

ہم ہیں آپ کے نیاز مند

ارکان انجمن ستائش باہمی کاذب آباد، خجالت نگر

(خیالستان)

ملک میں تحریک جمہوریت کے جگر دار راہنماؤں نے اپنا سفر تیز کر دیا تھا، صدر ایوب نے جانے کس ترنگ میں احمد سعید کرمانی کو مغربی پاکستان مسلم لیگ کنونشن کا صدر بنا دیا، کوئی آبرومند آدمی اس کے ساتھ نہ تھا لیکن وہ جوش وفاداری میں اتنا پیش پیش تھا کہ چودھری محمد علی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے متعلق اونچی سُروں میں گالیگی کرنے لگا۔ پریس اس کی جیبی گھڑی اور ہاتھ کی چھڑی تھا، حقیقت یہ ہے کہ اس جیسے لوگوں کی ضرورت اپوزیشن نے قائم کی تھی ورنہ یہ لوگ بجائے خود کوئی چیز نہ تھے،

میں نے ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء کے چٹان میں لکھا کہ اپوزیشن کی بدولت سرکار کے سیاسی لنگر میں ان لوگوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے ورنہ ان کا وجود ہی شرمناک ہے یہ لوگ کار کے دروازہ پر گھنڈروں کی طرح صدا دیتے اور اپوزیشن کے فرضی خطرے پر سانڈوں

کی طرح پلتے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق اسی شمارے میں درباری گائیک کے عنوان سے اداریہ لکھا تو احمد سعید کرمانی کا ہاتھ اُدھار روزنامہ کوہستان " جو پہلے ہی سے گانیاں دے رہا تھا اتنا برہم ہوا کہ جامہ سے باہر ہوگیا وہ اداریہ یہ تھا۔

" جو شخص معاوضہ پر سیاست، ادب اور دین کے "خدمت گزار" ہیں ہمارے نزدیک، ان سے لکھنو کے فراش خانے کی وہ رنڈیاں زیادہ اچھے اخلاق کی مالک تھیں جو کسی نواب یا رئیس سے ایک دفعہ دل کے اٹکاؤ کا سامان کر لیتیں تو پھر ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جاتی تھیں، انہیں کوئی تحریف یا ترغیب توڑ نہیں سکتی تھی۔

جو لوگ اس وقت سیاست و صحافت کے راج محل میں فروکش ہیں ان کی مثال مٹیا محل کے جانعالم پیا کی سی ہے جس نے اپنا دماغ ارباب نشاط کے حوالے کر دیا تھا اور ممتوعات کے لب ہائے شیریں پر اپنے کان لگا رکھے تھے۔ کاش ہم اپنے ان عاجزانہ الفاظ کو رسا کرنے کی مقدرت رکھتے کہ جن اخبارات کو بڑے غلام علی کے ساز کی حیثیت حاصل ہے وہ ناکارہ طنبورے ہیں اور صرف درباری گا سکتے ہیں، ان کا "سب اچھا" غلط ہے، ان میں جو کچھ درج ہوتا ہے اس کا اکثر حصہ ملک و قوم کی تعمیر کے منافی ہے، ان کے مقامی جلسوں کی رودادیں غلط ہیں، ان کے دل و زبان میں اختلاف ہے، یہ اپنے صفحے بڑھا کر معاشرے میں جرائم بڑھا رہے ہیں، خدا کے لئے ان کی رپورٹوں اور خبروں پر اعتبار نہ کریں، ان کے اداریے کوئی نہیں پڑھتا، یہ ان تھیٹروں کی طرح ہیں جن میں عشق جہانگیر کا ڈرامہ کھیلتے وقت تنبولی جہانگیر اور بیرنی نور جہاں بن جاتے ہیں، اور جب میک اپ اترتا ہے تو اپنی اصل ہیئت میں آجاتے ہیں، خدا کے لئے ان پر بھروسہ نہ کیجئے یہ قوم

کو زہر بلا رہے ہے اور خود ملا مبارک کے فرزند بنے ہوتے ہیں۔

——— ابھی صدارتی انتخاب میں دو سال باقی تھے کہ خوشامدیوں کی اس نسل نے جو کنونشن مسلم لیگ کے مسافر خانے میں جمع تھی صدر ایوب کی منقبت چھیڑ دی، میں نے ۲۹ جنوری کے اداریے میں "صدارتی بسنت" کے عنوان سے ان کی خبر لی اور لکھا:

صدر ایوب بنیادی جمہوریت کے نظام سے محبت کرتے اور اس کو ملک کے استحکام کا نوشتہ سمجھتے ہیں تو انہیں حق پہنچتا ہے کیونکہ ہر مصنف اپنی تصنیف کا گرویدہ ہوتا ہے، اصل معاملہ ان لوگوں کا ہے جو کسی بھی اصول پر نہیں لیکن ہر اصول سے چمٹ جاتے ہیں، بشرطیکہ اس اصول کے ساتھ طاقت ہو اور طاقت بھی حکومت کی، ہم نے ان گنہگار آنکھوں سے اس طائفے کو دیکھا ہے کہ خان لیاقت علی خان نے ٹھکہ دکھایا تو یہ لوگ بوسہ دینے کے لئے ان کے آستانہ پر حاضر ہو گئے، خواجہ ناظم الدین کے زمانہ میں ان کی کفش برداری کرتے رہے، وہ غلام محمد کے ہاتھوں پٹ گئے تو یہ انہیں ملاعیاں سنانے لگے غلام محمد کو محافظ ملت کا خطاب دیا، حالانکہ وہ خود مر رہے تھے وہ مر گئے تو انہیں توفیق نہ ہوئی کہ ان کی میت گوروں کے قبرستان کے بجائے مسلمانوں کے قبرستان میں دفنا دیں، اسکندر میرزا کے سامنے یہی لوگ دست بستہ کھڑے ہوتے اور پدر سوختہ قسم کی گالیاں سنتے تھے، لیکن وہ چلا گیا تو ان لوگوں نے اس پر تبرّیٰ شروع کیا۔

جس عہد میں اس ذہنیت کے لوگ اقتدار کے حاشیہ میں ہوں اس عہد کی تاریخ کے ورق زیادہ تر سیاہ ہی رہتے ہیں، اور اس سے جو مزاج بنتا ہے اس سے بلاشبہ قومی مزاج کی نفی ہوتی ہے، صدارتی انتخاب میں دو سال پڑے ہیں لیکن اس طائفہ کے افراد نے ابھی سے چہکنا شروع کر دیا

ہے۔ چنانچہ پچھلے کئی ماہ سے حاضر جناب ادارے اور پیش کار افراد سہ بارہ صدارت کے لئے صدر سے درخواست کر رہے ہیں بے ادبی معاف یہ صدر پر زور نہیں دے رہے ان کی نگاہ میں رہنا چاہتے ہیں، بنیادی جمہوریت کے اس نظام میں کوئی شخص صدر ایوب کے سوا منتخب ہی نہیں ہو سکتا اور نہ کنونشن لیگ کے پاس کوئی شخصیت ہے بلکہ صدر ایوب کی شخصیت کے سوا اس کے پاس کوئی شخصیت ہی نہیں،

بنیادی جمہوریت کے درخت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا پھل حزب اختلاف کی آب و ہوا میں پکتا ہی نہیں اقتدار ہی سے یہ درخت پھلا پھولا ہے، اقتدار ہی اس سے متمتع ہو سکتا ہے، صدر اپنی تقاریر میں بار بار زور دیتے ہیں کہ عوام کی خدمت کرو، بے غرض رہو، ملک کو خوشحال بناؤ لیکن جو لوگ ان کے مخاطب ہیں وہ گویا ان الفاظ سے آشنا ہی نہیں، ان کے فکر و عمل کی سب سے بڑی معراج یہ ہے کہ انتخابی بسنت منائیں اور بسنت میں ابھی مدت پڑی ہے لیکن انہوں نے ابھی سے ڈور لگانے اور تکل بڑھانے کا نقشہ باندھ لیا ہے اور جی میں خوش ہیں کہ ان کے جیب و دامان کی بہار کے دن آرہے ہیں؛؛

—— میں نے کبھی اپنی سیاسی زندگی کے سوانح شائع کئے تو وہ میری کہانی سے زیادہ پاکستان کی سیاسی کہانی ہوگی، ایوب خان اپنے گرد و پیش خود فروشوں کی جماعت جمع نہ کرتے اور وہ لوگ ان کے مشیر نہ ہوتے جو انہیں ہر نوعی وفاداری کا یقین دلا کر اپنے مصالح و مقاصد کی پشتیبانی کر رہے تھے تو ممکن ہے ان کا ستارہ جلد پھیکا نہ پڑتا۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے وزیروں اور افسروں کو ایک دوسرے سے بدظن کر کے رکھتے تھے نہ انہیں قریب لاتے وقت تذبذب محسوس کرتے اور نہ انہیں نکالتے وقت ہچکچاتے

تھے۔ وہ ہر آدمی کو گنے کی طرح چوس کے پھینک دیتے تھے، (الا ماشاء اللہ)

ہم بھٹو سے کچھ زیادہ واقف نہ تھے وہ طلوع ہی ایوان حکومت سے ہوئے تھے، انہیں نکالا گیا تو ہم نے انہیں ایوب کے خلاف ہاتھوں ہاتھ لیا، ایوب خان پہلے تو بھٹو کو ڈراتے رہے جب وہ سامنے آگئے تو پھر بعض لوگوں کو نان نفقہ مہیا کیا کہ ان کے خلاف محاذ بنائیں، ایسے لوگ اپنا کوئی سیاسی ماضی نہ رکھتے تھے ان کا پیشہ ہی یہ تھا کہ حکومت کی منشا پر اس قسم کے فرائض انجام دیں، بھٹو کے خلاف سب سے پہلے یہ فرض کوثر نیازی نے انجام دیا، ان کی ایک تقریر میں مین میخ نکالی، توہین رسالت کا الزام لگایا، پہلے خود بیان دیا پھر مفتی محمد حسن علیہ الرحمۃ کے فرزند مولانا عبید اللہ سے تائید کرائی، ان کے علاوہ مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا خلیل احمد قادری، سید نصیر حسین اجتہادی سے بیان دلوائے، مساجد میں جمعہ کے دن مختلف علماء سے تقریریں کروائیں، چٹان نے کوثر نیازی کو اس سختی سے ٹوکا کہ وہ اس کے سرکاری قرب میں مزید اضافہ کا باعث ہو گیا، کوثر نیازی نے اپنے ہفتگی میں احقر کو اتنی فحش گالیاں دیں کہ اس کی عاقبت کا توشہ ہو گیا، گورنر موسیٰ نے اس کے لئے گورنر ہاؤس کا دروازہ کھول دیا، وہ تقریباً ہر روز تازہ خبریں لے کر حاضر ہوتا، اور کورنش بجالاتا ۱۹۶۹ء کے الیکشن میں چٹان کے جن دو شماروں کو کوثر نیازی اس کا ہفتگی اور پیپلز پارٹی کے ہمنوا پیش کرتے رہے کہ بھٹو کی حمایت میں تب یہ لکھا تھا وہ چھپا گئے تھے کہ جو کچھ لکھا کب لکھا؟ کیوں لکھا؟ کس کے جواب میں لکھا؟ وہ کس کا محاسبہ تھا؟ اور تب حالات کیا تھے [1]

——— میں نے قادیانی اُمت کا مذہباً کبھی جائزہ نہیں لیا، میں سمجھتا ہوں قادیانیوں کا مذہبی محاسبہ علماء کا فرض ہے اور وہ بطریق احسن اپنا فرض انجام دے

---

[1] ملاحظہ ہو چٹان ۵ فروری، ۱۲ فروری ۱۹۶۸ء

رہے ہیں، میں قادیانیوں کو برطانوی استعمار کی یادگار اور عالمی صہیونیت کی عجمی شاخ سمجھتا ہوں، وہ مسلمانوں کی وحدت میں نقب لگا کر استعماری آلہ کار کی حیثیت سے اپنی ریاست قائم کرنے کے خواہاں ہیں، میرے نزدیک اُن کا جماعتی نصب العین ایک عجمی اسرائیل کا قیام ہے اس سلسلہ میں میرا نقطہ نگاہ وہی ہے جو چودھری افضل حق مرحوم کا تھا اور جو کچھ علامہ اقبال نے لکھا وہ حرف آخر ہے، پاکستان بن جانے سے پہلے بھی میں نے میرزائیوں کے سیاسی محاسبہ پر زور دیا، پاکستان بن جانے کے بعد بھی میں نے یہی لکھا اور ہمیشہ ان کے مقاصد وعزائم کا تجزیہ کرتا رہا، ایوب خان کے عہد میں انہیں کچھ پناہ سی حاصل ہو گئی، لیکن بظاہر وہ ان کے حق میں نہ تھے، نواب کالاباغ تو انہیں پاکستان کی آئندہ سیاسی طاقت سمجھتے ہوئے نجی محفلوں میں ان پر سخت تنقید کرتے تھے۔ ایوب خان کے عہد میں مجھے کئی دفعہ میرزائیوں کے خلاف لکھنے پر وارننگ دی گئی، کبھی کسی ہوم سکریٹری نے بلوا بھیجا کبھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے، میں جو کچھ لکھتا تھا اس پر اصرار کرتا اور اعادہ کرتا حکومت وارننگ دے کر چپ ہو رہتی، لیکن کالاباغ کی سبکدوشی کے بعد قادیانی خلاف معمول کچھ زیادہ ہی پاؤں پھیلانے لگے۔

میں نے ان کے مخفی خطرات کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے ان کا سیاسی تجزیہ اپنے قلم کا معمول بنا لیا، تیئس اپریل ۱۹۶۷ء کو میں نے ربوہ سے قریب چنیوٹ میں ایک زبردست تقریر کی اس تقریر میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا کہ قادیانی امت کی تاریخ اور اس سے پیدا شدہ سیاست کیا ہے؟ میں نے جو نکات بیان کئے ان کا خلاصہ یہ تھا۔

۱ - میرزائیت کی تاریخ سیاسی دینیات کی تاریخ ہے۔

۲ - یہ بحث ہی غلط ہے کہ میرزا غلام احمد نبی تھے یا نہیں؟ اس طرح کی بحث بجائے خود حضورؐ کی اہانت کا باعث ہوتی اور سوء ادب تک چلی جاتی ہے۔

۳ - قرآن و حدیث میں ظلی و بروزی نبوت کے الفاظ ہی نہیں اور نہ ان کے ہم معنی مترادفات ہیں ایسے کسی لفظ کی عربی لغت نشاندہی نہیں کرتا،

۴ - میرزائیت کی اصل بنیاد دین نہیں سیاست ہے۔

۵ - سلطان ٹیپو کی شہادت (۱۷۹۹ء) سے لے کر بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری (۱۸۵۷ء) تک ـــ اسلامی مزاج کی استعمار شکن ذہنیت کو ملحوظ رکھیں تو معلوم ہوگا کہ میرزا صاحب انگریزوں کی ہر نوعی وفاداری اور جہاد کی تنسیخ کے لئے استعمار کی طرف سے مبعوث کیے گئے تھے۔

۶ - میرزا صاحب نے برطانوی شہنشاہیت کی پشت پناہی کے لئے الہامی بنیاد، اور ربّانی سند فراہم کی۔

۷ - ان کی نبوّت، سلطان ٹیپو، سراج الدولہ اور بہادر شاہ ظفر کے محاربات کی بیخ کنی کا استعماری نسخہ تھا اس کے علاوہ ان کا "ظہور" سید احمد شہید کی تحریک، جنگ امبیلہ کے نتائج و اثرات، انبالہ، پٹنہ، راج محل اور مالوہ میں علماء کے مقدمات ان کے شوق جہاد و شہادت اور سرحدی علاقوں کی انگریز دشمنی کا ایک توڑ تھا جو انگریزوں نے دوررس نتائج کے تحت تلاش کیا تھا۔

۸ - میرزا صاحب نے مسلمان قوم کو برطانوی فاتحوں سے ہٹا کر برطانوی پادریوں سے اُلجھا دیا۔

۹ - جہاد کی تنسیخ پر مناظرہ کی نیو رکھی۔

۱۰ - وہ مسلمانوں کی مذہبی وحدت میں نہیں سیاسی وحدت میں صرف اس لئے شریک رہنا چاہتے ہیں کہ اس طرح انہیں طاقت حاصل کرنے اور مقاصد پروان چڑھانے میں کوئی سی دقت مانع نہیں ہوتی۔

۱۱ - پاکستان سے پہلے وہ برطانوی استعمار کے آلہ کار تھے اب وہ یہودیت کی طرح

معاشی طاقت کے بل پر حکومت کے فعال اداروں میں سیل بنا کر بین الاقوامی استعمار کی معاونت سے پاکستان پر حکمران ہونا چاہتے ہیں۔

۱۲۔ کشمیر سے متعلق انہیں جو "بے چینی" ہے اسلاوہ اس مقصد تک پہنچنے کی بوقلمونیوں کا ایک حصہ ہے۔

یہ تقریر خاصی طویل تھی کچھ نوجوانوں نے مارچ ۱۹۶۸ء میں "میرزائیل" کے نام سے یہ تقریر کتابچہ کی شکل میں شائع کی۔ کتابچہ شائع کیا تو میرزائی جو پہلے ہی اپنے جرائد کی معرفت مجھ پر برس رہے تھے سب دشنام پہ اتر آئے، ہفتہ وار "لاہور" عقیدۃً قادیانی تھا اس نے میرے خلاف مغلظات واتہامات کا ڈھیر لگا دیا، کوثر نیازی ٹھیک انہی دنوں اپنے ہفتگی میں یہی فرض انجام دے رہا تھا گویا دونو میرے خلاف متحد تھے ——— میں نے جب بھی قادیانی اُمت کا سیاسی محاسبہ کیا یا اس پر کچھ لکھا قادیانی میرے خلاف گالی گلوچ پر تُل گئے، حالانکہ جو میں کہہ رہا تھا جواب اُس کا ہونا چاہیے تھا۔ ان کی گالیاں ختم ہوگئیں تو ہوم ڈیپارٹمنٹ نے سنسر عائد کر دیا یا وارننگ بھجوا دی۔

ایک دن مکتبہ فرینکلن کے انچارج مولانا حامد علی خان نے مجھے فون کیا کہ ہفتہ وار "لاہور" قادیانی ہونے کے باعث علامہ اقبال سے متعلق اناپ شناپ لکھ رہا ہے، تمہارے سوا اور کوئی نہیں جو اس کا نوٹس لے، کچھ کرو، "لاہور" نے یہ اس وقت لکھنا شروع کیا جب حکومت نے قادیانی اُمت کے خلاف لکھنا روک دیا، میں نے حامد علی خاں سے کہا علامہ اقبال کی مدافعت صرف میرا ہی فرض نہیں ان کے اعزہ ہیں، مرکزیہ مجلس اقبال ہے، لاہور میں بزم اقبال ہے، کراچی میں اقبال اکیڈیمی ہے ان کے علاوہ بیسیوں لوگ اقبال کے نام پر سرکار سے رزق پا رہے ہیں انہیں کہیے، کیا میں ہی رہ گیا ہوں کہ ہر کسی سے لڑتا رہوں۔

حامد علی خاں کہنے لگے ——— جس کا کام اسی کو ساجھے،

میں نے کہا تو گویا میرا کام لڑنا ہے، آپ مولانا ظفر علی خاں کے بھائی ہیں، پروفیسر

حمید احمد خان بھی آپ کے بھائی ہیں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں مسند اقبال پر ایک قادیانی کو لا بٹھایا ہے ـــــ آپ کے علم میں ہوگا؟

حامد علی خان نے کہا ـــــ جو کام آپ کا ہے وہ آپ ہی سے کہا جائے گا "لاہور" علامہ اقبال پر بے دریغ رکیک حملہ کر رہا ہے آپ اس کی خبر لیں۔

میں نے خبر لی تو مدیر لاہور کے قلم سے وہ کچھ سننا پڑا کہ علامہ اقبال تو محفوظ ہو گئے میں کئی ہفتے گالی کھاتا رہا، میرے ساتھ کسے ہمدردی ہو سکتی تھی؟ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ قادیانی اُمت کے افراد جب بھی اقبال کے افکار و سوانح پر حملہ آور ہوئے ہیں یا قادیانیت کے متعلق اقبال کے نظریات کا مسئلہ چھڑا ہے ملک بھر کے مستند اقبالیے چپ رہے ہیں،

یکم اپریل ۱۹۶۸ء کے شمارے تک میں نے چٹان میں قادیانی اُمت کا تعاقب شدومد سے جاری رکھا، یکم اپریل کو مسٹر ایم ایم عثمانی ڈپٹی سکریٹری ہوم کے دستخطوں سے تمام ایڈیٹروں پرنٹروں اور پبلشروں کے نام گورنر کی طرف سے ڈی پی آر کے تحت حکم نامہ جاری کیا گیا کہ آئندہ تین ماہ تک سنسر کرائے بغیر کوئی ایسی تحریر نہ چھاپی جائے جو کسی مسلمان فرقہ کے عقائد و افکار اور الہام و اعمال سے متعلق ہو، یہ قادیانی اُمت کی حمایت کا کھلم کھلا اظہار تھا اور الہام یا پیش گوئی (PROPHECIES) کا لفظ پہلی دفعہ اس آرڈر میں شامل کیا گیا تھا میرا خیال ہے یہ کسی میرزائی نے مرتب کیا تھا اور اس نے ایوب خان کے خلاف برگشتگی کی فضا کو اور مکدر کرنا چاہا تھا، یہ بڑا غلط حکمنامہ تھا ـــــ حکمنامہ ایس او۔ (پی یو بی) ۶۷-۲۳-۱

مارچ کے مہینہ ہی میں گورنر موسیٰ نے ایک بیان میں کہا کہ وہ لوگ جو یونٹ کے خلاف بولتے چالتے ہیں ان کے خلاف طاقت استعمال کی جائے گی، آخری ایام میں صدر اور گورنر کچھ اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اندر سے ہلے ہوئے ہیں، میں نے ۱۱ اپریل کے افتتاحیے میں لکھا کہ گورنر موسیٰ کو یہ زبان استعمال نہیں

کرنی چاہیئے ہم انہیں کبھی طاقت کے استعمال کا مشورہ نہیں دے سکتے یہ اصولاً غلط ہے طاقت وہاں استعمال ہونی چاہیئے جہاں دشمن ہو یا ففتھ کالسٹ، اپنوں پر طاقت استعمال کرنے کی بہ نسبت قومی وسیاسی سطح پر افہام وتفہیم زیادہ مؤثر ہتھیار ہیں، افسوس صدر ایوب کی طاقت کا چوتھا ستون یعنی کنونشن مسلم لیگ اور اس کے عہدیدار اس معاملہ میں سخت ناکارہ عنصر ہیں۔

ان دنوں طبیعت کی حاضری نے نظموں کو اتنا شوخ کر دیا تھا کہ مرکز وصوبہ کے سیاسی و میرزائی حکام سخت پریشان تھے، گورنر نے ۲۰ مارچ کو گیارہ بجے دن ملتان میں بنیادی جمہوریتوں کے کنونشن میں جو ایڈریس پڑھا اس میں چٹان کے اداریے مجریہ ۱۱ مارچ کو زیر بحث لایا گیا، گورنر صاحب نے فرمایا۔

"چند روز ہوئے مجھے ایک ہفتہ وار اخبار پڑھنے کا اتفاق ہوا، جس میں میری ان تقریروں پر تبصرہ کیا گیا تھا جو میں نے حال ہی میں جنوبی علاقے کے دوران کی تھیں۔ تبصرہ کرنے والے صاحب نے ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی باتیں پڑھ کر ان کے اصل مطلب تک پہنچنا کوئی مشکل نہیں۔ انہوں نے میرے اس خیال سے تو اتفاق کیا ہے کہ وحدت مغربی پاکستان کو ختم کرنا نقصان دہ ہوگا اور جو لوگ یہ کوشش کر رہے ان کا احتساب ہونا ضروری ہے لیکن وہ یہ بات نہیں مانتے کہ ایسے عناصر کے خلاف کوئی سخت کاروائی کی جانی چاہیئے۔ ان کے خیال میں سختی صرف دشمن کے ساتھ ہونی چاہیئے یا غداروں کے ساتھ اور اپنے لوگوں کے ساتھ طاقت کا استعمال درست نہیں۔ میرا اپنا بھی یہی خیال ہے لیکن اس ضمن میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے عوام اور ہماری فوجوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی بھی بیرونی حملہ آور کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتے

ہیں۔ یعنی ملک کے خارجی دشمن کا مقابلہ۔ تبصرہ کرنے والے صاحب نے (یعنی ایڈیٹر چٹان) نے خود متعدد نظمیں لکھیں جن میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران عوام اور مسلح افواج کی بے حد تعریف کی گئی۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ دشمن صرف باہر ہی سے نہیں آتا، جو لوگ ملک کے حصے بخرے کرنا چاہتے ہیں وہ غداروں سے زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ وہ ملک کے اندر بیٹھ کر ملک کی سالمیت کے خلاف کام کرتے ہیں، اندرونی خلفشار بعض دفعہ بیرونی حملے سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے، اس اخبار نے یہ تو مانا ہے کہ جو بھی ملک کا دشمن ہو اس کی سرکوبی ہونی چاہیئے، لیکن اس کے تبصرے سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ یونٹ تو بہرحال قائم رہنا چاہیئے لیکن جو لوگ اسے توڑنے کے درپے ہیں انہیں کچھ نہ کہا جائے۔ یہ منطق بھی خوب ہے۔ میں کہتا ہوں آپ اس اخبار کے ایڈیٹر سے پوچھیں کہ بندۂ خدا ملک کے ٹکڑے کرنے والوں کے متعلق آپ کی حتمی رائے کیا ہے؟ آپ کے خیال میں ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے۔ کچھ پتہ تو چلے کہ یہ صاحب ہیں کس طرف۔ وہ غالباً یہ چاہتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، تو یہ نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک ہمارے عوام کا تعلق ہے ہم نے صاف الفاظ میں سب کو بتا دیا ہے کہ انتظامیہ کا کام ان کی خدمت کرنا ہے نہ کہ ان کو کچلنا جیسا کہ اس اخبار میں الزام لگایا گیا ہے، یہ بات میں نے اس اخبار کے ایڈیٹر سے بھی کہی تھی میرا خیال ہے کہ انتظامیہ اس خدمت کو انجام دینے کی پوری کوشش کر رہی ہے، کوئی ذی ہوش اور ایماندار شخص اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا۔ میں یہ پھر کہوں گا اور بار بار کہوں گا کہ ہر حالت میں انتظامیہ کا اولین

فرض یہی ہے کہ وہ پاکستان کی اور پاکستان کے عوام کی خدمت کرے۔
حسب معمول اس ہفتہ وار اخبار نے یہ بھی کہا ہے کہ صدر کے مشیر اور گورنروں کے مشیر انہیں صحیح مشورے نہیں دیتے (ہمارے الفاظ یہ تھے "ہم نہیں کہہ سکتے کہ صدر مملکت اور گورنر صاحب کو ان کے مشیر کیا مشورہ دیتے ہیں" چٹان ۱۱ مارچ اداریہ) ایڈیٹر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ انہیں یہ بات، کیسے پتہ چلی، آپ کو انہیں پوچھنا چاہیئے کہ انہیں یہ الہام کیونکر ہوا اور کیسے ہوا کہ مشورے ملکی مفاد کے خلاف دیئے جا رہے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو لوگ بھی ہمارے مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی حب الوطنی پر آج تک کسی کو شک کرنے کا گمان بھی نہیں ہوا، میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے مشوروں کے پیچھے سوائے قومی تقاضوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ وُہ پُر عزم اور مخلص کارکن ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے کام میں مانے ہوئے ماہر ہیں، ان کے سامنے سوائے پاکستان کے مفاد اور عوام کی بہبودی کے اور کوئی نصب العین نہیں۔ ہم لوگ دن رات ان کے ساتھ کام کرتے ہیں اور انہیں اچھی طرح سے جانتے ہیں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے ملک اور عوام کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہو۔ اس لئے ان پر کسی قسم کی الزام تراشی بہتان ہی نہیں بلکہ ملک کے لئے نقصان دہ بھی ہے کیونکہ اس طرح خواہ مخواہ عوام کے دلوں میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، میرا خیال ہے اس قسم کی الزام تراشی صرف حکومت کی بے جا تنقید کے سلسلے میں کی جاتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اپنی سیاست کے لئے سرکاری مشیروں اور افسروں کو نشانہ بنانا اور انہیں قربانی کا بکرا سمجھنا انتہائی بزدلی ہے۔"

گورنر نے اپنی اس تقریر میں بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو اپوزیشن کے خلاف بھڑکایا، کہ وہ ان لوگوں کی کیوں تادیب نہیں کرتے؟ لیکن وہ جس غیرت کو اپیل کر رہے تھے وہ کنونشن لیگ کی جماعتی سیرت میں نہ تھی، احمد سعید کرمانی وزارت کے نشہ میں چور تھا اس کے سر پہ صوبائی کنونشن لیگ کی صدارتی کلغی بھی ٹانک دی گئی تھی، اپنی مصاحبت کو پروان چڑھانے اور صدر ایوب پر یہ ظاہر کرنے کہ وہ لاہور میں کوئی چیز ضرور ہے، بن پیچھلے پتنگ کی طرح اُڑ رہا تھا اس نے اوائل عمر کے چند آشناؤں کو یوم اقبال کی سالانہ تقریب پر جو حسب معمول پنجاب یونیورسٹی ہال میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر وحیدالدین کی صدارت میں ہو رہی تھی میرے خلاف ہنگامہ برپا کرنے کے لئے تیار کیا، میں ۱۹۵۰ء سے مرکزیہ مجلس اقبال کا سکریٹری ہوں، ہر سال اسٹیج کے فرائض میری ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، اس دفعہ خواہش کر کے آغا محمد علی ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس سی آئی ڈی اور ان کے اسسٹنٹ مسٹر عبدالقیوم پی ایس پی بھی اجلاس میں موجود تھے، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے بعض جج ہمیشہ کی طرح فروکش تھے ان کے علاوہ کئی محکموں کے افسران اعلیٰ اور بعض دوسرے اہلکار بھی حسب معمول حاضر تھے آج تک کبھی کسی نے تقریب میں خلل ڈالنے یا کوئی ہنگامہ کرنے کی جسارت نہ کی تھی لیکن کرمانی نے اپنے آشناؤں کی معرفت کنونشن لیگ کے چند غنڈے جو پولیس کے طبعزاد ٹاؤٹ تھے اس خدمت پر مامور کئے، وہ کئی ہزار کے مجمع میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ درجن تھے اور ہال کے آخر میں ایک دوسرے سے چپک کر کھڑے تھے، جسٹس سید محبوب مرشد بھی ایوب خان کی ناراضی کا شکار ہو گئے اور تقریب میں موجود تھے، کچھ نعرے تو ان کے خلاف لگائے گئے باقی میرے خلاف، کہ ہم اسے نہیں چاہتے یہ مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف رہا ہے، گویا یہ انکشاف پاکستان بن جانے کے بیس سال بعد ان برخورداروں پر ہوا تھا اس تفریح کو ٹیکسیوں میں بٹھا کر کرمانی کا ایک سالا لایا تھا اور باہر نتیجہ کے انتظار میں تھا، زیادہ سے زیادہ یہ ہنگامہ دس منٹ رہا اس کے بعد مؤذن کرمانی کی یہ فوج

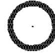
اس طرح فقرہ ہوئی کہ اس سے پہلے سیاسی ہاتھوں سے ایسی پٹائی دیکھی نہ سُنی تھی میں نے چیف جسٹس کی موجودگی میں کرمانی کو للکارا کہ وہ سامنے آئے، ایوب خان کے کھونٹے پر ناچنے سے کچھ نہیں ملے گا اور جب اس کے طفلانِ نشت خوُپٹ کے بھاگ رہے تھے تو میں نے کرمانی کی دل جوئی کے لئے کہا کہ

"جاؤ اور اپنے میر تقی میر خان بہادر شیخ عنایت اللہ قالین والے کی تربت پر قوالی کرو"

یہ ایک ایسی چوٹ تھی کہ کرمانی کے لئے ہضم کرنا مشکل تھا، میں نے کرمانی کو اب تک اس طرح کبھی چھپڑانہ للکارا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی ان حرکتوں سے جو مسلسل دیکھنے اور سننے میں آرہی تھیں میں نے مجمع عام میں اُسے بے نقاب کیا، میں اس وقت اس قدر غصہ میں تھا کہ ڈاکٹر جاوید اقبال نہ روکتے تو شاید وہ باتیں کہہ دیتا جو تخلیوں میں تو زبان پر آجاتی ہیں لیکن مجمعوں میں نہیں۔ ایک ایسا شخص جو میرے نزدیک معزز تھا نہ مکرم، اس زعم میں کہ وہ شاہ کا مصاحب ہو گیا ہے میرے خلاف اس قسم کے خرافاتی مظاہرے کی جرأت کرے تو میرا فرض تھا اس کا پوسٹ مارٹم کروں۔ اس میں وزیر ہو کر بھی متانت اور سنجیدگی نہ آئی تھی۔

اتنے بڑے بڑے آدمیوں کی موجودگی میں کرمانی کی چہرہ کشائی نے اس کو پریشان کر دیا وہ اسی دن راولپنڈی پہنچا، وہاں جس سے بھی ملنا تھا اس کو ملا اور چٹان پر اس عتاب کا فیصلہ لے کر آگیا۔ یہ تھا اس پس منظر کا "منطقی" نتیجہ۔ کرمانی پریس کا وزیر تھا اور اخبارات سرکاری نرغہ میں تھے وہ میرے حق میں کیا لکھتے تاہم ورکنگ جرنلسٹوں کی انجمن پی یو جے نے کرمانی کی منت سماجت کے باوجود کہ اُس کے طرفدار لوگ بھی اس میں شامل تھے حکومت کے اقدام کی مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ چٹان کے خلاف جو کارروائی ہوئی ہے کالعدم کی جائے مگر اپنے خلاف قراردادوں پر حکومتیں کم ہی توجہ دیتی ہیں۔

میں نے انتہائی حقارت سے احکام وصول کئے اور پوری جرأت سے حکومت کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔



نظربندی سے پہلے

۲۷ اپریل کو چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ کیا گیا اور پریس ضبط کر کے سر بمہر کر دیا گیا یہ ساری کارروائی دو گھنٹہ میں ہو گئی، چھ بجے شام ضیا جیلانی ڈی ایس پی وارد ہوتے اور آٹھ بجے یا اس سے بھی پہلے اپنے فرائض انجام دے کر واپس چلے گئے، تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر پورے شہر بلکہ ملک بھر میں نشر ہو گئی، ٹرنک کال شروع ہو گئے دو یا گھنٹہ میں کوئی ڈیڑھ سو تار آ گئے، ہسپتال فیملی وارڈ میں دوستوں کا تانتا بندھ گیا، سب سے پہلے میاں محمود علی قصوری تشریف لائے اور منسوخی و ضبطی کے آرڈر ساتھ لے گئے، پھر خواجہ عبدالرحیم بار ایٹ لا، مجید نظامی، ڈاکٹر مبشر حسن وغیرہ پہنچے، ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ اور شیخ مقبول احمد باٹا ایڈووکیٹ بھی آ گئے۔ اگلی صبح مولانا تاج محمود، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا لال حسین اختر وغیرہم لائل پور اور ملتان سے تشریف لائے، میو ہسپتال فیملی وارڈ کمرہ نمبر ۲۶ دوستوں، ساتھیوں اور ہمدردوں سے بھر گیا، اور یہ ایک آدھ دن کا ذکر نہیں میں ضبطی کے بعد کوئی تین ہفتے وہاں رہا، ہر روز دوست آتے اور حکومت کے نئے تکے اقدام پر افسوس کرتے، میاں ممتاز دولتانہ نے دو صفحے کا ایک خط لکھا جس میں حکومت کے اقدام کی شدید مذمت کی انہوں نے حکومت کے فیصلے کو وحشیانہ قرار دیتے ہوئے آمریت کی بزدلی پر محمول کیا، چٹان کی خدمات کو نہایت پر شکوہ الفاظ میں سراہا اور لکھا کہ وہ اس وقت بیمار

ہیں ورنہ فوراً آتے، اس اقدام سے ان کی طبیعت آگ بھبھوکا ہوگئی ہے، مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے کراچی سے تار دیا اور لکھا کہ حکومت کا یہ اقدام اس کے تابوت کی میخ ہے میاں ممتاز دولتانہ اور ذوالفقار علی بھٹو کے علاوہ کئی راہنماؤں مثلاً مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، نوابزادہ نصراللہ خان، مسٹر سی آر اسلم اور میاں محمود علی قصوری نے بھی حکومت کے اقدام کی مذمت میں بیان جاری کئے، چٹان اور ایڈیٹر چٹان کی تحسین کی حکومت نے ان بیانات کو چھپنے نہ دیا، اس وقت پریس پابہ زنجیر تھا، ایجنسیاں بھی حکومت کے اشارہ ابرو پر ناچتی تھیں۔

میاں محمود علی قصوری کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ حکمنامہ کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا جائے اور اس کو مرافعہ کی بنیاد بنایا جائے تو یہ احکام موقوف ہوجائیں گے۔ بالفاظ دیگر وہ میرزائی مسئلہ کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے، میرا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ جس مسئلہ پر حکومت نے اقدام کیا ہے اس کو مرافعہ کی بنیاد بنایا جائے، میاں صاحب قادیانی مسئلہ کو سرے سے چھونا ہی نہیں چاہتے تھے وہ آج سے نہیں ہمیشہ سے قادیانی مسئلہ کو غلط سمجھتے اور ختم نبوت کے باب میں علمائے امت اور عامۃ المسلمین کے نقطۂ نگاہ سے اختلاف رکھتے ہیں میاں صاحب کا ایک اور خیال تھا کہ قادیانی جماعت کے متعلق ہائی کورٹ یہ فیصلہ کبھی نہیں دے گا کہ وہ مسلمانوں کے زمرہ سے خارج ہیں، خواہ آپ کچھ ہی کرلیں۔ دوسرے اس طرح مقدمہ طول کھینچے گا، تیسرے جو چیز وہ خود نہیں مانتے اس کی وکالت کیونکر کرسکتے ہیں؟ خواجہ عبدالرحیم اور ڈاکٹر جاوید اقبال کی رائے بھی یہی تھی کہ مرافعہ کو حکمنامہ کی تنسیخ تک رکھا جائے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ مسئلہ چٹان کی ضبطی کا نہیں عقیدہ کا بھی ہے حکومت کو یہ حق ہی نہیں پہنچتا کہ وہ مذہبی معاملات میں اس طرح مداخلت کرے، اور ایک جماعت جس کو مسلمانوں کا کوئی سا فرقہ ملت کا جزو نہیں سمجھتا اس کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے غلط استعمال سے مسلمانوں کا جزو بنایا جائے، مولانا تاج محمود اور مولانا محمد علی جالندھری

میرے نقطہ نگاہ سے متفق تھے بلکہ انہوں نے حکومت کے اس اقدام کی مذمت کو تحریک بنانے کا فیصلہ کیا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ ہائی کورٹ کے ریکارڈ پر وہ تمام چیزیں آجائیں جو ہائی کورٹ سے باہر سارے ملک کے سامنے ہیں، یہ گفتگو میری بیماری کے باوجود جاری تھی وہ دوست جنہیں قادیانی مسئلہ سے بوجوہ دلچسپی نہ تھی اس نکتے کو ترک کر دینے کے حق میں تھے اور قانون کے غلط استعمال پر ہائی کورٹ سے رجوع کرنے کے خواہاں تھے، اور وہ دوست جو اس مسئلہ کو اسلام و پاکستان کا بنیادی مسئلہ سمجھتے تھے مصر تھے کہ اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ اس مسئلہ کی حقیقت ہر کہ ومہ کو معلوم ہو۔ مولانا تاج محمود کی روایت کے مطابق ڈاکٹر احمد حسن کمال (جمعیت علمائے اسلام ہزاروی) نے ان سے کہا کہ دو روز بعد جمعیت کی سالانہ کانفرنس ہو رہی ہے ہم نے اِس وقت چٹان کے مسئلہ میں تعاون کا اظہار کیا اور یہ بات حکومت کے علم میں آگئی تو ممکن ہے وہ کانفرنس کا انعقاد روک دے، لیکن کھلے اجلاس میں یہ مسئلہ اٹھائیں گے۔

مولانا تاج محمود میرے گنے چُنے مخلص دوستوں میں سے ہیں اُنہیں معلوم تھا کہ غلام غوث کے متعلق میری رائے کچھ زیادہ موافق نہیں لیکن وہ اس اقدام کے خلاف تحریک اُٹھانے کی فکر میں تھے اور باقیات مجلس احرار کے اس قبیلہ میں سے تھے جو مجلس ختم نبوت، کے نام پر قائم تھا۔ انہوں نے مجھے ماضی کے تعلقات کا حوالہ دے کر آمادہ کر لیا کہ ان کی دوستانہ بات مان لوں اور جمعیۃ علمائے اسلام کے اجلاس سے خطاب کروں انکے خیال میں یہ وقت ناراضی کا نہیں تھا۔

۳ مارچ ۱۹۶۸ء کو ڈاکٹروں کی خواہش کے برخلاف میں نے ہسپتال چھوڑ دیا اور گھر چلا آیا۔ ۴ مئی کو جمعیت العلماء نے تقریباً ہر شہر، قصبہ، گاؤں کے مندوبین و مدعوئین پر مشتمل ایک بہت بڑا جلوس نکالا، جلوس نے میکلوڈ روڈ پر چٹان پرنٹنگ پریس کی واپسی کے حق میں زبردست مظاہرہ کیا، اسی روز جمعیت نے حکومت کے اقدام کی مذمت میں قرارداد پاس کی ۵، مئی کو مولانا محمد اکرم صدر مجلس استقبالیہ جمعیۃ علماء

کانفرنس اور مولانا تاج محمود نے مجھے مولانا درخواستی اور مفتی محمود سے ملایا، اور اپنی خواہش کا اعادہ کیا کہ چٹان کے خلاف جو کاروائی جس بنیاد پر ہوئی ہے اس کے سیاسی پہلو پر اظہار خیال کر دوں میں نے ہامی بھر لی، اِدھر ۴ مئی کی صبح کو صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں خواجہ محمد صفدر، مسٹر حمزہ اور ملک محمد اختر نے چٹان سے متعلق سرکاری اقدام کے خلاف تحریک التوا پیش کی،

خواجہ صاحب اور حمزہ صاحب نے حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور سرکاری اقدام کو پریس کی آزادی کے منافی قرار دیا۔ جواب کے مجاز قاضی فضل اللہ ہوم منسٹر تھے لیکن وہ چپ ہی تھے کہ احمد سعید کرمانی کھڑے ہو گئے، ایک دھواں دھار تقریر جھاڑ دی —— فرمایا[1]

حضور والا۔ میرا ارادہ اس بحث میں حصہ لینے کا قطعاً نہ تھا لیکن میرے ایک خاص دوست نے نہ معلوم کن وجوہات کی بنیاد پر کچھ ایسی باتیں کہہ دی ہیں جن کا اس معزز ایوان میں جواب دینا اشد ضروری ہے تاکہ ریکارڈ صحیح ہو جائے، یہ ایک سفید جھوٹ ہے اور اس سے بڑا جھوٹ کم از کم میری زندگی میں نہیں بولا گیا[1] کہ یوم اقبال کے موقع پر حکومت کی جانب سے گڑ بڑ کرائی گئی[2] اس سے بڑا جھوٹ میں نے آج تک نہیں سنا[3] حضور والا اگر آپ اجازت دیں تو میں صرف ریکارڈ درست کرنے کی خاطر تاکہ عوام میں غلط تاثر نہ رہے ------------------ اسمبلی کی رپورٹ میں وہ الفاظ قطع کئے گئے ہیں، جناب حمزہ نے محذوف الفاظ پر ٹوکتے ہوئے کہا،

---

[1] "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔"

[2] اس سادگی پر کون نہ مرجائے اے خدا۔

[3] کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا۔

"مجھے اس کی پرواہ نہیں میں اس قسم کی دھمکیاں برداشت نہیں کروں گا۔"
خواجہ محمد صفدر نے سپیکر سے وزیر اطلاعات کے متعلق کہا۔
"انہوں نے دھمکی دی ہے انہیں کہا جائے کہ وہ اپنے الفاظ واپس لیں۔"
سپیکر نے پھر اعادہ کیا کہ مداخلت نہ ہونی چاہیئے، تو تکار (Cross Talk) نہ ہونی چاہیئے۔
خواجہ صفدر نے کہا۔ جناب میں اصرار کرتا ہوں کہ وہ اپنے الفاظ واپس لیں۔
سپیکر نے پھر متوجہ کیا کہ مداخلت نہ ہونی چاہیئے، تو تکار (Cross Talk) نہ ہونی چاہیئے۔
اور وہ الفاظ جو اس تو تکار کا باعث ہوئے ہیں حذف کر دیئے جائیں۔
خواجہ صفدر نے کہا۔ وزیر اطلاعات اپنے الفاظ ضرور واپس لیں۔
وزیر اطلاعات (کرمانی) نے کہا جناب والا میں نہایت ادب کے ساتھ اور نہایت ٹھنڈے دماغ کے ساتھ اس غرض سے کہ ------- (الفاظ محذوف ہیں)
خواجہ صفدر۔ دھمکیاں دے کر
وزیر اطلاعات۔ مسٹر صفدر آپ بچے نہیں آپ کو عظیم پارلیمانی تجربہ ہے۔
سپیکر۔ پھر وہی تو تکار (Cross Talk) تو تکار نہ کریں۔
وزیر اطلاعات۔ جناب وہ مداخلت کرتے ہیں۔
سپیکر۔ کوئی مداخلت نہ ہونی چاہیئے۔
وزیر اطلاعات۔ ہم ان کی (خواجہ صاحب) بہت زیادہ عزت و تکریم کرتے ہیں، ہم وہ تمام سنتے ہیں جو وہ کہتے ہیں لیکن ہم تحمل سے سنتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ پرانے سیانے اور تجربہ کار پارلیمنٹرین ہیں، وہ کم سے کم قوت برداشت ہی کا ثبوت دیں گے۔ اور ایوان کے وقار کو مجروح نہ کریں گے۔

دسپیکر نے اس سے آگے کی تقریر و تکرار اسمبلی کے ریکارڈ سے محذوف کر دی)
کرمانی (وزیر اطلاعات) حضور والا میں عرض کر رہا ہوں کہ میرے عزیز بھائی نے جوش خطابت میں کچھ ایسی باتیں کہہ دیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں یوم اقبال پر غنڈہ گردی کن لوگوں نے کی ؟ یہ پولیس کا کام ہے کہ اس کی تفتیش کرے (اور وہ تفتیش نہ ہوئی ، راقم) لیکن جو حالات میرے ذاتی علم میں ہیں ان کی[۲] بنا پر عرض کرنا چاہتا ہوں ، وہاں کچھ لوگ (بس کچھ لوگ ؟ راقم) اس بات کے خلاف تھے کہ یوم اقبال کی مقدس تقریب پر ایک ایسا شخص سٹیج سکریٹری کے فرائض انجام نہ دے جس نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی (اور یہ انکشاف کرمانی کو بیس سال بعد ہوا تھا ورنہ ۱۹۴۹ء سے یہی شخص مرکزیہ مجلس اقبال کا سکریٹری چلا آرہا ہے اور اس کے تمام ارکان وہ لوگ ہیں جو تحریک پاکستان میں قائد اعظم کا ہاتھ بٹاتے رہے) جس نے قائد اعظم علیہ الرحمۃ کو گندی گالیاں دیں ، جس نے بیگم لیاقت علی خان کی کھلے بندوں تذلیل و تضحیک کی ، جس نے صوبہ پنجاب کے ایک زمانہ میں نامور وزیر اعظم سر سکندر حیات خان کے خاندان کے افراد پر گندی گالیوں کی بوچھاڑ کی تھی ، ایسا شخص جس نے صوبہ پنجاب کے چیف منسٹر میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کے ذاتی معاملات کے بارے میں اخبارات میں گند اچھالا تھا ، ایسا شخص جس نے متحدہ پنجاب بلکہ متحدہ ہندوستان کے ایک نامور صحافی اور نامور سپوت مولانا ظفر علیخان

---

[۱] عمر کہنے کو بڑے بھولے بیچارے بڑے معصوم۔

[۲] ان لوگوں کو جب ہال سے پٹائی کے بعد نکال دیا گیا تو وہ ٹیکسیوں میں بیٹھ کر سیدھا ایرپورٹ پہنچے جہاں کرمانی راولپنڈی جانے کے لئے ہنگامہ آرائی کی رپورٹ کے انتظار میں چشم براہ تھا۔ ان لوگوں نے رپورٹ کی اور کرمانی اپنے آقائے ولی نعمت کو رپورٹ دینے پرواز کر گیا۔

کے خلاف نازیبا کلمات تحریر کئے، ایک ایسا شخص جس نے اپنے ہفت روزہ میں مولانا محمد علی جو مسلمانوں کا عظیم محسن تھا اس کی ذات کے متعلق نازیبا کلمات تحریر کئے (لعنۃ اللہ علی الکاذبین ان میں سے کوئی چیز بھی صحیح نہیں۔ راقم) ایک ایسا شخص جس نے مولانا غلام غوث ہزاروی جیسے نیک دل اور شریف الطبع انسان کے متعلق غلط باتیں کہی تھیں[1] وہ چاہتے تھے کہ ایسے شخص کو جو کسی لحاظ سے بھی جرنلسٹ نہیں ہے، ایسا شخص جو کسی لحاظ سے بھی پاکستان کا بہی خواہ اور خیر خواہ نہیں وہ کہتا تھا[2] کہ ایسا شخص جس نے تمام عمر اقبال کے فکر کی تضحیک کی اور اس کی تذلیل کی اور اس کا مذاق اڑایا[3] ہم ایسے شخص کے بارے میں پُر امن طور پر درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ اس کو ایشیج سکریٹری کے فرائض سے علیحدہ کر دیا جائے، مسٹر حمزہ۔ وہ آپ سے مشورہ کر کے گئے تھے۔

---

[1] غلام غوث تقسیم ہند تک احرار کے نائب صدر رہے اور اس جلسہ کی صدارت کی جس میں مظہر علی اظہر نے قائد اعظم پر تبرّیٰ کیا، پاکستان کے متعلق ان کا نقطۂ نگاہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کا نقطۂ نگاہ تھا، کرمانی نے ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے برائے وزن بیت اپنی صف میں انہیں بھی شامل کر لیا، لطف یہ کہ انہی غلام غوث نے چٹان کے متعلق جمعیت کے اجلاس میں حکومت کے خلاف قرار داد مذمت پیش کی۔

[2] روایت یہ ہے کہ جس وقت کرمانی بول رہا تھا آپے سے باہر تھا اور منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ الفاظ چھوٹ کر فقرے اُدھورے رہ گئے تھے۔

[3] مرکزیہ مجلس اقبال نے غالباً اسی لئے ۲۰ سال سے اس شخص کو اپنا سکریٹری بنا رکھا ہے ڈاکٹر جاوید اقبال خلف الرشید علامہ اقبال (نور اللہ مرقدہ) کے علاوہ علامہ کے دوسرے اعزہ بھی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔

وزیر اطلاعات (انگریزی میں) مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور آپ کے لئے دُعاگو ہوں یہ
تمام (مداخلت) ہے۔

سپیکر۔ آرڈر پلیز۔ مداخلت نہیں۔

وزیر اطلاعات۔ تو حضور والا وہ ایک شریفانہ اور خاموش اور ایک مودبانہ احتجاج[1] کرنا چاہتے تھے، لیکن ہوا کیا وہاں انہی بزرگ نے جس کا ابھی تذکرہ ہو رہا تھا میری مراد شورش کاشمیری سے ہے اور ان کے حواریوں نے بے گناہ اور معصوم سامعین پہ کرسیاں برسائیں[2]۔ جس سے بہت سے لوگ مجروح ہوئے، حضور والا میں یہ عرض کئے دیتا ہوں کہ اگر حکومت نے یہ کام کرنا ہوتا تو حکومت کے پاس اتنے اختیارات ہیں کہ وہ جلسہ کو سرے سے منعقد ہی نہ ہونے دیتی، (کسی حکومت کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی۔ راقم) لیکن حکومت تو شہری آزادی کی خواہاں ہے، حکومت تو آزادی خیال کی حمایت کرتی ہے، وہ لوگ جو آج کہتے ہیں کہ چٹان ایک اخبار تھا یا ایک رسالہ تھا وہ جرنلزم کی تعریف سے ناواقف ہیں شورش کاشمیری اور سب کچھ ہوگا مگر نہ وہ اخبار نویس ہے اور نہ وہ سیاسی کارکن، دشنام طرازی، گالی گلوچ، بد اخلاقی کا بہترین مظاہرہ کرنا اس کے خون میں رسا بسا ہوا ہے۔

خواجہ صفدر۔ جناب سپیکر یہ اس شخص پر الزامات لگا رہے ہیں جو اس ایوان میں موجود

---

[1] جسٹس وحید الدین (چیف جسٹس) صدارت کی کرسی پر فروکش تھے اور بچشم خود اس شریفانہ خاموش اور مودبانہ احتجاج کا نظارہ کر رہے تھے۔

[2] گویا سامعین صرف ان کے مٹھی بھر زلہ رباؤں کا نام تھا، وہ لوگ سامعین نہیں تھے جو یوم اقبال کی توہین کے اس تماشہ پر ان آوارگان شہر کے مخالف ہو گئے تھے اور انہی میں سے چند نوجوانوں نے انہیں مار بھگایا تھا۔ راقم

نہیں شاید ان کو زیبا ہو۔

وزیر اطلاعات - آپ جو ہیں ہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں، جناب والا، مسلمانوں کے ایک محسن، ایک مدبر، ایک بہی خواہ، ایک خیر خواہ کا نام لیں جو اس کی گالی گلوچ کی زد میں نہ آیا ہو، جناب والا میں آپ کے وسیلہ سے ان دوستوں سے نہایت ادب کے ساتھ پوچھنا چاہتا ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ شورش کاشمیری واقعی ایک اخبار نویس ہے، آپ پچھلے ایک سو سال کی تاریخ کا جائزہ لیں اور آپ ایک اخبار کا نام لے سکیں گے جس نے ۲۰ سال متواتر اپنے اخبار کے صفحات میں سوائے گالی چھاپنے کے اور کچھ نہ لکھا ہو

مسٹر حمزہ کی طرف سے قطع کلامی۔

وزیر اطلاعات۔ مسٹر حمزہ! آپ سے میں علیحدہ نپٹ سکتا ہوں، میں مضبوط ہوں، مداخلت نہ کریں میں آپ سے استدعا کرتا ہوں نام پر ---- حمزہ کی طرف سے مداخلت۔

سپیکر - مسٹر حمزہ مداخلت نہ کریں، اپنی سیٹ پر بیٹھیں۔

(مداخلت)

وزیر اطلاعات - میں آپ سے شائستگی کے نام پر، ضابطہ کاروائی کے نام پر، انسانیت کے نام پر ملتجی ہوں۔

مسٹر حمزہ - اور ڈی پی آر کے نام پر (قہقہہ)

وزیر اطلاعات - میں آپ سے ایوان کے وقار کے نام پر ملتجی ہوں کہ مداخلت نہ کریں، میں بہت ضروری بیان دے رہا ہوں۔

جناب والا، میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کر رہا تھا کہ پچھلے سو سال سے آپ متحدہ ہندوستان یا بھارت اور پاکستان کے ممالک میں سے ایک مثال بھی کسی ایسے اخبار کی پیش نہیں کر سکتے جس نے بیس سال متواتر گندگی کے، گالی گلوچ کے، بدتمیزی کے اور بداخلاقی کے اگر آپ اجازت دیں تو تحریری غنڈہ گردی کے اور کوئی کام کیا ہو لیکن

یہ واحد ایک اخبار ہے یا رسالہ یا ہفتہ وار جس کو اس ملک میں تحریری غنڈہ گردی کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے، آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس کی زبان کتنی غلیظ اور گندی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۲ء میں جب لیڈر آف دی اپوزیشن میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کے دست راست تھے جب میاں ممتاز محمد خان دولتانہ صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے اس وقت اس ہفتہ وار رسالہ کے خلاف کارروائی کی گئی اور وہ کارروائی میاں ممتاز محمد خان دولتانہ نے کی اور یہ ہفتہ وار ایک سال کے لئے بند کر دیا گیا۔ جمہوریت کے علمبرداروں نے بھی ۱۹۵۲ء میں یہ محسوس کیا کہ یہ اخبار ملک کی سالمیت اور سوسائیٹی کو نقصان پہنچانے والا اخبار ہے[1] (مداخلت)

مسٹر سپیکر۔ آرڈر آرڈر۔

وزیر اطلاعات۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے، جس کی تائید میں میرے واجب احترام دوست خواجہ محمد صفدر ان کی قیادت پر فخر محسوس کرتے اور آج بھی

---

[1] انہی دنوں "نوائے وقت" بھی جمہوریت کے ان علمبرداروں نے غضب کیا تھا، کرمانی نے بعض دوسرے ایم ایلوں (اس وقت ایم ایل اے کہلاتے تھے) کے ساتھ مل کر نوائے وقت سے متعلق یہی لہجہ استعمال کیا تھا اور حمید نظامی مرحوم سے متعلق غم و غصہ میں یہاں تک فرمایا تھا کہ انہیں اسمبلی کے سامنے بطور ملزم حاضر کیا جائے

۱۹۵۳ء میں کرمانی نے ایک غنڈہ کی حمایت میں سول لائنز لاہور کے ڈی ایس پی آجکل ڈی آئی جی پولیس میرزا عباس سے اپنے ایم ایل اے ہونے کی دھونس میں الجھنا چاہا اور اس پس منظر میں پکڑا گیا تو حمید نظامی مرحوم نے اس کی سفارش کی اور مارشل لا کے تحت سزا پائی سے رہائی دلوائی تھی۔

کرتے ہیں مجھے یہ شکوہ اور گلا نہیں ہے لیکن میاں ممتاز محمد خان دولتانہ نے ۱۹۵۲ء میں جون کے مہینے میں اس رسالہ یا ہفتہ وار کو ایک سال کے لئے بند کر دیا۔ ان کے دلائل کیا تھے ؟

"اس کا وجود عوام کے، اخلاق کے، شرافت کے اور نظم کے منافی ہے۔"

یہی وجوہات میاں ممتاز محمد خان دولتانہ نے بحیثیت وزیر اعلیٰ اس وقت فرمائیں کہ اس کا وجود عوام کے اخلاق کے شرافت کے اور نظم کے منافی ہے[1]۔ اس اخبار کے لئے آج پھر حکومت مجبور ہوئی ہے (گویا الحمد للہ کا مختصر شذرہ جو پہلے نقل کیا جا چکا ہے اخلاق، شرافت اور نظم کے منافی تھا۔ راقم) اور کوئی حکومت اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی (جو حکومت ہو) کہ ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک شہری دوسرے شہری کا گلا کاٹنا شروع کر دے، حکومت کو چاہیئے کہ ایسے عناصر کو سختی سے کچل دے جو عناصر ملک میں افراتفری کا باعث ہوں، باہر کے ممالک جن سے پاکستان کے گہرے اور برادرانہ تعلقات ہیں میری مراد چند عرب ممالک سے ہے میں رکاوٹ کا باعث ہوں، اگر کوئی اخبار نویس نام نہاد اخبار نویس ایک ایسی تحریر لکھے جس سے نہ صرف ملک کے اندرونی حالات خراب ہو جائیں نہ صرف ملک کی سالمیت خطرے میں پڑے نہ صرف یہ بلکہ ان برادرانہ ممالک سے ہمارے تعلقات بگڑ جائیں جن ممالک نے پچھلی جنگ میں پاکستان کی غیر معمولی امداد کی تھی۔[2]

---

[1] چٹان اس لئے بہ لطائف الحیل بند کیا گیا تھا کہ وہ اس وقت کی وزارت کا سخت مخالف تھا کہ مانی ایک لفظ نہیں دکھا سکتا جس سے یہ ثابت ہو کہ چٹان میں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کے خلاف کوئی ذاتی حملہ کیا گیا ہو۔

[2] ایسی کوئی تحریر چٹان کے صفحوں میں کبھی نہیں آئی ہے ..... سچ ہے جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

یہ قدم جو حکومت نے اُٹھایا ہے سوچ سمجھ کر اُٹھایا ہے ، اس سے ہمارا مقصد کسی کے خلاف ذاتی رنجش کو درمیان میں لاکر کارروائی کرنا نہیں وہ میرے خلاف باتیں کرتا ہے میں اپنے خلاف رسوائی کی اس مہم کو نظر انداز کرتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں، میری زبان سے ایک شریف انسان کی حیثیت سے ہر شخص کی ماں ، بہن اور بیٹی محفوظ ہونی چاہیئے ، اگر کسی شخص کی زبان سے محفوظ نہیں اور اگر اس شخص کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو خواجہ محمد صفدر صاحب جیسے منجھے ہوئے شریف الطبع انسان کی تائید حاصل ہے اور وہ کھلے انداز میں ایسی قوت کی تعریف کرنا چاہتے ہیں جس کے پاس سب کچھ ہے ، اخلاق نہیں ہے ، جس کے پاس سب کچھ ہے انسانیت نہیں ہے ، جس کے پاس سب کچھ ہے لیکن وطن اور ملک کی محبت نہیں ہے ، جس کے پاس سب کچھ ہے لیکن وہ ملک وقوم کے مفاد کو ہمیشہ نظر انداز کرتا ہے ، اس کی تائید خواجہ صفدر کو مبارک ہو، میں ان کو اور کچھ نہیں کہہ سکتا ایک بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کرنی چاہتا ہوں کہ حکومت کے اس فیصلہ میں کسی فرد کی ذاتی رنجش کا ہاتھ نہیں ہے ۔

مسٹر حمزہ - آپ نے بیان دے کر غلطی کی ہے ۔

وزیر اطلاعات - آپ مجھے جانتے ہو؟ آپ اس ہاؤس میں بولنے کے قابل ہیں؟

مسٹر حمزہ - ہاں ۔

مسٹر سپیکر - مسٹر حمزہ براہ مہربانی مداخلت اور تو تکار نہ کریں ۔

وزیر اطلاعات - جناب والا میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ کچھ ہماری بھی سوسائیٹی کی طرف سے ذمہ داری ہے ، ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم سوسائٹی کو عمدہ ، اعلیٰ اور اُونچی اخلاقی قدروں پر استوار کریں ، ہمارا بھی بحیثیت مسلمان فرض ہے کہ ہم ان قوتوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں جو نام تو لیتے ہیں اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

لیکن ان کا کردار ان کی زندگی قرآن حکیم کے نہ مٹنے والے اصولوں کے منافی ہے، کون نہیں جانتا کہ قرآن حکیم میں بار بار تلقین کی گئی ہے کہ بُرے الفاظ مت استعمال کرو بُری باتیں مت کرو گندی باتیں منہ سے مت نکالو، گندے القاب تم لوگوں کو مت دو، یہ باتیں قرآن حکیم کی باتیں ہیں یہ سچائی کی باتیں ہیں، یہ حیرت کی بات ہے کہ یہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گم ہوں لیکن اس کا تمام کردار تمام اس کی کہانی اور اس کی تمام کاروائی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوسوں دور ہے، میں یہ پھر ادب سے عرض کروں گا کہ ایسے شخص کو اخبار نویس کہنا، ایسے شخص کو سیاسی کارکن کہنا در اصل لفظ اخبار نویس اور لفظ سیاسی کارکن کی توہین ہے، وہ واحد شخص ہے جس نے ملک میں تحریری غنڈہ گردی کا آغاز کیا، وہ تحریری غنڈہ گردی کا موجب ہے، ایسے شخص سے ہمدردی کرنا سوسائٹی کی کوئی خدمت نہیں ہے"۔

یہ رپورٹ صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان کے اسسٹنٹ سکریٹری کی دستخطی ہے اور اس فائل سے حاصل کی ہے جو ہائی کورٹ میں رٹ کے ساتھ شامل کی گئی تھی۔ زبان وبیان کی غلطیاں اس لئے درست نہیں کی ہیں کہ جو کچھ اس وزیر نے کہا تھا اس میں اصلاح ہو جاتی اور یہ دستاویز کے منافی ہوتا۔

صدر ایوب نے اپنی سبکدوشی کے بعد ۱۹۷۰ء کے اواخر میں ایک ملاقاتی چودھری حبیب احمد سے ان کے کسی استفسار پر کہا اور وہ نوائے وقت میں انہی دنوں چھپ چکا ہے کہ شورش کے متعلق احمد سعید کرمانی نے ہمیں گمراہ کیا اور غلط فیصلہ کرایا تھا۔ بہرحال کرمانی نے جو کچھ کہا اس طیش میں وہ حق بجانب تھا، میں نے چٹان پریس کی ضبطی اور ہفتہ وار چٹان کے ڈیکلریشن کی منسوخی کے حکمنامہ کی پشت پر جو الفاظ اس کے متعلق لکھ دیئے تھے اس کے بعد اس سے یہ توقع رکھنا کہ اپنے دل کی بھڑاس نہیں نکالے گا ایک ایسی خواہش ہوتی جس کی صرف پیغمبروں سے توقع ہو سکتی ہے، کرمانی اس سے پہلے ہی میرے معاملہ

میں بس کی گانٹھ تھا اب غصہ، نفرت، انتقام اور اختیار کے تحت اس نے جو کہا اس کا حق تھا، میرے ریمارکس سے اس کو تکلیف ہوئی تھی یہ ویاکھیان نہ دیتا تو کیا کہتا، لیکن جو کچھ اس نے کہا وہ بلا ثبوت تھا اس کو یہ احساس ہونا چاہیئے تھا کہ حکومت نے جو اقدام اس کی بدولت کیا ہے اس کے بعد وہ میرے قلم کی باز پرس سے کیونکر بچ سکتا ہے۔ کرمانی نے چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ ہوتے ہی روزنامہ کوہستان کو جو اس وقت مسلم لیگ کنونشن کا جریدہ اور اس کی نگرانی میں تھا میرے خلاف اول فول بکنے پر لگا دیا، میں نے چودھری محمد انور صاحب بھنڈر (سپیکر صوبائی اسمبلی) کو میو ہسپتال سے ذیل کا خط لکھا۔

۳ مئی ۱۹۶۸ء

چودھری صاحب مخدوم و محترم،

سلام اخلاص،

ہر عنوان سے آپ کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند ایک گزارشات پیش خدمت ہیں۔

۱ - چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ ہو چکا ہے، چٹان پریس ضبط کر لیا گیا ہے، نوائے وقت زیر احتساب ہے، کئی نسلی قوانین اس کے سر پہ معلق ہیں، باقی اخبارات حکومت کے مرغ دست آموز ہیں۔

۲ - میں ہسپتال میں ذیابیطس کے زبردست حملہ کی وجہ سے بیمار پڑا ہوں اور آج چھٹی لینے کا ارادہ ہے، ممکن ہے ڈاکٹر صاحب مان جائیں۔

۳ - ہفت رنگ وزیر مسٹر احمد سعید کرمانی میرے خلاف اپنے اخبار "کوہستان" میں ژاژ خائی کا انبار لگوا رہے ہیں۔

۴ - کرمانی صاحب کی دو حیثیتیں ہیں، ایک سیاسی، ایک وزارتی، وزارتی حیثیت سے جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے کر چکے اور جو کچھ کرنا چاہیں انہیں شاہ کا مصاحب

ہونے کی وجہ سے اختیار ہے لیکن یہ جواں مردی کے خلاف ہے کہ حملہ سیاسی حیثیت سے کرتے ہیں اور تحفظ وزارتی حیثیت سے چاہتے ہیں۔

۵۔ میں یہ عریضہ اس لئے آپ کو لکھ رہا ہوں کہ آپ ایوان کی آبرو کے پیش نظر انہیں روکیں میں وزیر موصوف کی بالی عمریا سے لے کر سرپرستی کی اس عمر تک اُن کا شناسا ہوں، یہ غلط طریق کار ہے کہ میرے بال و پر کترنے کے بعد زاغ دخمہ کو چونچ مارنے کا حوصلہ ہو،

۶۔ میں کوئی چیز پبلک میں لانا نہیں چاہتا، آپ صوبائی اسمبلی کے واجب الاحترام سردار ہیں، آپ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ مجھے یہ اجازت ہو سکتی ہے کہ ایک خط ارکان کو تقسیم کر سکوں جس سے وزیر موصوف کو اسی لب و لہجہ میں خطاب کیا جائے جس لب و لہجہ کے مسلسل استعمال پر "کوہستان" کا خمیر تیار کیا گیا اور اس کو وزیر موصوف کی ذہنی امانت حاصل ہے ؟

والسلام

ادب و احترام کے ساتھ

دستخط

(آغا شورش کاشمیری)

بشرف ملاحظہ

آنریبل چودھری محمد انور صاحب بھنڈر

سپیکر اسمبلی مغربی پاکستان لاہور

چودھری صاحب کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا، البتہ رسید آگئی کہ خط انہیں موصول ہو گیا ہے۔

۴ مئی کو کرمانی نے محولا بالا تقریر کی تو میں نے سپیکر صوبائی اسمبلی کو ایک اور خط لکھا وہ خط یہ تھا اور انہیں یہ اخذ رسید دستی پہنچا دیا تھا۔

۷ مئی ۱۹۶۸ء

جناب محمد انور صاحب بھنڈر

سپیکر صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان، لاہور

سلام مسنون، گرامی قدر

صبح سویرے میں نے اسمبلی کی کاروائی دیکھی، کل آپ کو ایک تار دیا تھا کیا یہ ممکن ہے کہ میں اسمبلی میں حاضر ہو کر جواب دے سکوں،

کرمانی صاحب نے جو کچھ کہا وہ اُس کی طبیعت کا اندرونی زہر اور ذاتی بُغض تھا جو باہر آ گیا، میں اس کے ترکش کے ہر تیر کا خیر مقدم کرتا ہوں، گذارش اتنی ہے کہ میرے خلاف یہ عاید کردہ الزامات بالکل ہی غلط ہیں کہ

میں نے قائد اعظمؒ، خان لیاقت علی خان، بیگم لیاقت علی خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور مولانا غلام غوث ہزاروی کو گالیاں دی ہیں، اِنا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

براہ کرم اصل حقیقت سے ایوان کو مطلع کریں، میں آپ کی معرفت کرمانی صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ کسی عہد کی کوئی ایسی تحریر دکھائیں جس سے اُن کا دعوئ دشنام دہی ثابت ہوتا ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ

۱ - میں نے قائد اعظم کی مفارقت اور قیادت پر ۹۲ تعریفی نظمیں لکھی ہیں جن میں سے اکثر "نوائے وقت" میں چھپی ہیں۔

۲ - علامہ اقبال پر میں نے ۱۳۲ نظمیں کہی ہیں۔

۳ - مولانا ظفر علی خان کے بارے میں میری نظموں کا شمار ہی نہیں، میرا دیوان ان کے

نام منسوب ہے ان پر دو کتابیں لکھ چکا ہوں۔

۴۔ مولانا محمد علی جوہر جب وفات پا گئے تو اُن دنوں میں اسکول کا طالب علم تھا اور سیاسیات کا مجھے کوئی شعور ہی نہ تھا، اس ملک میں ان کا یوم منانے کی نیو میں نے رکھی، سردار نشتر مرحوم کا اعترافی خط میرے پاس موجود ہے۔

۵۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے چٹان کی ضبطی کے خلاف جمعیتہ علماء اسلام کی عظیم الشان کانفرنس میں قرارداد پیش کی اور سخت احتجاج کیا، ان کی تقریر اس ظلم کے خلاف ایک گھنٹہ جاری رہی۔

۶۔ چٹان کے بیس سالہ فائل میرے پاس موجود ہیں، کرمانی صاحب بتائیں کہ جو کچھ انہوں نے اکابر کے بارے میں مجھ سے منسوب کیا ہے کہاں درج ہے؟ میں آپ کو فائل بھیجنے کو تیار ہوں۔

۷۔ خان لیاقت علی خان مرحوم کے لئے قائد ملت کا لفظ سب سے پہلے چٹان نے استعمال کیا، بیگم لیاقت علی کے متعلق میں نے کبھی قلم نہیں اٹھایا، صرف اپوا کے خلاف ایک دفعہ اس لحاظ سے احتجاج کیا تھا کہ پردہ جزو اسلام ہے اور بس۔

میں کرمانی صاحب سے مطلقاً نہیں ڈرتا لیکن یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس حقیقت حال کو ایوان کے سامنے رکھ کر صورت حال واضح کریں، کرمانی صاحب سے کسی قسم کی رعایت چاہنا شرافت، اخلاق اور انسانیت کے منافی ہے والسلام

المخلص

شورش کاشمیری

کاپی برائے:

۱۔ جنرل محمد موسیٰ
گورنر مغربی پاکستان (لاہور)

۲۔ جناب خواجہ محمد صفدر صاحب

اپوزیشن لیڈر صوبائی اسمبلی، لاہور

۳۔ جناب ایم حمزہ صاحب ایم اے

ممبر صوبائی اسمبلی، لاہور

۷ مئی ہی کو صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو ذیل کا خط در جسٹرڈ) بہ اخذ رسید روانہ کیا۔

۷ مئی ۱۹۶۸ء

گرامی منزلت،

سلام مسنون،

آپ کے نامزد وزیر مسٹر احمد سعید کرمانی نے میرے خلاف صوبائی اسمبلی میں جو کچھ کہا ہے وہ حکومت میں شریک ہونے کی وجہ سے جسارت کی ہے یا ایوان کے مقررہ تحفظات کے باعث حوصلہ کیا ہے، ہر چیز خلاف واقعہ ہے، مسٹر کرمانی ثابت نہیں کر سکتے کہ میں نے تقسیم سے قبل یا اس کے بعد کبھی قائد اعظم علیہ الرحمۃ، خان لیاقت علی خان، بیگم لیاقت علی خان، مولانا محمد علی جوہر، اور مولانا ظفر علی خان کے خلاف "ژاژ خائی" کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظم پر میں نے آج تک ۹۲ تعریفی نظمیں لکھی ہیں جو پاکستان کے ہر شاعر سے زیادہ ہیں، مولانا محمد علی جوہر میری سیاسی پیدائش سے پہلے رحلت فرما چکے تھے، میں نے ان کی یاد میں بھی بہت سی نظمیں کہی ہیں، خان لیاقت علی خان کے متعلق سب سے پہلے قائد ملت کا لفظ میں نے استعمال کیا اور ان کا دلگداز مرثیہ لکھا، مولانا ظفر علی خان میرے اُستاد تھے میرا دیوان ان کے نام معنون ہے میں ان پر دو کتابیں لکھ چکا ہوں اس کا اعتراف علی گڑھ یونیورسٹی کے اہل قلم نے بھی کیا ہے،

بہ ادب گذارش ہے کہ آپ نے مسٹر کرمانی کو اپنی ذرہ نوازی کے تحت وزیر بنانے کے علاوہ صوبہ مسلم لیگ کا صدر بنا رکھا ہے، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ کوئی سہارا لینے کی بجائے پبلک میں آکر اپنے الزامات لگائیں اور مجھے موقع دیا جائے کہ میں وہیں جواب دے سکوں، میرا اخبار بند کر کے اس قسم کے جھوٹے الزام لگوانا یقیناً شرافت و انسانیت کے منافی ہے، میں جو الزام ان پر لگاتا ہوں وہ عوام کے علاوہ عدالت کے کٹہرے میں اور آپ کے سامنے ثابت کر سکتا ہوں، کرمانی صاحب میں بھی یہی حوصلہ ہونا چاہیئے، افسوس کرمانی صاحب میں شیوۂ مردانگی نہ پہلے کبھی تھا نہ اب ہے۔

مکرر التماس انتہائی احترام کے ساتھ کہ میری اور کرمانی صاحب کی طالب علمانہ زندگی سے لے کر آج تک کی زندگی کے بارے میں اخلاقی، سیاسی اور جنسی لحاظ سے تحقیقات کرائی جائے، میرے خلاف کوئی داغدار صفحہ یا لمحہ ثابت ہو تو مجھے قرار واقعی سزا دلوائی جائے اور اگر کرمانی صاحب مجرم ثابت ہوں تو کم سے کم صوبہ کی وزارت سے انہیں ضرور خارج کر دیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ کرمانی صاحب اپنے خاص عوارض اور ذاتی عداوتوں کے باعث عوام میں حکومت کی رسوائی کا باعث ہو رہے ہیں، یہ میری حقیرانہ درخواست ہے، والسلام

ادب و احترام کے ساتھ

المخلص

(شورش کاشمیری)

ایڈیٹر ہفت روزہ چٹان، لاہور

بشرف نظر:

جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان،

ہلال پاکستان، ہلال جرأت،

صدر مملکت پاکستان، راولپنڈی

کاپی برائے:

۱۔ جناب گورنر مغربی پاکستان، لاہور

۲۔ چیف جسٹس عدالت عالیہ مغربی پاکستان، لاہور

۳۔ مسٹر ایم ایچ صوفی ــــ کیبنٹ سکریٹری حکومت پاکستان، راولپنڈی

۴۔ ملک خدا بخش بُچہ، ایگریکلچر منسٹر، مغربی پاکستان، لاہور

۵۔ قاضی فضل اللہ منسٹر ہوم، مغربی پاکستان، لاہور

ان خطوط سے بھی پہلے چھ مئی کو میں نے ذیل کا تار سپیکر، وزیر داخلہ، خواجہ محمد صفدر، مسٹر حمزہ اور ملک محمد اختر کے نام ارسال کیا تھا۔

"میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ وزیر اطلاعات نے صوبائی اسمبلی کی استحقاقی دیواروں کے اندر میری ذات پر آج صبح غائت درجہ رکیک حملے کئے ہیں یہ ایوان کی توقیر کے منافی ہے۔

میں ایوان کا ممبر نہیں اس لئے وہاں دوبدو جواب نہیں دے سکتا، میں وزیر اطلاعات کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اپنے یہ الزامات عوام میں دہرائے تاکہ وہ عدالت یا پبلک پلیٹ فارم پر اس کا مسکت جواب پا سکے۔

بہر حال جس روز محولہ بالا خطوط لکھے گئے اس دن میری گرفتاری کا فیصلہ ہو چکا تھا اور سرکاری کاغذات کا پیٹ بھرا جا رہا تھا، میں ہر چیز سے آگاہ تھا، خبریں لحظہ بہ لحظہ آ رہی تھیں کہ اس وقت کیا ہو رہا ہے؟

۵ مئی کو جمعیتہ علمائے اسلام کے آخری اجلاس میں جو تقریر میں نے کی وہ بلاشبہ حکومت کے لئے پریشان کن تھی میں نے جو کچھ کہا اس کی صحت پر مجھے ہمیشہ اصرار رہے گا۔ اس تقریر میں جو باتیں شرح وبسط سے بیان کیں وہ یہ تھیں۔

۱۔ علم زندہ رہتا ہے، طاقت مٹ جاتی ہے، حکمرانوں کے لئے فنا ہے، علماء کے لئے نہیں، وہ مرکے بھی زندہ رہتے ہیں، اصل زندگی موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔

۲۔ میں جو کہوں گا ثبوت اور دلیل سے کہوں گا، زبانی کلامی نہیں۔

۳۔ میرے خلاف ایک پوسٹر دیواروں پر لگایا گیا ہے اس پر کوئی پرنٹ لائن نہیں اور نہ کوئی اتا پتا ہے، آخر پرنٹ لائن کیوں نہیں؟ کیا حکومت خود قانون شکنی اور غنڈہ گردی کو دعوت نہیں دیتی ہے،

۴۔ میں مسلمانوں کے فرقوں میں تفریق پیدا کرنے والوں اور پاکستان کی وحدت کے توڑنے والوں کو لعنتی سمجھتا ہوں یہ میرا ایمان ہے، لیکن جو گروہ خود ہی مسلمانوں کے دین سے الگ ہونے کا اقرار کرتا ہے اور جسے علمائے اُمت دائرہ اسلام سے خارج قرار دے چکے ہیں حکومت کا اس گروہ کے مسلمانوں کا حصہ ہونے پر مصر ہونا سیاسی شعبدہ بازی ہے۔

۵۔ الحمد للہ، قرآن پاک میں سورہ فاتحہ کا سرآغاز ہے، میرا ایک مختصر شذرہ الحمد للہ پریس اور اخبار دونو کی ضبطی کا باعث بنایا گیا ہے، لیکن جن لوگوں کے دفاع، ہمدردی یا حفاظت کے لئے یہ کیا گیا کیا ان کی کتابیں اسلام کے مسلمات اور مسلمانوں کے معتقدات کی دلازاری کا باعث نہیں ہیں؟

یہاں ان کی تحریروں کے اکثر حوالے بیان کئے گئے اور حکومت سے سوال کیا گیا کہ اس بارے میں وہ مُہر بلب کیوں ہے، قادیانی اُمت سے اس "تعلق خاطر" کی وجہ کیا ہے؟

۶۔ میں عقیدہ ختم نبوت سے متعلق اپنے جذبات ترک نہیں کر سکتا، میں اس کو دینی اور قومی وحدت کی بنیاد سمجھتا ہوں، میں اس لئے اپنے عقیدہ سے دستبردار نہیں ہو سکتا کہ حکومت ناراض ہوتی ہے یا مجھے کچل دینے کی اس کے پاس طاقت ہے اس نے جو کچھ کیا مجھے اس کی اتنی پروا بھی نہیں جتنی ماش کے دانے پر سفیدی ہوتی ہے، میرا سب کچھ ضبط ہو جائے اولاد تک موت کے گھاٹ اتار دی جائے مجھے دار کے تختہ پر کھنچوا دے لیکن اسلام سے اپنی وابستگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی شیفتگی ترک نہیں کر سکتا کروڑوں زندگیاں ہوں وہ بھی ان کی ذات پر قربان کی جا سکتی ہیں اور میں نے قربان ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔

۷۔ جس وزیر نے میرے خلاف پخت و پز کی ہے وہ اپنے پیشرووں سے عبرت حاصل کرے، آج وہ لوگ کہاں ہیں جو کوس لِمَنِ الْمُلْکُ بجاتے تھے، کرسی تو محض ایک لطیفہ غیبی ہے بلکہ اس سے بھی کمتر۔

۸۔ پیغمبروںؑ سے متعلق اصطلاحیں اور حضورؐ کے خاندان سے متعلق القابات اپنے خاندان پر چسپاں کر کے قادیانی توہین رسالت کے مرتکب ہوتے ہیں ان کے روزنامہ الفضل اور ان کے دل آزار خطبات سے کیوں باز پرس نہیں کی جاتی۔؟

۹۔ ہمیشہ وہی کتاب یا رسالہ ضبط کیا جاتا ہے جو قادیانی اُمت کے خلاف ہو کیا ان کی کوئی تحریر کوئی کتاب کوئی الہام کبھی ضبط کیا ہے؟ تاریخ محمودیت جس میں بحوالہ و اسناد میرزا بشیر الدین محمود کے جملہ خدو خال بیان کئے گئے کیوں ضبط کی گئی اس لئے کہ قادیانی، حکومت کی بعض کلیدی آسامیوں پر فروکش ہیں۔

ان تمام گستاخانہ تحریروں کا ذکر کیا جو "فرمودات" و "ملفوظات" کے زیر عنوان الفضل میں وقتاً فوقتاً چھپ چکے تھے، قادیانی اُمت سے متعلق علامہ اقبال کی تحریروں کے مختلف اقتباسات اور حکومت کے نام ان کی تجاویز کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ

علامہ اقبال نے اپنے آخری دنوں میں پنڈت جواہر لال کے نام جو خط لکھا ہے اس میں وہ کہتے ہیں کہ قادیانی اسلام ہی کے نہیں ہندوستان کے بھی غدار ہیں۔

۱۰۔ بہ قول اقبال

(ا) جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی اعتبار سے علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے پر کیوں مصر ہیں۔

(ب) ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا پورا حق ہے کہ قادیانیوں کو ان سے علیحدہ کر دیا جائے۔

(ج) مسیح موعود کی اصطلاح اسلامی (عربی) نہیں عجمی ہے۔

(د) قادیانیت کا خمیر اصل میں یہودیت کی طرف راجع ہے۔

(ی) قادیانیوں کے لئے صحیح راستہ یہی ہے کہ ایران کے بہائیوں کی تقلید کریں اور عقیدہ کے علاوہ عملاً بھی مسلمانوں سے الگ ہو جائیں۔

۱۱۔ وہ مسلمانوں میں صرف اس لئے شامل ہیں کہ ان میں رہ کر ان کے سیاسی حقوق پر قبضہ کرتے رہیں، چنانچہ تقریر میں اعداد و شمار پیش کئے گئے کہ جن محکموں پر ملک و قوم کی بقا و استحکام کا انحصار ہے ان میں ان کا تناسب کیا ہے؟ اور یہ کس طرح غلبہ کی حد تک ان محکموں میں گھسے ہوئے ہیں، اور ان کے پاس کونسی کلیدی آسامیاں ہیں۔

۱۲۔ قادیانی اُمت کے متعلق علامہ اقبال کی تحریروں کے اہم ترین اقتباسات کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کیا کہ ہمارا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ وہ پاکستان میں اقلیت کے طور پر رہیں، ہم ان کے ننگ و ناموس، جان و مال کو پاکستان کے شہری کی حیثیت سے یکساں سمجھتے ہیں، اور ان کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ ہم ان کے ننگ و ناموس یا مال و جان کے دشمن نہیں ایسا سوچنا بھی گناہ کبیرہ ہے یہ قانوناً، شرعاً، اسلاماً اور

اخلاقاً جرم ہے اور جو اس کا مرتکب ہو وہ قابل تعزیر ہے، ہمارا مطالبہ صرف ہے کہ انہیں مسلمانوں کی وحدت میں رہ کر اس کو سبوتاژ کرنے اور افراد اُمت میں نقب لگانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

چونکہ تقریر کئی اجزا کا مرقع ہوتی ہے مثلاً موضوع، مضمون، زبان، بیان، طنز، سلاست، ظرافت، شعر، بذلہ، تمثیل، تشبیہ، استعارہ وغیرہ اس لئے موقع کے مطابق یہ تمام چیزیں آتی رہیں حکومت کے عزائم پر نکتہ چینی کرتے ہوئے دوبارہ کہا میں اول مجھے گرفتار کرنا سے تو کھلا مقدمہ چلانا، ڈیفنس آف پاکستان رولز میں نظر بند نہ کرنا کہ ڈی پی آر اَ فردِ واحد کی فرمانروائی کے تحفظ کا نام ہو گیا ہے، دو ضمیر قریشی کی طرح مجھے ۱۰۵ نہیں کہا جا سکتا میرے ورثا کمزور نہیں ہیں۔

۱۳۔ افسوس کہ ہمارا مغرب زدہ طبقہ ختم نبوت کے مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت سے بالکل بے بہرہ ہے۔

۱۴۔ میں ہزار اختلاف کے باوجود، بیرونی دشمن کے مقابلہ میں ایوب خان اور موسیٰ خان کا ادنیٰ سپاہی ہو کر لڑوں گا تب سب اختلافات ختم ہو جائیں گے لیکن وہ کسی اندرونی دشمن کا ساتھ دیں گے تو میں اُن سے بھی لڑوں گا۔

میں نے جناب ایوب خان، جناب موسیٰ خان اور احمد سعید کرمانی پر کڑی تنقید کی، الطاف گوہر کی ذہانت پر بھی طبع آزمائی کی، ان روایتوں اور حکایتوں کا ذکر کیا جو حکومت کے اعضائے رئیسہ سے متعلق زبان زدِ عوام تھیں۔ یہ تقریر کوئی ڈھائی گھنٹہ جاری رہی، عوام سحر سا ہو گیا اور مسلسل نعرہ ہائے تکبیر و تحسین گونجتے رہے۔

حکومت کی طرف سے مسٹر افتخار احمد (سب انسپکٹر) اور مسٹر ضیا محمد بھٹہ نے شارٹ نوٹ لئے، جو ادھورے، ناقص، بے ربط اور مہمل ضرور تھے، لیکن اپنی طرف سے دو صاحبان نے کوئی قلم نہیں لگایا یا حک و اضافہ نہیں کیا تھا۔

گورنر صاحب پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھے تھے یہ تقریر ان کے ہاتھ بہانہ ہو گئی ، چٹان کے ڈیکلریشن کی تنسیخ اور پریس کی ضبطی سے متعلق کاغذات کا پیٹ بھرنے میں تین دن لگے تھے ۔ ۲۲ اپریل کو پرچہ محکمہ اطلاعات میں پہنچا ، مسٹر مسعود الرؤف نے اسی دن الحمد للہ کو قابل مواخذہ قرار دے کر قانونی رائے طلب کی ، مسٹر مسعود نبی نور ہوم سکریٹری اور مسٹر ایم ایم عثمانی سی ایس پی ڈپٹی سکریٹری ہوم (جنرل) نے بھی ضابطہ کے دستخط کئے ، مسٹر اختر محمد سیکشن آفیسر سپیشل نمبر ۳ نے ۲۳ اپریل کو نوٹ لکھا کہ " الحمد للہ " سے ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۵۲ کے تحت جاری کردہ احکام کی خلاف ورزی ہوئی ہے ، اس دفعہ کے تحت ۵ سال قید ، جرمانہ یا دونوں سزائیں ہو سکتی ہیں ، اخبار کی اشاعت کا تعطل یا بندش ویسٹ پاکستان پبلک آرڈر آرڈی ننس ۱۹۶۰ء میں بھی موجود ہے ۔ لیکن لاء ڈیپارٹمنٹ کی رائے لینے سے پہلے انفریشن سکریٹری جائزہ لے کر اپنی سفارشات سے آگاہ کریں ۔ مسٹر عثمانی سی ایس پی ڈپٹی سکریٹری نے اسی دن نوٹ لکھا ۔ ضروری نہیں کہ یہ کیس دوبارہ انفریشن سکریٹری کو بھیجا جائے ، لاء ڈیپارٹمنٹ اس کے متعلق جو ایکشن لینا چاہے وہ تجویز کر سکتا ہے ۔ ہوم سکریٹری نے لکھا کہ آج ہی لاء ڈیپارٹمنٹ سے مشورہ لیا جائے چنانچہ مسٹر عثمانی نے مسٹر چیمہ کو مارک کیا ، مسٹر کے ایم چیمہ ڈپٹی سکریٹری لاء نے اس پر ایک طویل نوٹ لکھا ۔ اور قانوناً تجویز کیا ۔

۱ ۔ جس شمارہ میں الحمد للہ چھپا ہے اُس کی تمام کاپیاں ضبط کر لی جائیں ۔

۲ ۔ اس شذرہ کی طباعت کے جرم میں پریس ضبط کر لیا جائے ۔

۳ ۔ چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا جائے ۔

۴ ۔ جو شخص مسئول ہے وہ ۵۲ (۷) ، ڈی پی آر کے تحت ۵ سال قید ، جرمانہ یا دونوں کی سزا کا مستوجب ہے ۔

ہوم سکریٹری نے ۲۵ اپریل کو یہ لکھ کر کہ ہوم منسٹر دورہ پر ہیں گورنر سے احکام حاصل کئے ، اور اُسی دن مجھ پر تعمیل ہو گئی ۔ لیکن نظر بندی کا مسئلہ طے کرنے میں صرف ایک دن لگا

اس سے زیادہ مستعدی حکومت نے شاید ہی کبھی دکھائی ہو۔ پاکستان میں تعزیر و احتساب کی پوری تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، حکومت گویا کمر باندھ کے اور خنجر تان کے بیٹھی تھی۔

۶ کی رات کو دو بجے تقریر اور سوا تین بجے کانفرنس ختم ہو گئی اگلے دن ۷ مئی کو ایک بجکر پینتیس منٹ پر سپیشل برانچ (پولیس) نے ہوم سکریٹری کو تقریر کا مسودہ بھیجا، ہوم سکریٹری نے لاء سکریٹری کو اسی وقت لکھا کہ یہ تقریر ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت قابل مواخذہ ہے یا نہیں؟ مسٹر شفیع الرحمٰن لاء سکریٹری نے اُسی دن فل سکیپ سائز کے پورے صفحہ پر اپنی رپورٹ لکھ کر سفارش کی کہ آغا شورش کاشمیری کو ۳۲ ڈیفنس آف پاکستان رولز میں نظر بند کیا جائے اور اگر یہ تجویز منظور ہو تو نظر بندی کی بنیادیں منسلک ہیں۔ لا منسٹر نے بھی سین (SEEN) لکھ کر دستخط کر دیئے، ہوم سکریٹری نے اس پر اڑھائی صفحہ کا طویل نوٹ لکھا کہ

"چٹان کے خلاف حکومت کے اقدام کی مذمت بلا تفریق نظریہ و خیال اپوزیشن کی سبھی پارٹیوں نے کی ہے، عوام کی ہمدردی بھی شورش کے ساتھ ہے، صوبہ بھر میں نماز جمعہ کے خطبات میں اس کی حمایت کی گئی ہے جرنلسٹوں کی مختلف جماعتوں نے بھی حکومت کی مذمت کی ہے۔ شورش کاشمیری اس مسئلہ کو ہائی کورٹ میں لے جا رہا ہے، اُس کی نظر بندی جلتی پر تیل ڈالنے کے برابر ہو گی اور اگر مقدمہ ہائی کورٹ میں گیا تو اس کو پریس میں بہت زیادہ پبلسٹی (Publicity) ملے گی، وہ ہیرو بن جائے گا، الیکشن نزدیک ہیں، بُرا اثر پڑے گا، بنا بریں میری تجویز یہ ہے کہ اس مسئلہ کو نظر انداز کر دیا جائے اور اگر یہ نہیں تو پھر شورش کاشمیری کو ۳۲ ڈیفنس آف پاکستان رولز میں بلا معیاد نظر بند کر دیا جائے۔"

مسٹر ایس آئی حق چیف سکریٹری نے صرف دستخط کیے قاضی فضل اللہ ہوم منسٹر نے لکھا۔

میری رائے یہ ہے کہ شورش کاشمیری کے خلاف کوئی ایکشن نہ لیا جائے ورنہ اس

مرحلہ میں اس کے اُلٹ نتائج پیدا ہوں گے اس کی گرفتاری حالات کی خرابی کا باعث ہوگی۔ گورنر سے التماس ہے کہ پریذیڈنٹ سے اُن کی آمد پر اس بارے میں مشورہ کر لیں، اگر ضروری ہو تو کچھ وزراء، چیف سکریٹری، ہوم سکریٹری، آئی جی پولیس کی میٹنگ بلائیں، صوبہ کے حالات پہلے ہی مخدوش ہیں۔

اُس دن شروع سے آخر تک فائل چکر کاٹتی رہی، ڈھائی بجے سرکاری دفتر بند ہوتے تھے ایک بج کر پینتیس منٹ پر ہوم سکریٹری کو تقریر کا مسودہ ملا اس پر ہوم سکریٹری، ماتحت عملا، لاء سکریٹری، لاء منسٹر چیف سکریٹری پھر ہوم سکریٹری اور ہوم منسٹر نے نوٹ لکھے اور یہ سب کچھ ایک ہی دن میں ہو گیا۔ گورنر نے لکھا کہ آغا شورش کاشمیری کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت نظر بند کر لیا جائے ساتھ ہی مسعود نبی نور نے تحریر کیا کہ

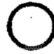
”گورنر کے احکام کی تعمیل کی جائے، گورنر نے مجھے مزید کہا ہے کہ شورش کاشمیری کو ڈیرہ اسمٰعیل خان جیل میں رکھا جائے۔ آرڈر جاری کر کے اس کی تعمیل سے فوراً مطلع کیا جائے۔“

چنانچہ اسی دن گورنر مغربی پاکستان کے حکم سے آغا عبدالکریم شورش کاشمیری عرف آغا شورش کاشمیری کو عوام کی حفاظت، ملک کے تحفظ اور مفاد پاکستان کے نام پر ۳۲ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیا گیا، سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل ڈیرہ اسمٰعیل خان کو ہدایت کی گئی کہ وہ آغا شورش کاشمیری کو اپنی تحویل میں رکھے ——— کلاس ”سی“۔

تین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس خان محمد اصغر خان (سول لائنز) مسٹر انصاری (پرانی انارکلی) اور مسٹر محمد شریف چیمہ (نیو انارکلی) نے پولیس کی ایک بھاری جمعیت لے کر مکان کا محاصرہ کر لیا۔ چاروں طرف مسلح پولیس! میں پہلے ہی سے تیار تھا۔ ایکا ایکی باہر آ گیا، پولیس کا خیر مقدم کیا، لحظہ بھر کے لئے یہ خیال ضرور آیا کہ جس آزادی کے لئے عمر گلا دی وہ انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو کبھی ادنیٰ عہدوں پر انگریز کے نوکر تھے، آج

پاکستان میں عوام کے آقا ہیں، ذوق نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گُل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے



ڈیرہ اسماعیل خان جیل

۸ رمئی شروع ہو چکی تھی، ڈیڑھ بجے رات پولیس نے گرفتار کیا، تینوں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مجھے انسپکٹر پولیس اور مسلح گارد کی سپردگی میں دے کر گھروں کو چلے گئے، میں ان کے ساتھ پولیس پک اپ میں سوار ہو گیا اور کوئی ڈھائی بجے رات راوی کا پل کراس کیا۔ سرگودھا پہنچنے تک دکانیں کھل رہی تھیں، وہاں سے میانوالی پہنچے، کھانا کھایا پھر کالاباغ، لکی مروت اور بنوں کے راستہ شام ڈھلنے کے وقت ڈیرہ پہنچ گئے۔ جیل کی گنتی بند ہو چکی تھی، قائم مقام ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسٹر سعد اللہ خان رجسٹروں پر دستخط کر رہا تھا، اس نے کہا۔

"میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہوں"

میں نے کہا "میں شورش کاشمیری ہوں"

میرے استغنا اور جواب پر اس نے خوشدلی سے صاد کیا اور ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ ڈیوڑھی کے ذرا سامنے تین کوٹھڑیوں کا ایک بلاک تھا اور یہ تینوں کوٹھڑیاں پھانسی کے اُدہرے سیل (دی CELLL) تھے۔ پہلا حصہ چھت کے بغیر تھا جس میں کراس گیٹ تھا، ڈپٹی نے مجھے پہلی کوٹھڑی میں بند کر دیا دوسری کوٹھڑی خالی تھی، تیسری میں قبائلی علاقہ کا ایک معمر شخص بند تھا، نام اس کا یاد نہیں رہا، غازی غازی کہتے تھے اب تک دو مقدمات میں موت کی سزا پا چکا، تیسرا مقدمہ بھی قتل ہی کا تھا، انتہائی غضبناک سپرنٹنڈنٹ ہو یا ڈپٹی کمشنر، سب اس کی زبان سے ڈرتے تھے، اس کی اپیلیں وغیرہ خارج ہو چکی تھیں، اب

صرف وقت کا انتظار تھا۔ یقینی تھا کہ وہ چند دنوں بعد تختہ دار پر ہوگا، لیکن اس کے حوصلے اور اس کی تمکنت میں کوئی فرق نہ آیا تھا، آواز میں کرارا پن، بنوں کا توں تھا، اس نے بلبل پال رکھا تھا، کچھ دن پہلے اس نے ضلعی افسروں پر برتن توڑے تھے، افسر اس کا لحاظ کرتے تھے کہ موت کا مسافر ہے، وہ سمجھتا تھا کہ وہ انہیں ڈراتا اور وہ اس سے ڈرتے ہیں۔

میں نے ڈپٹی سے کہا۔ میں چونکہ مختلف امراض کی پوٹ ہوں دواؤں کا ذخیرہ میرے ساتھ ہے ڈاکٹر کو بلوائیے اور انجکشن لگوا دیجئے۔ ڈاکٹر گھر جا رہا تھا میرا نام سنا تو فوراً آگیا۔ ڈپٹی سے کہنے لگا انہیں ہسپتال بھیج دو۔ ڈپٹی نے آنکھ ماری، چپ ہوگیا انجکشن لگانا چاہا میں نے کچھ سوچ کر صبح پر ٹال دیا۔ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ آگیا، معلوم ہوا اس کا نام محمد ایوب خان ہے، انگریزوں کے زمانے میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھا آج کل کلاس ۲ کا سپرنٹنڈنٹ ہے لیکن ڈیرہ اسمٰعیل خان میں قائم مقام سپرنٹنڈنٹ ہے، بنوں جیل کا اضافی چارج بھی اس کے پاس تھا وہیں کا رہنے والا ہے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان چونکہ کالا پانی کی حیثیت رکھتا ہے لہذا یہاں کوئی سپرنٹنڈنٹ نہیں آتا۔ حکومت نے سال بھر سے اسی کو لگا رکھا ہے، ملازمت میں توسیع بھی مل گئی ہے شاید کوئی خطاب بھی عطا ہوا ہے، عالی قسم کا سرکاری اہلکار ہے، وفاداری بشرط استواری اس کا پرنم دھرم ہے، صرف حکومت کے اشارہ پر چلتا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ نے رسماً مزاج پوچھا۔ میں نے کہا، ٹھیک نہیں ہے؟ مجھے یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟ سی کلاس دینے کا سبب کیا ہے؟ ابھی پارسال میں اے کلاس میں تھا؟ میں سزائے موت کا مجرم نہیں کہ آپ نے پھانسی کے سیل میں ڈال دیا ہے؟ میں نے تپاشپ کئی سوال کر ڈالے۔

سپرنٹنڈنٹ بولا۔

یہ بہتر جگہ ہے، سی کلاس آپ کو حکومت نے دی ہے۔

میں ۔ وارنٹ میں کہاں لکھا ہے ۔

وہ ۔ وارنٹ میں بہتر کلاس ہو تو لکھ دی جاتی ہے نہ لکھی جائے تو اس کا مطلب سی کلاس ہوتا ہے ۔

میں ۔ یہ آپ کی ذاتی توضیح ہے، حکومت سے وضاحت آنے تک آپ خود اے کلاس دے سکتے ہیں،

وہ ۔ نظر بندوں کے معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا، مجبور ہوں ۔

میں ۔ اچھا آرام کیجئے صبح دیکھیں گے۔

وہ چلا گیا لیکن دن ہونے تک مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں رہنا ہے تو ذرا تیور دکھا کے اور زبان کیسلی کر کے رہنا ہو گا۔ ثقہ روایت مل گئی کہ لاہور سے کسی وزیر نے سپرنٹنڈنٹ کو فون کیا تھا اور اس کو ٹھڑی میں رکھنے کی وجہ بھی یہی ہے، اسی راوی نے متنبہ کیا کہ کھانے پینے میں احتیاط کرنا جو شخص کھانا لاتے اس سے ہر چیز چکھا لینا اور یہ جو غازی ہے خطرناک شے ہے، مبادا اسے کوئی لالچ دیا ہو ورنہ یہاں قریب رکھنے کا مطلب کیا ہے ؟ سی کلاس ہی سہی لیکن سیاسی نظر بند کبھی پھانسی کی کوٹھڑی میں نہیں رہے،

میں نے سوچ لیا میری عمر اور بیماری سی کلاس کی متحمل نہ ہو گی، لانگری وہ قیدی جو روٹی تقسیم کرتا ہے، روٹی لایا تو میں نے لوٹا دی۔

ایک ہوشیار قیدی سب سے پہلے جیل میں وہاں کی آب و ہوا، افسروں کی سرشت، سپرنٹنڈنٹ کی خو بو، جیلر کی طبیعت سپرنٹنڈنٹ سے اس کے تعلقات، عام افسروں اور ملازموں کے مزاج و رجحان، میڈیکل سٹاف کی ذہنیت عام قیدیوں کے طور طریق وغیرہ سے متعلق معلومات حاصل کرتا پھر اپنے لئے قید بسر کرنے کا طریق سوچتا ہے۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان سرحد کی سب سے خراب اور سب سے پرانی جیل ہے، ایک

صدی سے زائد مدت ہو چکی ہے اور ابھی تک اس کی عمارت وہی ہے، یہاں سانپ بھی ہیں ایک دو قیدی ڈسنے سے ہلاک ہو گئے کسی زمانہ میں سرحد کی جیلیں قصاب خانے تھے بلکہ انگریزوں نے استبداد کے قلعے بنا رکھے تھے، لیکن ڈاکٹر خان صاحب نے پہلی دفعہ وزارت بنائی تو جیل خانوں کا مزاج بدل دیا، انسانی برتاؤ کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ جتنی آزادی سرحد کی جیلوں میں آج ہے پنجاب کی جیلوں میں اس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، پنجاب میں جیل خانے کے مصائب برداشت کرنے والے حکمران ہوتے تو اصلاحات ممکن تھیں لیکن آزادی کے بعد وہی لوگ حکمران رہے جو قید و بند سے ناآشنا تھے بعض سرکاری وزیر تھے اور اب زمانہ نے انہیں وزیر بنا دیا تھا ــــــ ان سے اصلاح احوال کی توقع عبث تھی، جتنی اصلاحیں پنجاب کی جیلوں میں ہوئیں وہ لالہ بھیم سین سچر کی وزارت کے زمانہ میں ہوئیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد دو یا تین دفعہ ریفارمز کمیٹیاں بنائی گئیں لیکن اول تو انہوں نے اپنے ــــــ معاوضہ کی مدت دراز کی دوم ان کی رپورٹیں متروکات سخن ہو گئیں۔ پنجاب جیلوں میں افسروں کا یہ مزاج کبھی نہیں بدلا کہ قیدی آدمی نہیں ہوتا، کبھی سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ۔ اور ان کے ماتحت آفیسر قیدیوں کو وحشیوں کی طرح سڑاتے اور ان کی موت کا باعث ہوتے ہیں۔ کوئی رو رعایت ہے تو صرف اس وجہ سے اور وہ بھی سیاسی نظربندوں کے ساتھ کہ جیل خانے کے اہل کار اپنے جرائم سے ڈرتے ہیں، سرحد کی جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ توہین آمیز سلوک مطلق نہیں ہوتا اور نہ پٹھان برداشت کرتے ہیں، کوئی افسر کسی قیدی کو گالی نہیں دیتا، پٹائی نہیں کراتا اور نہ کسی پر جسمانی ظلم کیا جاتا ہے۔ البتہ رشوت ہر جگہ ہے۔ جیل کے افسر قیدیوں کا راشن کھائے بغیر رہ نہیں سکتے ڈیرہ جیل میں تو قیدیوں نے سپرنٹنڈنٹ سے ذہنی سمجھوتہ کر رکھا تھا کہ ہم صحیح راشن کا مطالبہ نہیں کرتے تم ہماری آزادی میں مداخلت نہ کرو۔ ان کی آزادی کیا تھی یہ کہ ان کی تلاشی نہ لی جائے اور نہ کسی معاملہ میں انہیں ٹوکا جائے۔ جتنی گندی روٹی ڈیرہ اسمٰعیل

خان جیل میں تھی کسی جیل میں دیکھی نہ سنی اس کے عوض ان قیدیوں نے کیا حاصل کر رکھا تھا چرس، چائے، چولہے اور کھانا پکانا، وہاں مختلف ٹکڑیوں یا قبیلوں کے سربراہ تھے جنہیں ان کی زبان میں مُشر کہتے ہیں، فائدہ اس کا صرف معتبر یا متمول قیدیوں کو تھا جن کی تعداد سو میں دس ہوگی یا پھر ان کے لگے بندھے۔ عام قیدی گھاٹے میں رہتے انہیں وہی زہر مار کرنا پڑتا جو لنگر میں تیار ہو کر ان میں تقسیم ہوتا سالن کیا پانی جس میں نمک مرچ ڈال کے تڑکا لگا ہوتا۔ ایسا شوربا تو کتے بھی نہ چاٹیں۔ جیل خانہ کے ہسپتال کا معاملہ اس سے بھی خراب تھا، دوائیں انڈنٹ ہوتیں لیکن کچھ آجاتیں اکثر کیمسٹ کے پاس رہ جاتیں، بل، وصولی، رسید ادائیگی سب کچھ صحیح لیکن دوائیں ندارد پھر قیدیوں کے نام پر بیشتر دوائیں افسروں کے اہل کنبہ کی بیماریوں میں اُٹھ جاتی ہیں۔

ایک چیز جو یہاں انوکھی نظر آئی وہ قیدیوں کی ایت دار ہے، ایت دار کو کھاتے پیتے گھرانوں کے خوش مزاج قیدی گھریلو کپڑے پہن کر بانہوں میں بانہیں ڈالے ٹہلتے پھرتے ہیں جو نوجوان خوبصورت ہوا انہیں کوئی مشر یا معتبر دل کے اٹکاؤ کے لئے ساتھ رکھتا ہے اور وہ اُس کی چیز سمجھا جاتا ہے کوئی خلل ہو تو چاقو چل جاتے ہیں ایک خوش شکل نوجوان کے متعلق معلوم ہوا کہ اس کا چہرہ اس کے لئے مصیبت بن گیا ہے اب تک وہ تین دفعہ صرف چہرے پر زخم کھا چکا تھا۔ ڈیرہ سنٹرل جیل ایسی جگہ ہے کہ بعض لوگ گرفتار ہو کر دو دو تین تین سال تک حوالات میں پڑے رہتے ہیں پولیس ابتدائی تفتیش مکمل نہیں کر پاتی کئی دیہہ نوجوان پڑے پڑے گل جاتے ہیں۔ افغانوں کی مخصوص چلم بھی معتبر قیدیوں کے پاس ہوتی ہے کبھی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آتے اور کش لگاتے ہیں، یہ سب کچھ مجھے دو چار روز میں معلوم ہو گیا۔

لانگری نے رپورٹ کی کہ نظر بند نے کھانا نہیں لیا تو پہلے وارڈ آیا میں نے کہا تمہارے منصب سے اُونچی چیز ہے، وہ چلا گیا تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آگیا، میں نے کہا

یہ بتائیے آپ نے یہاں کیوں رکھا ہے؟

اتنے میں سپرنٹنڈنٹ آگیا، میں نے رسید ہی نہ دی کچھ دیر کھڑا رہا پھر پوچھا۔

"آپ نے کھانا چھوڑ دیا ہے"؟

میں ۔"جی ہاں"

سپرنٹنڈنٹ :"کیوں"

میں :"اس بدتمیزی کے خلاف جو حکومت نے میرے ساتھ کی ہے"

سپرنٹنڈنٹ :"کونسی بدتمیزی"؟

میں ۔"یہ سی کلاس، یہ پھانسی کی کوٹھڑی یہ "کالا پانی" کوئی آ سکے نہ مل سکے۔"

سپرنٹنڈنٹ ۔ لیکن یہ فیصلہ تو حکومت نے لاہور میں کیا ہے۔

میں ۔ میں نے اسی فیصلہ کے خلاف بھوک ہڑتال کی ہے۔

سپرنٹنڈنٹ ۔ لیکن یہاں نظم میرا ہے۔

میں ۔ تو پھر؟

سپرنٹنڈنٹ ۔ کھانا کھا لیجئے۔

میں۔ ہرگز نہیں۔

سپرنٹنڈنٹ ۔ یہ جرم ہے

میں ۔ کوئی جرم نہیں

سپرنٹنڈنٹ ۔ جیل مینول کی رو سے مقدمہ چل سکتا ہے،

میں ۔ سو دفعہ! چشم ما روشن دل ما شاد

سپرنٹنڈنٹ چونکہ چنانچہ کرنے لگا،

میں نے ذرا ترش ہو کر اس سے کہا،

خان صاحب، آپ پٹھان ہیں، میں آپ کا مہمان ہوں، پٹھان بڑے بہادر

ہوتے ہیں وہ ایک وزیر کے فون پر یہ حرکت نہیں کرتے جو آپ نے کی ہے،

سپرنٹنڈنٹ ۔ کونسا وزیر؟

میں ۔ جس نے آپ کو فون کیا ہے

اس نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اسے کیونکر معلوم ہوا، بہرحال اس کے متغیر چہرے نے تصدیق کر دی کہ جو روایت مجھ تک پہنچی ہے درست ہے،

سپرنٹنڈنٹ جانے لگا تو میں نے روک لیا۔

" خانصاحب! اس غلط فہمی میں نہ رہیئے گا کہ میرا کوئی والی وارث نہیں، وہ قیدی جس کو پھانسی کی سزا ہوئی ہے اور میرے ساتھ کی کوٹھڑی میں پڑا ہے آپ اُس کو رہائی کا لالچ دے کر مجھے مروانا چاہتے ہیں ـــ ایسی ویسی کوئی حرکت ہوئی تو آپ پھانسی پا جائیں گے، اور کسی وزیر کے کہنے پر قواعد نظر بندی کی خلاف ورزی کی تو آپ قید ہونے سے نہیں بچ سکتے،"

وہ دہل گیا اسے اندازہ ہو گیا کہ آدمی سخت ہے مجھے یہ رنج نہیں تھا کہ سی کلاس دی گئی ہے رنج یہ تھا کہ جن لوگوں کا آزادی میں کوئی حصہ نہیں اور جو عمر بھر انگریزوں کے نوکر رہے ہیں وہ آزادی اغوا کر کے اُن لوگوں کی توہین کرتے ہیں جن کی بدولت غیر ملکی غلامی کے بندھن ٹوٹے اور پاکستان و ہندوستان آزاد ہوئے ، میں جن لوگوں کے حکم سے پکڑا گیا وہ کیا تھے؛ سب کچھ ہوں گے لیکن جب تک انگریزوں کا غلام تھا وہ انگریزوں کے تنخواہ دار تھے، میرا دل کھولنے لگا کہ آزادی کے بعد بھی ہماری توہین کی جاتی ہے،

مجھے سی کلاس میں رکھنے کے خلاف ہر طرف شور مچ گیا۔ قیدیوں کی ہمدردی قدرتاً میرے ساتھ تھی وہ نمبردار جو سپرنٹنڈنٹ وغیرہ سے منسلک تھے اُن کی وجہ سے بعض مشکلیں حل ہو گئیں۔ خود میں نے کسی سے کوئی خواہش نہ کی وہ خود ہی رضاکارانہ طور پر

پیام وسلام لانے اور لے جاتے رہے۔ ہر آدھ گھنٹہ بعد مجھے اطلاع مل جاتی کہ باہر کیا ہو رہا ہے، سپرنٹنڈنٹ گھبرا گیا، بڑا تہلکہ اس خط نے مچایا جو میں نے دوسرے ہی دن خواجہ صادق کاشمیری کو رجسٹرڈ بھیجا تھا۔ ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا تو ایڈووکیٹ جنرل نے بہتیرا شور مچایا کہ مصدق نہیں، مصدق سے اُس کی مراد تھی کہ اس پر سپرنٹنڈنٹ وغیرہ کے دستخط ہونے چاہئیں، نظر بندوں کے خطوط افسر مجاز کے دستخط اور اُس کی مُہر لگ کے آتے جاتے تھے یہ خط بالا بالا بھیجا گیا جسٹس بشیر الدین خان اور جسٹس شوکت علی پر مشتمل ڈویژن بنچ نے ایڈووکیٹ جنرل کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے خط کو مقدمہ میں شامل کر لیا۔ وہ خط حسب ذیل تھا۔

عزیزم

سلام مسنون

کالا پانی ہے مجھے پھانسی کی کوٹھڑی میں رکھا گیا ہے، سلوک سی کلاس اخلاقی قیدیوں سے بدتر ہے، میں نے پہلے دن ہی سے بھوک ہڑتال کی ہوئی ہے جان کا سخت خطرہ ہے، پروا بالکل نہیں، کرمانی نے یہاں فون کر کے ہدایات جاری کی ہیں۔

شورش کاشمیری

میں نے یہ خط وارڈروں کی آنکھ میں دھول ڈال کے جس طرح لکھا اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہیں جیل خانہ کی سنگینی کا تجربہ ہے۔ جس نوجوان نے یہ کام کیا اس نے غایت درجہ دلیری کا ثبوت دیا وہ اپنی عمر قید کا بڑا حصہ گزار چکا تھا پکڑا جاتا تو اس کی ریمیشن کے تین سال کٹ جاتے لیکن اس نے ذرہ بھر پروا نہ کی۔

پنجاب اور سرحد میں جلسوں پہ جلسے شروع ہو گئے، اپوزیشن نے حکومت پر کھلم کھلا تنقید کی، خطیبوں نے جمعہ کے خطبات میں آڑے ہاتھوں لیا ڈیرہ والوں نے اس زناٹے

سے جلسے کئے کہ حکام نے علما کو بلا کر یقین دلایا کہ وہ گورنر کو صورت حال سے مطلع کر رہے ہیں آپ ابھی ٹیلیشن نہ کریں، چند دن میں سب اچھا ہو جائے گا۔ بھوک ہڑتال کے دوسرے یا تیسرے روز ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر اور ان کے ہمراہ ایک سپشلسٹ آ گئے ڈپٹی کمشنر بھی وارد ہوتے، اپنی کہی میری سنی، نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات، بھوک ہڑتال چھوڑنے کا اس وقت تک سوال ہی نہیں تھا جب تک حکومت اسے کلاس نہ دے، میں ہر لحاظ سے بہتر کلاس کا حقدار تھا، میں طیش میں تھا کہ میری توہین کا حکومت نے حوصلہ کیسے کیا جہاں تک ڈپٹی کمشنر، ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر اور سپشلسٹ کا تعلق تھا وہ انتہائی نیک نفس، خوشگوار اور عجیب الطبع لوگ تھے، نام یاد نہیں رہا لیکن ڈی سی ایک مشہور سرحدی شاعر کے بیٹے تھے، ان میں سی ایس پی کے افسروں کی روایتی نخوت کا شائبہ تک نہ تھا پھر اڈال کے چلے گئے، وہ اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتے تھے ان کا کام ان خدایان مجاز کو رپورٹ دینا تھا جو لاہور میں فرعون بن کے بیٹھے تھے۔

قواعد کی رو سے سپرنٹنڈنٹ جیل کسی نظر بند کا کوئی تار، درخواست، خط جو ہائیکورٹ یا سپریم کورٹ کے نام ہو روک نہیں سکتا اسی طرح حکومت کے نام بھی کوئی سا خط بشرطیکہ اہانت آمیز نہ ہو وہ روکنے کا مجاز نہیں میں نے اپنے روپے سے مندرجہ ذیل تار دیئے۔

(۱)

چیف جسٹس ہائی کورٹ مغربی پاکستان لاہور

مجھے بلیک ہول کی روایتی سیل میں رکھا گیا ہے میرے ساتھ سی کلاس کے اخلاقی قیدیوں کا سا سلوک ہو رہا ہے میری زندگی سخت خطرہ میں ہے میرے بچوں کو اطلاع کی جائے کہ میں آخری وصیت لکھوانا چاہتا ہوں مقامی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہدایت فرمائیں کہ وہ اس قتل عمد کے سلسلہ میں میرا بیان لیں صوبائی حکومت سے کوئی التماس کرنا عزت نفس کے منافی ہے اس لئے عدل کے دروازہ پر دستک دے رہا ہوں۔

شورش کاشمیری

۹/۵/۶۸

بارہ مئی کو یعنی بھوک ہڑتال کے پانچویں دن مولانا تاج محمود کو حسب ذیل تار دیا۔

میرے ساتھ اخلاقی مجرموں کا سلوک کیا گیا ہے میں نے احتجاجاً تا عین حیات بھوک ہڑتال کر دی ہے۔

شورش کاشمیری

۱۲ / ۵ / ۶۸

اسی مطلب کا ایک تار ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ لاہور کو دیا، ۱۳ مئی کی صبح کو ایک طویل تار جسٹس ایس اے رحمٰن چیف جسٹس سپریم کورٹ کے نام ارسال کیا۔

حکومت مغربی پاکستان نے کسی عدالت سے قانونی فیصلہ حاصل کئے بغیر میری آمدنی کے ذرائع قتل کر دیتے ہیں چٹان ضبط کر لیا ہے ڈیکلریشن منسوخ کر ڈالا اور پریس پر قبضہ کر کے بحق سرکار سر بہ مہر کر دیا ہے میں اپنے گھر سے چار سو میل دور مقید ہوں میرے لئے حصول انصاف مشکل ہے میرے ساتھ سی کلاس کے اخلاقی مجرموں کا سلوک ہو رہا ہے میری حیثیت کے مطابق ابھی تک مجھے بہتر کلاس نہیں دی گئی میری زندگی خطرہ میں ہے تاریخ میں اس بہیمیت کی مثال نہیں میری غیر حاضری میں ٹریبونل میرا کیس کیونکر سن سکتا ہے جج عدل الٰہی کی نیابت کرتے ہیں آپ کی معرفت سپریم کورٹ کے دروازہ عدل پر اس غیر انسانی برتاؤ کے خلاف دستک دے رہا ہوں۔

شورش کاشمیری

۱۳/۵/۶۸

سولہ مئی کو ذیل کا تار جسٹس بشیر الدین خان اور جسٹس شوکت علی کے نام ارسال کیا۔

مسٹر احمد سعید کرمانی دستور کے آرٹیکل ۷ اکی پناہ لیتے ہیں میں صرف

کورٹ آف لا کی پروٹیکشن چاہتا ہوں اگر فاضل جج ان اجازت دیں تو میں اپنے بارے میں ایک سو ایک دفعہ اس کی دشمنی ثابت کر سکتا ہوں۔

شورش کاشمیری

۱۶/۵/۶۸

پانچویں روز پھانسی کی اس کوٹھڑی سے نکال کے مجھے جیل کے ہسپتال میں رکھا گیا وہاں میرے لئے جیل کے میڈیکل آفیسر کا دفتر خالی کرایا گیا، ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ نے اس سلسلہ میں ایڈووکیٹ جنرل کو ہدایت کی کہ حکومت سے توثیق کرائے آیا شورش کاشمیری کو اے کلاس دی گئی ہے یا نہیں؟ بیماری کے متعلق بنچ نے استفسار کیا کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں علاج کی سہولتیں کیا ہیں؟ ایڈووکیٹ جنرل نے جواب دیا کہ حکومت نے علاج کے لئے ضروری سامان ڈیرہ بھجوا دیا ہے اور راولپنڈی سے معائنہ کے لئے ایک سپیشلسٹ بھی جا رہا ہے، ہائی کورٹ نے ہدایت کی کہ نظر بند کو علاج کی سہولتوں کے لئے پنڈی یا پشاور بھیج دیا جائے۔ گورنر موسیٰ نے احکام جاری کئے کہ نظر بند کو سول ہسپتال راولپنڈی بھیج دیا جائے۔

ساتویں روز مولانا صلاح الدین احمد مدیر ادبی دنیا کے فرزند مسٹر وجیہہ الدین کمشنر ڈیرہ اسمٰعیل خان معہ ڈپٹی کمشنر میرے پاس آئے، میرے دل میں کئی وجوہ سے ان کا احترام تھا ـــــ رسمی مزاج پرسی کے بعد فرمایا۔

"یہ بھوک ہڑتال ترک کیجئے"

"میں نے ہنس کے ٹال دیا"

"آپ ذیابیطس کی وجہ سے سخت بیمار ہیں، ڈاکٹروں کی رپورٹ ہے کہ آپ پر کسی وقت بے ہوشی حملہ کر سکتی ہے

"ہر چہ بادا باد"

"اچھا تو آپ پہلے بھوک ہڑتال چھوڑ دیں ابھی اسے کلاس دے دوں گا"

"پہلے کلاس پھر کچھ اور"

وجیہہ اصرار کرنے لگے میں نے ان سے کہا، آپ مولانا صلاح الدین کے نور نظر ہیں میرے دل میں آپ کا احترام ہے، اصرار نہ کیجئے میں اپنے فیصلے نہیں بدلا کرتا۔"

وہ کہنے لگے اچھا، آپ بھوک ہڑتال چھوڑ دیں ابھی اسے کلاس کے احکام جاری کرتا ہوں، ایک لقمہ لیں۔

میں نے کہا، پہلے کلاس پھر لقمہ۔

انہوں نے سپرنٹنڈنٹ کو احکام لکھوائے۔

۱۔ آغا شورش کاشمیری کو گورنر مغربی پاکستان کے احکام پر اے کلاس دی جاتی ہے۔

۲۔ نظر بند کو فوری طور پر راولپنڈی سول ہسپتال میں بغرض علاج منتقل کیا جائے۔

کمشنر نے احکام پر دستخط کئے مجھ سے مصافحہ کیا اور چلے گئے، سپرنٹنڈنٹ نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن حکومت اگلے ہی روز سول ہسپتال راولپنڈی بھجوانے سے پھر گئی، حکومت نے ہائی کورٹ میں یہ کہنا شروع کیا تھا کہ نظر بند کو لاہور لانے یا پنجاب کے کسی جیل میں منتقل کرنے سے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ خواجہ محمد صفدر، ملک محمد اختر اور مسٹر حمزہ نے تین تحریکیں نظر بندی پر بحث کرنے کے لئے پیش کیں لیکن سپیکر نے اس عذر پر مسترد کر دیں کہ معاملہ ہائی کورٹ میں ہے۔ ۷ا مئی کو خواجہ محمد صفدر کی تحریک التوا پر قاضی فضل اللہ وزیر داخلہ نے انٹ شنٹ کہہ ڈالا حالانکہ قاضی صاحب اندر خانہ میری گرفتاری کے خلاف تھے اور میرے عزیزوں سے کہہ چکے تھے کہ شورش کے خلاف جو کچھ ہوا وہ ایک شخص کی حماقت سے ہوا ہے، ایوب خاں کا دور لد گیا، وزارتیں غفرلہ ہو گئیں تو جو کچھ ہوا تھا وہ قاضی صاحب نے خود مجھ سے بیان کیا اور بتایا کہ میں تو اس اقدام کے سخت خلاف تھا لیکن سنتا کون تھا۔ قاضی صاحب نے ایوان میں جو کچھ کہا نوائے وقت

۱۸ مئی کی رپورٹ کے مطابق یہ تھا کہ

۱۔ آغا شورش کاشمیری کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ انہیں جیل میں اے کلاس دی جاتی بہرکیف گورنر مغربی پاکستان کی ہدایت پر انہیں بطور خاص اے کلاس دی گئی ہے۔

۲۔ علاج کے لئے ڈیرہ اسمٰعیل خان میں مناسب طبی سہولتیں میسر ہیں لہذا نظر بند کو کسی اور جگہ منتقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

۳۔ حکومت اس بات سے آگاہ نہیں تھی کہ آغا شورش کاشمیری ذیابیطس کے مریض ہیں جب حکومت کو پتہ چلا کہ ان کو ذیابیطس کا دورہ پڑا ہے تو انہیں علاج کی سہولتیں مہیا کر دی گئیں۔ لیکن آغا شورش کو یہ دورہ اس وقت پڑا جب انہوں نے حکومت کو "بلیک میل کرنے کی غرض سے" جیل میں بھوک ہڑتال کی تھی۔

گورنر نے ۱۳ مئی کو حکم جاری کیا کہ شورش کاشمیری کو اے کلاس میں رکھا جائے پریس نوٹ کے مطابق یہ کاروائی انسانی بنیادوں پر کی گئی خبر میں یہ بھی تھا کہ شورش کاشمیری کو ڈیرہ اسماعیل خان سے راولپنڈی منتقل کر دیا گیا ہے۔

حکومت نے تلافی کی لیکن پرسٹیج کے ساتھ اور اس لکھنوی بالم کی طرح جس نے چھوٹے بھائی کو طعن دیتے ہوئے کہا تھا کہ بالائی تو ہم بھی کھاتے ہیں لیکن ایرے غیرے پچ کلیان سے نہیں واجد علی شاہ کے مٹیا محل میں۔

حکومت نے ایسا جرم کیا تھا کہ اُسے ہائی کورٹ کا سامنا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ داستان تو مرافعہ کے ذکر میں آئے گی کہ حکومت نے کس طرح ججوں کو متاثر کرنا چاہا اور ایڈووکیٹ جنرل کیونکہ ہائی کورٹ کی توہین کا مرتکب ہوا لیکن یہاں جنرل موسیٰ کا ایک لطیفہ نقل کر دینا دلچسپی کا باعث ہو گا۔ وہ گورنر ہو کر آئے تو سرکار کے خلاف ہائی کورٹ کے کسی فیصلے پر ایک دوست سے کہا:

"عجب جج ہیں، تنخواہ سرکار سے لیتے اور فیصلے بھی سرکار کے خلاف کرتے ہیں"۔

میں نے وزیر داخلہ کے "ارشادات" پڑھے تو انہیں فوراً خط لکھا۔

قاضی صاحب محترم،

سلام مسنون، آپ نے اسمبلی کے ایوان میں، امیّ کو میرے متعلق جو الفاظ کہے ہیں وہ آپ جیسے اصلیت سے واقف سیاست دان کو زیب نہیں دیتے آپ عمر کی اس منزل میں ہیں کہ اس حکومت کا دفاع عاقبت کے بھی خلاف ہے، حکومت جانتی ہے کہ میں بیمار ہوں اسی حکومت نے مجھے پچھلی نظر بندی میں اے کلاس دی تھی اور یہ میرا قانونی حق تھا میری حیثیت کا فیصلہ وہ لوگ کیسے کر سکتے ہیں جو خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے، میں ان کی حیثیتوں سے بخوبی واقف ہوں میں ایسی حکومت کے ساتھ جینا ہی نہیں چاہتا، بلیک میل کیا ہوتا ہے؟ وہ لوگ جو خود بلیک میل کی پیداوار ہیں، اس قسم کے الفاظ بولتے ہوئے حیا محسوس نہیں کرتے، میں نے اپنی عزت کے لئے جان کی بازی لگائی ہے، روٹ پرمٹ لائسنس یا اراضی لینے کے لئے نہیں، کہ وابستگانِ سرکار کی اکثریت کا دامن ان آلودگیوں سے داغدار ہے،

حکومت میں جرأت ہے تو وہ اے کلاس کی رعایت واپس لے اور پھر اس کا نتیجہ بھگتے۔

شورش کاشمیری

اس خط کی ایک نقل سپرنٹنڈنٹ جیل کو دے دی کہ فوراً ہی وزیر داخلہ کو پہنچا دے دوسری نقل بالا بالا رجسٹرڈ لفافہ میں پوسٹ کر دی گئی۔

قاضی صاحب نے کرم کیا کہ اس کے بعد پھر کبھی میرا ذکر نہ کیا پریس نوٹ میں جن انسانی بنیادوں کا ذکر تھا لوگ جانتے ہیں کہ سرکاری کمیونک اور پریس نوٹ کیا ہوتے ہیں۔

انسانی بنیادوں سے حکومت کو اتنا ہی تعلق ہوتا ہے جتنا سیاہی سے سپیدی کو۔

یہ بات آچکی ہے کہ راولپنڈی منتقل کرنے کے فیصلہ سے حکومت منحرف ہوگئی اس نے مجھے ختم کرنے کے لئے ڈیرہ اسمٰعیل خان بھجوایا تھا وہ کہیں اور کیونکر بھیج سکتی تھی ۷ ،امئی کو لاہور ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ نے مجھے پشاور جیل بھیج دینے کا حکم صادر کیا اور ساتھ ہی یہ بھی آرڈر کیا کہ نظر بند ۲۸ مئی کو عدالت میں حاضر کیا جائے۔ حکومت نے سپریم کورٹ میں اپیل داغ دی کہ نظر بند کو پشاور منتقل نہ کیا جائے اور نہ اس کو لاہور لایا جائے کیونکہ لاہور یا پشاور میں اس کے منتقل ہونے سے حالات بگڑ جانے کا احتمال ہے۔ سپریم کورٹ نے حکومت کی بات مان لی اور حکم امتناعی جاری کر دیا کہ شورش کاشمیری کو پشاور منتقل نہ کیا جائے، غرض حکومت نے زبردست کوشش کی کہ میں ڈیرہ اسمٰعیل خان جیل ہی میں رہوں، اس نے چھوٹی چھوٹی بات پر کہ اس سے پہلے کسی سیاسی مقدمہ میں اس کی نظیر نہیں ملتی ڈویژن بنچ کے راستہ میں روڑے اٹکائے، کبھی منتقلی کبھی اخراجات کبھی گواہوں اور کبھی اختیار سماعت کی آڑ میں سپریم کورٹ تک پہنچی۔ جسٹس بشیر الدین اور جسٹس شوکت علی کو رام کرنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو کر ۲۳ مئی کو مغربی پاکستان کے چیف جسٹس وحید الدین احمد کی عدالت میں درخواست گزاری کہ مقدمہ کراچی منتقل کر دیا جائے۔ کمشنر پشاور، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس پشاور کے حلفی بیان داخل کئے گئے کہ پشاور میں سماعت ہوئی تو امن عامہ میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا، چیف جسٹس نے حکومت کی استدعا منظور کر لی لیکن حکم دیا کہ جو بنچ اس وقت یہاں سماعت کر رہا ہے وہی کراچی میں سماعت کرے، ۲۸ تاریخ کو شورش کاشمیری کو لاہور لانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ وکلا اس تاریخ کو پیش ہوں، کراچی کے لئے جو تاریخ مقرر کی جائے وہاں اس روز آغا شورش کاشمیری کو پیش کیا جائے۔ میری اہلیہ نے چیف جسٹس کی عدالت میں حلفی بیان داخل کیا کہ حکومت کی استدعا مان لی گئی تو انہیں انتہائی مالی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، اس

کے علاوہ جو وکلا یہاں پیش ہو رہے ہیں انہوں نے کراچی جانے سے معذوری ظاہر کی ہے، اس کے علاوہ سائلہ کی بچیاں اسکول میں پڑھتی ہیں ان کی تعلیم معطل ہو جائے گی، چیف جسٹس نے حکم دیا کہ حکومت ہفتہ کے اندر اندر عدالت عالیہ میں دس ہزار روپیہ جمع کرائے جو سائلہ کو کراچی میں مقدمہ کی پیروی کے لئے بطور اخراجات دیا جائے، اس رقم میں سے سردست دو ہزار روپیہ دیئے جائیں۔[1]

۲۸ مئی کو ڈویژن بنچ نے حکم دیا کہ ۳ جون پیر کے روز کراچی میں شورش کاشمیری کو حاضر عدالت کیا جائے، میری اہلیہ نے سپریم کورٹ میں اپیل کی کہ مقدمہ کراچی منتقل کئے جانے کا حکم کالعدم کر دیا جائے، مسٹر جسٹس فضل اکبر، مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن اور مسٹر جسٹس سجاد احمد جان نے اپیل خارج کر دی اور کراچی میں سماعت کا حکم بحال رکھا، ۳ جون کو ڈویژن بنچ کراچی نہ پہنچ سکا لیکن لاہور میں اس روز حکومت کے اس موقف کو مسترد کر دیا کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۱۰ (۳) میں ترمیم اور میر عبدالباقی بلوچ کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے باعث ہائی کورٹ نظر بندی کے وجوہ جاننے کا مجاز نہیں اور نہ اس کو ملکی آئین کے آرٹیکل ۹۸ کی رو سے بھی اس مقدمہ کی سماعت کا اختیار ہے، ڈویژن بنچ نے آئندہ سماعت کے لئے ۲۳ جون کی تاریخ مقرر کی اور حکومت کو ہدایت کی کہ وہ گواہوں کے اخراجات اور صفائی کے وکیل کی فیس وغیرہ کے لئے پچاس ہزار روپیہ جمع کرائے، سرکاری وکیل نے اس رقم پر اعتراض کیا لیکن عدالت نے مسترد کر دیا کہ حکومت نے مقدمہ کے تمام اخراجات برداشت کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔

۱۳ جون کو صوبائی حکومت نے پخت و پز کے بعد سپریم کورٹ میں اس نکتہ پر اپیل

---

[1] حکومت کو زچ کرنے کے لئے اس قسم کے مطالبات کئے گئے لیکن ہم نے ایک دمڑی لینا بھی اپنے فقرِ غیور کی توہین سمجھا، اور کسی مرحلے میں حکومت سے کوئی پیسہ وصول نہیں کیا۔

کر دی کہ ہائی کورٹ نظر بندی کے وجوہ معلوم کرنے کا مجاز نہیں اس کے علاوہ پچاس ہزار روپے اور گواہوں کی طلبی وغیرہ روک دینے کی درخواست کی۔

سپریم کورٹ نے ۱۸ جون کو حکومت کا موقف سماعت کیا اور ہائی کورٹ کے احکام تا فیصلہ موقوف کر کے ۹ ستمبر کی تاریخ ڈال دی کہ سپریم کورٹ اس روز کراچی میں سماعت کرے گا، چیف جسٹس مسٹر فضل اکبر، مسٹر جسٹس یعقوب علی مسٹر جسٹس سجاد احمد جان اور مسٹر جسٹس عبد الستار بنچ کے ارکان تھے۔ گویا جس انصاف کو ہم تلاش کرنے نکلے تھے وہ حکومت کی بزدلانہ اڑچنوں کے باعث ۸ دن کم تین ماہ کے لئے ملتوی ہو گیا۔ اس وقت مجھے جسٹس حمود الرحمٰن کا وہ تاریخی فقرہ یاد آرہا تھا کہ انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار کے مترادف ہے۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان سنٹرل جیل میں اے یا بی کلاس قیدیوں کے لئے کوئی انتظام نہ تھا میری اے کلاس ہو گئی مجھے میڈیکل آفیسر کے دفتر میں رکھا گیا لیکن وہاں غسل خانہ وغیرہ کا علیحدہ انتظام بالکل نہ تھا، میں دو وقت نہانے کا عادی ہوں، بیماروں کے بیت الخلاء میں جانا خود بیمار ہونا تھا اس کے علاوہ نظر بند کو اے کلاس میں جو برتن وغیرہ دیئے جاتے ہیں موجود ہی نہ تھے، نام کی اے کلاس تھی، خان سعد اللہ خان عارضی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھا، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جو بیوی کی رحلت کے باعث چھٹی پر تھا واپس آگیا وہ ایک نیک نفس انسان تھا اس کا بھائی سرخپوش تحریک کے لیڈروں میں سے تھا، قاضی عطاء اللہ کا رشتہ دار اور مردان کا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کے سوا سب افسر یا اہلکار خوش باش اور نیک خو لوگ تھے، دوسرے تیسرے روز ہی مجھے ایک افسر نے خان غلام محمد خان لوند خوڑ کا سلام دیا کہ مردان سے ان کا فون آیا ہے اور ہمیں ڈانٹا ہے کہ پٹھانوں کی مہمان نوازی کو مجروح نہ کرنا وغیرہ۔

ڈیرہ کے دوستوں نے اخلاص و محبت کی انتہا کر دی، ان کی وجہ سے ہر روز لاہور کی اطلاعات مل جاتیں۔ مقدمہ کی کاروائی پہنچ جاتی، نام ان دوستوں کا اس لئے

نہیں لکھ رہا کہ شاید پھر کبھی اُن کی ضرورت محسوس ہو۔ سپرنٹنڈنٹ پریشان تھا کہ مجھ تک اطلاعیں کیونکہ پہنچتی ہیں اس نے قیدیوں اور حوالاتیوں کی ملاقاتیں تنگ کر دیں بعض قیدی جو اندر رہ کر بھی آزاد تھے یا جن کی ہر روز ملاقاتیں ہوتیں اور کاروبار چلتا تھا اس بندش کو محسوس کرنے لگے۔ سپرنٹنڈنٹ نے انہیں یہ تاثر دیا کہ ایک پنجابی کی وجہ سے انہیں تکلیف ہوئی ہے لیکن دو چار خود غرضوں کے سوا کسی نے کان نہ دھرا، میں نے سپرنٹنڈنٹ کو بُلا کر قیدیوں کے سامنے چیلنج کیا کہ وہ اپنی ہر کوشش کے باوجود نامہ و پیام نہیں روک سکتا، اس نے میرے اصرار پر یہ کیا کہ مٹی کے برتن اور گجرات کا سستا سا ٹی سیٹ مہیا کیا، گوشت اور دودھ سخت خراب تھے، دودھ بالکل پانی ہوتا، میں نے ایک دوسری ملاقات میں کمشنر کو شکایت کی۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ کو لتاڑا لیکن بے سود، سپرنٹنڈنٹ کہتا ٹھیکہ میں تو اسی قسم کا دودھ آئے گا میرا خیال ہے کہ اس جیل میں قیدیوں کا ۵۰ فی صد بجٹ سپرنٹنڈنٹ اور اس کے معتمدین کھا جاتے ہیں یہ جیل کیا تھی مجبوروں سے مال اینٹھنے کا مذبح تھا۔ ایک قیدی نے اندر دکان کھول رکھی تھی، چرس اور افیون کھلے بندوں بکتے بکانے تھے، ون یونٹ کے تجربے میں مصطفےٰ نام کا ایک سپرنٹنڈنٹ کراچی اور سکھر وغیرہ سے ہوتا ہوا آتا یہاں لگ گیا لیکن یہاں اس کا جادو نہ چل سکا، وہ کراچی اور سکھر میں قیدیوں سے پٹ پٹا چکا تھا یہاں پٹھانوں پر اس کا جادو کیا چلتا، قیدیوں کی "آزادی" میں خلل ڈالنا چاہا، قیدیوں نے اکٹھا ہو کر بغاوت کر دی بھاگم بھاگ کمشنر آیا، پولیس آئی لیکن قیدیوں نے اسی دم مصطفےٰ کو نکلوا کے دم لیا، یہاں قیدیوں نے رشوت میں اپنا راشن دے کر آزادی لی ہوئی تھی وہ اس کو کسی طرح بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے، غرض ڈیرہ اسمٰعیل خان جیل مغربی پاکستان کے جیلوں میں لاہور کا لنڈا بازار تھا۔

ان دنوں پنجاب میں گورنر موسیٰ نے غنڈوں کو کچل دینے کی مہم کا آغاز کیا تو

ان غنڈوں کو گرفتار کر کے، بہت سے ڈیرہ اسمٰعیل بھجوائے، ہر دوسرے تیسرے روز ان کا ایک جتھہ آجاتا، یہ سب چکیوں میں رکھے گئے، اور وہاں اپنی غلیظ عادتوں کے باعث لاچار تھے، میں نے جیل میں اندازہ کیا کہ غنڈہ طبعاً بزدل ہوتا اور جیل خانے میں واقعی بزدل ہو جاتا ہے، اس میں عزت نفس بالکل نہیں ہوتی، دو چار بہادر بھی تھے لیکن صعوبت برداشت کرنے میں کورے! ان کے لیڈر توبہ تلا کر رہے تھے، میں جانتا تھا کہ انہی لوگوں نے حزب اختلاف کے جلسے خراب کئے، مولانا عبدالستار نیازی پر حملہ کیا، جماعت اسلامی کی کانفرنس پر چڑھ دوڑے، ایک بے گناہ کو شہید کیا انہی میں سے ایک نے دفتر آکر مجھے اطلاع دی تھی کہ اب ہمیں یہ کہا جا رہا ہے کہ شورش کاشمیری اور مجید نظامی کا صفایا کر دو۔ کہاں تک ہم یہ کرتے رہیں وہ مانتے تھے کہ اپوزیشن کے جلسوں کی خرابی اور بعض کارکنوں پر حملے ان سے کرائے گئے اب احتراز یا انکار کیا تو یہ بیت گئی ہے کہ اخباروں میں تو یہ خبریں آرہی تھیں کہ فلاں فلاں غنڈہ پولیس کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا لیکن حقیقتہً وہ لوگ مروائے جا رہے تھے شاید وہ اسی سزا کے مستحق تھے، انہوں نے مخلوق خدا کو بے حد تنگ کیا تھا، ان سے لوگوں کی عزتیں اور خاندانوں کی عصمتیں محفوظ نہیں رہی تھیں لیکن حکومت نے انہیں مروانے کی یہ نئی رسم ڈالی تھی۔ بعض غنڈوں کو پولیس نے مسلسل تعاقب کے بعد پکڑا اور ان کے جرائم کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے ہلاک کر ڈالا، بعض ماخوذین نے دلچسپ واقعات سنائے کہ ہم فلاں بڑے آدمی کے صاحبزادوں سے مل کر سمگلنگ کرتے رہے انہیں لاکھوں روپیہ دیا خود لاکھوں کمایا اب جائیداد بنا کر آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو پولیس حصہ پتی کی طلب میں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی، جب وہ چیز ہی نہیں تو پتی کہاں سے آئے گی۔

اچھا شو کر والا پہلی دفعہ یہیں دیکھا، سپرنٹنڈنٹ نے سن لیا تھا کہ فیاض آدمی

ہے اس کو دفتر بلا کر کرسی پیش کی، گپ لڑائی خواہش کی اور کشکول پھیلا دیا۔ اچھا کے لیے پیسہ کوئی چیز نہیں تھا وہ اپنے ہم چشموں میں ہاتھ کا سخی، دل کا کھلا اور زبان کا میٹھا تھا، نماز باقاعدگی سے پڑھتا اور کھانا اپنا پکا کے کھاتا تھا، اس نے مجھے بعض وزیروں کی عجیب وغریب باتیں سنائیں کہ ان کی خاطر کیا کیا کام ہوتے رہے ہیں کرمانی کے وہ سخت خلاف تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا گھر اسی علاقے میں تھا جہاں کرمانی پڑھ لکھ کے جوان ہوا تھا بقول اس کے کرمانی کی خواہش تھی کہ شورش کاشمیری اور مجید نظامی کی پٹائی ہو بلکہ وہ کچھ اور چاہتا تھا لیکن اس نے گریز کیا، اس کا نتیجہ تھا کہ اس "جرم" کی وجہ سے اس کے پرانے جرم بھی کھل گئے۔

اتوار تھی صبح گیارہ بج گئے ناشتہ کا سامان نہ آیا میں نے غصہ میں اٹھا کر سب برتن توڑ دیئے، سپرنٹنڈنٹ بھاگم بھاگ آیا اس کو بھی ڈانٹ دیا، الٹے پاؤں چلا گیا، اس کے علاوہ بعض واقعات یہ تھے کہ

۱۔ مقامی سول ہسپتال کے سپیشلسٹ اور ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر دوسرے تیسرے روز مجھے دیکھتے رہے، دو دفعہ انہوں نے جیل سے باہر سول ہسپتال بلوایا، وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے میں نے بعض دوستوں سے مصافحہ کیا، بعض سے معانقہ، رپورٹ ہو گئی تو گارد کے انچارج سب انسپکٹر کو چارج شیٹ کیا گیا، دوسری دفعہ گارد کی نفری بڑھا کر ایک انسپکٹر بھیجا گیا لیکن علیک سلیک کہاں رکتی، تیسری دفعہ ڈینٹل سرجن کو جیل خانہ بھجوا دیا کہ وہاں جا کر ٹیسٹ کرو،

۲۔ مقامی سپیشلسٹ نے حکومت کو لکھ دیا کہ علاج یہاں نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں ضروری سامان موجود نہیں۔ دوسرے بیماری اس نوعیت کی ہے کہ مختلف ماہرین سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ جیل کا میڈیکل آفیسر جیسا بھی تھا لیکن میرے علاج میں مخلص تھا وہ صحیح صحیح

رپورٹ کرتا رہا اس نے کئی دفعہ سپرنٹنڈنٹ کی ناراضی مول لی، میں کراچی جانے لگا تو اُس نے سپرنٹنڈنٹ کو لکھا کہ ان کے ساتھ کسی ڈاکٹر کا جانا ضروری ہے ان کی حالت اچھی نہیں ہے سپرنٹنڈنٹ جس طرح مجھے بھجوانا چاہتا تھا یہ چیز اس کی منشاء کے خلاف تھی۔

۴۔ مجھے ڈاکٹروں، ڈسپنسروں اور دوسرے اہل کاروں نے مطلع و متنبہ کر رکھا تھا کہ کھانے پینے کی ہر چیز میں احتیاط کرنا، ایک دن سپرنٹنڈنٹ نے اپنے گھر سے دودھ بھجوایا اُس کی چائے پیتے ہی طبیعت بگڑ گئی، ڈاکٹر کو فوراً طلب کیا، اس نے کئی دوائیں دیں قے ہوتے ہی طبیعت سنبھل گئی، میں نے محسوس کیا کہ میرے سینہ میں شدید قسم کی خراش ہے بہر حال یہ کہنا مشکل ہے کچھ تھا یا نہیں، جو تھا اس سے افاقہ ہو گیا۔

لاہور میں جو فیصلہ ہوتا سپرنٹنڈنٹ کو اسی وقت وائرلیس سے مطلع کر دیا جاتا، دن میں اس کو لاہور سے کئی فون آتے میرے معاملہ میں وہ اپنے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو بھی اعتماد میں نہیں لے رہا تھا، راولپنڈی جانے یا نہ جانے کے متعلق مجھے آخر وقت تک دھوکے میں رکھا گیا پشاور سے متعلق بھی یہی معمول رہا، کراچی کا فیصلہ ہوا تو یہی وتیرہ اختیار کیا، ۲۸ مئی کو مجھے کہا کل صبح سویرے تیار رہو یہاں سے پولیس پک اپ دریا تک لے جائے گی وہاں سے لانچ میں دریا خان، پھر ریل سے کراچی، صبح نماز پڑھ کر بہت سے لوگ جیل کے باہر سڑک پر جمع ہو گئے، اکثر دریا خان چلے گئے، سپرنٹنڈنٹ بنگلہ میں پڑا رہا، پورا دن نکل گیا پتہ چلا کہ سپرنٹنڈنٹ کا ارادہ کچھ اور ہے، سفریات کو طے پایا ہے اور وہ بھی آدھی رات کو، وہی ہوا ساڑھے گیارہ بجے شب سپرنٹنڈنٹ خود آیا، آج تک کبھی یہ نہیں ہوا تھا، مجھ سے کہنے لگا۔ چلیے

میں۔ "کہاں"

وہ۔ پولیس آئی ہے ؟

میں۔ کس لئے ؟

وہ۔ کراچی کے لئے۔

میں۔ یہ کوئی وقت نہیں، کبھی ایسا ہوا ہے، جیل خانہ بند ہو کر صبح کھلتا ہے۔ اس طرح رات کے وقت کبھی کسی قیدی یا نظر بند کو پولیس کے حوالہ نہیں کیا گیا، ایسا کرنا کیا سوچنا بھی خلاف قانون ہے۔

وہ۔ بہرحال اب تو پولیس آگئی ہے۔

میں۔ مجھے کیا؟ وہ غلط آئی اور آپ نے غلط بلائی ہے،

وہ۔ لیکن اب تو چلیے۔

میں۔ میں اس وقت نہیں جاؤں گا۔

وہ۔ گورنمنٹ کا حکم ہے۔

میں۔ میں نہیں مانتا۔

وہ۔ آپ کراچی نہیں جانا چاہتے؟

میں۔ اس وقت بالکل نہیں آپ خلاف قانون حرکت کر رہے ہیں، کونسا راستہ ہے جس سے آپ لے جانا چاہتے ہیں۔

وہ۔ بنوں، کالاباغ۔

میں۔ کالاباغ؟ جہاں بیٹے باپ کو گولی مار دیتے ہیں؟

وہ۔ حکومت کے احکام ہی ایسے ہیں۔

میں۔ دیکھئے سپرنٹنڈنٹ صاحب! میں نہیں جاؤں گا، آپ مجھے اُٹھا کے نہیں لے جا سکتے مجھے راستہ میں گولی ماردی جائے سرکاری کمیونک اس کے سوا کیا ہو گا کہ:۔

ا۔ قبائلی علاقے سے گزر رہے تھے گمنام لوگوں نے فائرنگ کیا نظر بند ہلاک ہو گیا۔

۲۔ نظر بند نے پیشاب کے بہانے بھاگنا چاہا مسلح گارد نے تعاقب کیا اور ڈھیر کر دیا۔

۳۔ نظر بند نے افسر کا پستول چھین کر فائر کرنا چاہا کنسٹیبل نے حفظ ماتقدم میں رائفل چلادی۔

۴۔ یا اسی نوعیت کا کوئی اور عذر گھڑ لیا جائے، مجھے معلوم ہے آج کل بعض لوگ اس طرح مروائے جا رہے ہیں۔

آخر سپرنٹنڈنٹ سپر انداز ہو گیا۔

اگلی صبح گن نہ سُن، میں پوچھتا ہوں کراچی جانا ہے کہ نہیں؟

کوئی جواب نہیں، پورا دن اسی میں کٹ گیا۔

سپرنٹنڈنٹ دورہ کرتا ہوا آیا، میں نے رسید ہی نہ دی۔

یکم جون کو بتایا گیا کہ آج جاؤ گے لیکن ہوائی جہاز سے، کیونکہ ریل میں مختلف اسٹیشنوں پر لوگ جمع ہو جاتے ہیں، دوروز پہلے یہی ہوا تھا ملتان میں اتنے لوگ جمع ہو گئے تھے کہ گورنمنٹ گھبرا گئی! بہر حال ایئر ٹکٹ دکھائے گئے، ایک انسپکٹر اور ایک مسلح حوالدار گارد کے طور پر وارد ہو گئے، میں نے اڑچن ڈال دی کہ بائی ایئر (BY AiR) نہیں جاؤں گا۔ پہلے انشورنس کرائی جائے اور حکومت پریمیم ادا کرے، سپرنٹنڈنٹ منت سماجت کرنے لگا آخر میں راضی ہو گیا سپرنٹنڈنٹ بے نظیر چیز تھا ـــــ وہ پک اپ کو جیل کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ اپنی کوٹھی میں لے گیا وہاں بڑے دروازہ سے نکال کے اُلٹے سیدھے راستوں سے ایئر پورٹ روانہ کیا لیکن اس خدع و احتیاط کے باوجود وہاں بھی کچھ نوجوان پہنچ گئے، انسپکٹر نے کسی کو ملنے نہ دیا مگر اشاروں ہی اشاروں میں بہت سی باتیں ہو گئیں۔ طیارہ ملتان پہنچا تو وہاں مولانا محمد علی جالندھری موجود تھے، اب ان کے متعلق اجنبی کیا جانتا کہ یہ بھی کوئی لیڈر ہیں، یا کوئی شخصیت، کماد کی طرح سادہ انسان

رنگدار تہمد، کھدر کا کرتہ، سر پہ رومال، پاؤں میں دیہاتی جوتی، میں نے بڑھ کے سلام کیا۔

انسپکٹر نے کہا،

"کوئی مصیبت نہ آجائے"۔

میں نے کہا، مصیبت کیسی یہ تو یہاں ایک گاؤں میں پرچون کی دکان کرتے ہیں، اس نے ظاہری علیہ سے یہی سمجھا، مولانا نے سب کو سیلون آپ پلائی، جو کہنا تھا کہہ دیا، چلنے لگے تو انسپکٹر نے ان سے پوچھا، آپ کا نام؟

میں نے جھٹ سے جواب دیا — میاں عبداللہ

اتنے میں ہم جہاز میں آبیٹھے، انسپکٹر نے اپنے اضطراب کی تسلی کے لئے پوچھا۔

یہ کوئی سیاسی آدمی تو نہیں تھے؟

میں نے کہا بالکل نہیں اور وہ مطمئن ہو گیا۔

جہاز سکھر ٹھہرتا ہوا کراچی پہنچا، وہاں عجب نظارہ تھا، ایئرپورٹ پر پولیس ہی پولیس تھی، کئی سب انسپکٹر، کئی انسپکٹر، کئی ڈی ایس پی، میں نے سمجھا شاید گورنر یا صدر آرہے ہیں، بعد میں معلوم ہوا کہ سب کچھ میں ہی ہوں، پولیس کی پک اپ اندر ہی کھڑی تھی، اس میں بٹھایا اور شپاشپ لے کے روانہ ہو گئی، وہاں لاہور سے اطلاع پاکر میرے کچھ دوست انور، فرید احمد اور خلیرے بھائی احمد آگئے تھے انہیں گویا رسید مل گئی کہ پہنچ گیا ہوں۔

کراچی سنٹرل جیل کے پھاٹک کھلے اور بند ہو گئے، انسپکٹر پولیس نے رسید حاصل کی مصافحہ کیا اور چلا گیا، شیخ نور الٰہی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل منتظر تھے انہوں نے خیر مقدم کیا، اپنے ساتھ لے گئے اور اس بنگلے یا بارک میں چھوڑ آئے جہاں کبھی تحریک خلافت کے دنوں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شوکت علی اور پیر غلام مجدد سندھی رہے تھے۔ ع

بوئے ہم نفساں آتی ہے دیواروں سے

حماقتیں

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے کہیں لکھا ہے کہ طاقت جب عقل و دانش کو پس پشت ڈال کر اپنی ذات پر بھروسہ کرنے لگتی ہے تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے، میں کوئی بڑا آدمی نہیں حکومت نے میرے ساتھ جو سلوک کیا عقل و شرافت سے معرّیٰ تھا، اس وقت حکومت صرف ایوب خان کی آمریت اور ان کے مشیروں کی چغلخوری کا نام تھا، بعض اتنے گندے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے کہ ان کی شخصیت کا سورج بھی گہنا گیا تھا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مقابلہ میں کوثر نیازی اور چودھری محمد علی کے مقابلہ میں کرمانی صدر ایوب کے لطائف تھے۔ گورنر موسیٰ بہادر سپاہی تھے لیکن ملک امیر محمد خان کا بدل نہیں تھے، ایوب خان نے گندے لوگوں کی خاطر اپنے اچھے دوستوں سے بگاڑلی نتیجۃً وہ آمریت کی عمرِ طبیعی گزارنے سے پہلے کمزور پڑ گئے۔ احمد سعید کرمانی کو وزارت میں لینے کی تُک کیا تھی؟ اس میں کوئی سی خوبی نہ تھی، ایوب خان کے خلاف تنقید سخت ہوگئی تو اس کی وجہ کرمانی ایسے لوگ بھی تھے جن کے اپنے گناہ ایوب خان کے پلڑے میں ڈل گئے تھے۔

چٹان کو حق پہنچتا تھا کہ غلط چیزوں پر تنقید کرے، آخر ایوب خان کا مجھ پر وہ کون سا حق یا احسان تھا کہ اختلاف کرنا چاہوں تو اس لئے رکا رہوں کہ ایوب خان ناراض ہوں گے یہ صحیح ہے کہ میرے قلم سے انہیں پریشانی تھی اور یہ بھی صحیح ہے

کہ میری تقریر سے ان کی ہوا خیزی ہوئی لیکن ڈیفنس آف پاکستان رولز ان کے لیے نہیں تھا۔ پریس ضبط، ڈکلیریشن منسوخ، اخبار بند، روزگار موقوف، قید و قتل کے منصوبے نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ عزیز اور دوست ملتے ہوئے گھبراتے اور جو چوری چھپے ملتا اس کو خوفزدہ کیا جاتا۔ یہ اب راز نہیں رہا کہ ہائی کورٹ کا وہ ڈویژن بنچ جو رٹ سن رہا تھا اس کے دونوں ججوں کو متاثر و مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی لیکن انہوں نے بالواسطہ و بلاواسطہ کہہ دیا کہ وہ اپنے اس منصب کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں اور ایسا کوئی فیصلہ نہیں کریں گے جو قانون و انصاف کے خلاف ہو یا اس کے پس منظر میں کوئی ترغیب، تحریص یا تہدید ہو انہیں زچ کیا گیا۔ صدر ایوب اور گورنر موسیٰ نے بالواسطہ اور بلاواسطہ مداخلت کی لیکن ڈویژن بنچ نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ یہ ساری کہانی واقفان حال کو معلوم ہے۔ بفضل تعالیٰ اس کے سبھی کردار بقید حیات ہیں اور جو معلومات مجھے حاصل ہیں وہ ثقہ اور مستند ہیں۔ تعجب کہ جن لوگوں نے اس ڈرامہ میں حصہ لیا وہ ڈراپ سین کا اندازہ نہیں کر پائے تھے یا ان کی عقلیں اتنی ناکارہ تھیں کہ اس کے مضمرات سے غافل تھے۔

یہ صحیح ہے کہ میرا مقدمہ ہوم ڈیپارٹمنٹ، نظام قانون اور محکمہ اطلاعات نے مل کر تیار کیا تھا لیکن جن افسروں نے فائل تیار کیا ان کے قلم شریک تھے ان کے دل شریک نہیں تھے ان سے جو کچھ لکھوایا، آمریت نے لکھوایا تھا، میرا احساس تب بھی یہی تھا اب بھی یہی ہے۔ اگر مسٹر مسعود نبی نور ہوم سیکرٹری کے لکھے پر حکومت کھلے دل سے غور کرتی تو اس صورت حال کے ظہور سے محفوظ ہو جاتی لیکن حکومت نے جب تک تجربہ نہ کر لیا حماقتوں پر حماقتیں کرتی گئی۔ جو قدم اٹھایا شکست کھائی، چارج شیٹ ز نظر بندی کے اساسات، ہی غلط تھا۔ اگر صحیح ہوتا تو مقدمہ چلاتی، اس کے سچا ہونے پر سزا مل سکتی تھی لیکن اس نے نظر بندی کا راستہ اختیار کیا جو مقدمہ چلائے بغیر اپنی منشا پر کسی کو

قید کر دینے کا مستمرانہ فعل ہے۔ چارج شیٹ کی چار شقیں تھیں۔

۱۔ یہ کہ یکم اپریل کو ڈی پی آر کی دفعہ ۵۲ کے تحت جو نوٹس دیا گیا، ۲۲ اپریل کے شمارہ میں "الحمد للہ" کے زیر عنوان شذرہ اس کی خلاف ورزی تھا۔ جب تعزیری کارروائی کے احکام تعمیل کرائے گئے تو ان پر اشتعال انگیز فقرات لکھے۔

۲۔ جمعیۃ العلمائے کانفرنس میں ۵ اور ۶ مئی کی رات کو احمدیوں کے خلاف ایسی تقریر کی جس سے غیر احمدیوں اور احمدیوں کے درمیان منافرت پیدا ہوتی ہے لوگوں کو تشدد پر اکسایا گیا۔

۳۔ ضمیر قریشی کے قتل کا مسئول حکومت کو ٹھہرا کر اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جس سے حکومت کی بالواسطہ و بلا واسطہ توہین ہوتی اور اس کے خلاف نفرت پھیلتی ہے۔

۴۔ پاکستانی فوج میں شریک احمدیوں کے متعلق جو بیان کیا گیا اس سے فوج میں بے اطمینانی یا کھچاؤ پیدا ہو سکتا ہے۔

چونکہ مقدمہ کالف و نشر حکومت نے خود وضع کیا تھا اسی لئے وہ عدالت کے سامنے آتے ہوئے گھبراتی تھی، سرکاری رپورٹروں نے تقریر کو اتنا بے ربط، اعضاء بریدہ اور سیاق وسباق سے محروم کر دیا تھا کہ سنگریزے رہ گئے تھے اُن سے فردِ جرم کا ہیولیٰ تیار کیا گیا۔

غلام غوث ہزاروی کی وجہ سے حکومت کا خیال تھا کہ ان کا اسٹیج میرے کام نہیں آ سکے گا لیکن میری تقریر انہی کے اسٹیج پر ہوئی تھی۔ کرمانی اسی دن اسمبلی میں غلام غوث کی مدح کر چکا تھا احرار میں ایک شخص میرزا اجانباز تھا آوارگوار تھی بے تکی نظمیں لکھتا اور پڑھتا تھا وہ اپنے ماہنامہ کے لئے مدت سے اشتہارات کی تلاش میں تھا اپنے ساتھ ایک ایسے مسجدی مُلّا کو لے کر جسے کرمانی نے محکمہ اوقاف سے نکلوا دیا مگر حکم امتناعی سے ٹکا ہوا تھا کرمانی

کے ہاں حاضر ہوا اپنی خدمات پیش کیں۔ اسی کا نتیجہ وہ بیان تھا جو غلام غوث نے میری گرفتاری کے دوسرے روز یعنی ۹ مئی کو اخبارات میں دیا اس بیان میں غلام غوث نے میری تقریر سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور احمد سعید کرمانی سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ ۳۰ ہزار کا مجمع اور وہ علمائے کرام جو وہاں موجود تھے اس تقریر سے متفق نہ تھے، حالانکہ اس وقت غلام غوث بھی جھوم رہا تھا، دوسرے نعروں کے علاوہ داد و تحسین کا جو بہاؤ تھا وہ ہائی کورٹ میں حکومت کی پیش کردہ رپورٹ میں درج ہے کہ مجمع کے جوش و جذبہ کا حال کیا تھا غلام غوث، جمعیتہ کے علماء۔ اور تیس ہزار افراد متفق نہ تھے تو وہ لوگ کون تھے جو سر دھن رہے تھے۔

غلام غوث کے اس بیان کا علم مجھے ڈیرہ اسماعیل خان میں بھوک ہڑتال کے دنوں میں ہوا میں ان کے متعلق جانتا تھا کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ؟ جمعیتہ کے اکابر ہی نے اس بیان کا نوٹس لیا، عام سیاسی حلقوں نے لعن طعن کی، خلوتیاں راز نے بیان کو پیٹھ پیچھے خنجر بھونکنے سے تعبیر کیا، غلام غوث آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئے لیکن حکومت نے جو فائدہ اس بیان سے حاصل کرنا چاہا تھا وہ اُس بیان نے ختم کر دیا جو ایک پوسٹر کی شکل میں جمعیتہ کے اکابر مولانا عبداللہ درخواستی، مفتی محمود اور مولانا عبید اللہ انور کے دستخطوں سے شائع ہوا اور عدالت میں داخل کیا گیا، متن تھا۔

"آغا شورش کاشمیری کے خلاف حکومت کا اقدام جمعیتہ علمائے اسلام کے خلاف اقدام ہے"۔

جمعیتہ کانفرنس کے اسٹیج پر شورش صاحب کے بیان کردہ حقائق اور موقف کی جمعیتہ علماء۔ اسلام پوری پوری تائید کرتی ہے اور ان کی ذمہ داری سنجیدگی کے ساتھ اُٹھانے کا اعلان کرتی ہے حکومت یا تو شورش صاحب کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلائے ورنہ انہیں فی الفور رہا کر دے، چٹان پریس واگذار کرے۔

آغا شورش کاشمیری نے ۵ مئی کو کل پاکستان جمعیۃ علمائے اسلام کانفرنس میں جمعیۃ کی دعوت پر جو تقریر کی اور جس کے نتیجہ میں حکومت نے انہیں ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۳۲ کے تحت گرفتار کیا ہے اگر ارباب حکومت کی نظر میں ان کی تقریر کے اندر خلاف قانون واضح مواد موجود ہے تو ان کا فرض تھا کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کا سہارا نہ لے کر عام ملکی قانون کے تحت ان پر مقدمہ چلاتی ہم حکومت کے اس اقدام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ حکومت کا یہ اقدام شورش کاشمیری ہی کے خلاف نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ پاکستان اور جمعیۃ علمائے اسلام کے بھی خلاف ہے۔ جناب آغا شورش کاشمیری کی اس تقریر کی ذمہ داری زیادہ تر جمعیۃ پر عائد ہوتی ہے اور جمعیۃ علماء اس ذمہ داری کو نہایت سنجیدگی و عزم کے ساتھ اٹھانے کا اعلان کرتی ہے۔

آغا شورش کاشمیری نے ملکی سالمیت کے تحفظ کے بارے میں جن حقائق کا انکشاف کیا ہے پوری ملت ان کی ممنون ہے۔

جمعیۃ علماء اسلام چٹان اخبار کی بندش اور چٹان پریس کی ضبطی سے لیکر شورش صاحب کی گرفتاری تک ان کے موقف کی تائید کرتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ شورش صاحب کے خلاف یہ اقدام حکومت کے چند ناعاقبت اندیش افراد نے ذاتی مخالفت کی بنیاد پر کیا ہے جو سراسر ناانصافی اور زیادتی ہے۔

مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی سے منسوب جو بیان ابھی ابھی بعض اخبارات میں شائع ہوا ہے اس کے بارے میں جب مولانا سے رابطہ قائم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ پریس کے بعض ذمہ داروں نے ان کے بیان

کو مسخ کر کے غلط عنوان اور غلط رنگ میں قوم کے سامنے پیش کیا ہے چنانچہ ان کی طرف سے منسوب اس شائع شدہ بیان سے جمعیتہ علماء اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

یاد رہے غلام غوث نے خود تردید یا تصحیح نہیں کی اور نہ مندرجہ بالا بیان پر دستخط کئے، بہرحال حکومت کو احساس ہو گیا کہ وہ شورش کاشمیری کو تنہا کرنے میں ناکام ہو گئی ہے اور اس کے دانشور عوامی سطح پر اس کے حسب منشا کوئی نتیجہ پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ نے میری گرفتاری، اخبار کی بندش اور پریس کی ضبطی کے متعلق حکومت سے اس کے اقدام کی نوعیت معلوم کی، اسی طرح کامن ویلتھ پریس یونین نے بھی حکومت سے وضاحت طلب کی۔ حکومت اور جو کچھ کرنا چاہتی تھی وہ ان کے فوری نوٹس لینے سے رک گیا یا ملتوی ہو گیا۔ یا پھر حکومت کو احساس ہو گیا کہ وہ اپنے ترکش کے ہر تیر کو استعمال نہیں کر سکتی کیونکہ ملک سے باہر بھی اس کی رسوائی ہو گئی۔ کئی امریکی جرائد نے جیسا کہ مجھے بتایا گیا اس اقدام کا نوٹس لیا، گارڈین (لندن) کے مسٹر برائن لیپنگ (Brian Lapping) نے جو نیوز سوسائٹی کے ڈپٹی ایڈیٹر تھے ایک مفصل خط میں اس سارے حادثہ کی تفصیلات دریافت کیں، کہ وہ برٹش اخبارات میں اس پر قلم اٹھانا چاہتے ہیں، انہوں نے حکومت کی نہایت نپے تلے لفظوں میں مدارات کی ۔۔ ۴ مئی کو میں نے انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کو اس واقعہ پر خط لکھا تھا لیکن مسٹر اینٹنی بروک (Antony Brock) ایڈیٹر آئی پی آئی رپورٹ نے ۱۴ مئی کو میری بیوی کے نام اپنے خط میں لکھا کہ انہیں وہ خط نہیں ملا ان کے خط میں وہ تار درج تھا جو آئی پی آئی نے حکومت پاکستان کو میری گرفتاری کے وجوہ معلوم کرنے کے لئے ارسال کیا تھا اس کے علاوہ انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر مسٹر پرمون سن (Permonsen) نے ۷ مئی کے خط میں حکومت کے اقدام کو تشویش ناک

قرار دیتے ہوئے مجھے لکھا کہ آئی پی آئی کے عالمی ارکان کو جون کے شمارہ میں مطلع کر دیا جائے گا۔ ۳۰ جون کو نیروبی میں ایگزیکٹو بورڈ کا اجلاس ہو رہا ہے جہاں اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا۔ کامن ویلتھ پریس یونین کے سیکرٹری بریگیڈیئر ایل ایل کراس نے چھ مئی کو ایک خط میں پاکستان کی شاخ کے توسط سے تفصیلات سے آگاہ ہونا چاہا لیکن اُن کا خط آنے سے پہلے میں گرفتار ہو چکا تھا۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس، مشرقی پاکستان یونین آف جرنلسٹس، کراچی یونین آف جرنلسٹس کی قراردادیں جو حکومت کے اقدام کی مذمت میں پاس کی گئی تھیں آئی پی آئی کے طلب کرنے پر بھجوا دی گئیں لیکن ملک میں آمریت کے خوف کا یہ عالم تھا کہ جن اخباروں میں جرنلسٹس کام کرتے تھے ان میں وہ اپنی قراردادیں شائع نہ کر سکے اور جو لوگ یہاں آئی پی آئی اور کامن ویلتھ پریس یونین کی پاکستانی شاخ کے چیئرمین تھے انہوں نے غور تک نہ کیا اور کلمہ تک نہ کہا بلکہ اُلٹا حکومت کے خوف کا شکار ہو گئے۔ ان کا یہ حال تھا کہ اپنی کسی توہین پر احتجاج نہیں کر سکتے تھے ایوب خان نے بعض بڑے اخباروں کے مالکوں کو سرِ مجلس اتنا ذلیل کیا تھا کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ان کے نزدیک اخبارات صنعت تھے اور وہ میرے لئے اپنی انڈسٹری کو خراب نہیں کر سکتے تھے وہ میری بھوک ہڑتال کی خبر چھاپتے ہوئے ڈرتے تھے ان کی باگ ڈور اس وقت محکمہ اطلاعات کے مرکزی و علاقائی افسروں کے ہاتھ میں تھی۔ حکومت کے اشتہارات یونہی نہیں ملتے، خود سپردگی سے ملتے تھے میرے لئے وہ اپنی عمارت کیونکر ڈھوا سکتے تھے بعض لوگوں کے متعلق مجھے کچھ زیادہ خیال نہیں تھا میں سمجھتا تھا وہ حکومت کی منشا سے منحرف ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے لیکن مجھے کراچی جیل میں اس خبر سے ملال ہوا کہ مسٹر محمود ہارون نے کامن ویلتھ پریس یونین کی پریس فریڈم کمیٹی میں سرکاری نقطہ نگاہ کی اعانت کی ہے۔ اور میرے معاملہ کو اس عذر پر ٹالنا چاہا ہے کہ چٹان کورٹ آف آنر کے دائرہ میں شریک دستخط نہیں تھا میں نے اپنی اہلیہ

کو ہدایت کی کہ مسٹر ڈرموٹ مورا چیئرمین پریس فریڈم کیمٹی کو تفصیلی خط لکھیں اور اس میں مسٹر ہارون کے متعلق وضاحت کر دیں کہ ان کا نقطہ نگاہ ہمارے معاملہ میں ہمدردانہ نہیں، بلکہ کئی وجوہ سے سرکاری نقطہ نگاہ کے موافق ہے چنانچہ میری اہلیہ نے یہ سب کچھ لکھ دیا۔ اس کے جواب میں ۱۶ اگست کو چیئرمین پریس فریڈم کیمٹی کا لندن سے خط آیا جس میں میری اہلیہ کو مسٹر محمود ہارون کے نقطہ نگاہ سے مطلع کیا اور لکھا کہ پریس فریڈم کیمٹی آپ کے شوہر کے ابتلا سے کماحقہ آگاہ ہے اور ان کی آزادی کے سلب ہو جانے کا جائزہ لے رہی ہے۔ انہوں نے حکومت پاکستان کی اس رپورٹ کی نقل بھی بھجوا دی جو کیمٹی کے استفسار پر ۲۶ جون کو مسٹر اے بی اعوان ہوم سیکرٹری نے پریس فریڈم کیمٹی کو تحریر کی تھی اور چارج شیٹ کا الزام دہرا کر میری صحت کے متعلق لکھا تھا کہ اچھی ہے اس کے برعکس صوبائی حکومت اسمبلی کے ایوان اور ہائی کورٹ میں کہہ رہی تھی کہ راولپنڈی سے ڈاکٹری سامان اور میڈیکل سپیشلسٹ بھیجا گیا ہے۔

ہارون فیملی کے متعلق میرا ہمیشہ یہ تاثر رہا ہے کہ اس خاندان نے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے ان کے جد سر عبداللہ ہارون مسلمانوں کے معتدل مزاج راہنماؤں میں نیک نفس انسان تھے۔ مسٹر یوسف ہارون کی چند روزہ گورنری سے پہلے میں ان سے کبھی نہیں ملا تھا وہ جس زمانہ میں سندھ کے وزیراعظم ہوتے میں ان سے بالکل ناواقف تھا ابراہیم جلیس کی گرفتاری پر انہیں خط لکھا اور شاید وہ خط بھی ان کی رہائی کے محرکات میں سے ایک تھا ان یوسف ہارون ہی کی وجہ سے جلیس کو بہتر کلاس ملی تھی ورنہ اہل قلم کے متعلق بیوروکریسی کا مزاج اکثر منفی رہا ہے۔ یوسف ہارون ایوب خان کے زخم خوردہ تھے اور بعض روایتوں کے مطابق انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا میں نے جونہی "ڈان" میں محمود ہارون کا نقطہ نگاہ پڑھا کہ انہوں نے میرے متعلق کامن ویلتھ پریس یونین میں حکومت کے جواز کی بالواسطہ حمایت کی ہے تو حکام سے بالا بالا انہیں ایک رجسٹرڈ خط

لکھا کہ ایوب خان کی حمایت کرتے وقت انہیں میرے ساتھ ہمدردی نہیں تھی تو اپنے بھائی یوسف ہارون کے متعلق غور کیا ہوتا کہ وہ کس جرم میں ملک سے نکالے گئے ہیں یہ خط ذرا سخت تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ میں ایک شریف آدمی کو لکھ رہا ہوں افسوس کہ نقل میرے کاغذات سے گم ہوگئی ہے۔

حکومت بالکل ننگی ہو کر سامنے آگئی پے درپے جھوٹ بولے، صوبائی خزانہ کا اتنا روپیہ ضائع کیا اور بعض لوگوں کی بلاوجہ پرورش کی کہ اسراف وتبذیر کی ایسی نظیر برطانوی عہد میں بھی ایسے کسی مقدمہ میں نہیں ملتی ہے، اس نے مقدمہ کو روکنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا وہ کوئی چار دفعہ چھوٹے چھوٹے عذر لے کر سپریم کورٹ میں گئی ایک دفعہ چیف جسٹس ہائی کورٹ کے پاس پہنچی، کسی معاملہ میں عارضی جیت ہوئی تو آخر کار شکست ہوگئی، ایک نمایاں کامیابی اس کو صرف اس باب میں ہوئی کہ اس نے سپریم کورٹ کے چیف جج مسٹر جسٹس فضل اکبر سے ۷ جون کو ۹ ستمبر تک اس نکتہ پر حکم امتناعی حاصل کرلیا کہ ہائی کورٹ کو ڈیفنس آف پاکستان رولز میں ۵ مارچ ۱۹۶۸ء کی صدارتی ترمیم کے بعد کسی نظربند کے معاملہ میں چھان بین کا اختیار نہیں ہے؟ گویا ۸۲ دن کے لئے حکومت عدالتی باز پرس سے بے نیاز ہوگئی، لطف یہ تھا کہ ۳۱ مئی کو سپریم کورٹ نے میری اہلیہ کی اس درخواست کو کہ کراچی میں سماعت نہ ہو اور حکومت کی اس درخواست کو کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان سنٹرل جیل سے مجھے پشاور سنٹرل جیل نہ بھیجا جائے غیر موثر ہونے کی صورت میں مسترد کردیا تھا نتیجۃً ہائی کورٹ نے سماعت کی تاریخ مقرر کردی لاہوریئے جو وکیل میری طرف سے مقدمہ لڑ رہے تھے ان سے قبل از گرفتاری میرا کوئی دوستانہ تعلق نہ تھا۔ مسٹر ایم انور، شیخ سعید اختر اور ان کے معاون ملک محمد نواز وغیرہم اُنہی دنوں واقف ہوئے تھے، میاں منظر بشیر سے سیاسی آشنائی ضرور تھی لیکن کوئی خاص علاقہ نہ تھا۔ یہ سب کسی معاوضہ کے بغیر قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے للہی اخلاص سے مقدمہ لڑ رہے تھے۔ مسٹر ایم انور اور شیخ سعید اختر نے

حکومت کو اتنا پریشان کیا کہ وکلاء کی سرکاری ٹیم کئی دفعہ بدلی گئی، ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر، قاضی اختر احمد ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کراچی، اٹارنی جنرل شیخ غیاث محمد افیسران سپیشل ڈیوٹی شیخ اعجاز علی اور بہت سے ضمنی وکلاء حکومت کی طرف سے پیش ہوتے رہے۔

مسٹر ایم انور اپنی کسی بیماری کی وجہ سے کراچی نہیں جا سکتے تھے، جسٹس فضل اکبر نے ۹ ستمبر کی تاریخ ڈال کر سماعت کراچی میں رکھ دی۔ سوال یہ تھا وہاں کون پیش ہو؟ فیس نہ سہی اور کئی اخراجات تھے سفر اور قیام کا خرچہ معمولی نہ تھا، میں ان معاملات سے قطعاً بے خبر تھا مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ سید جمیل حسین رضوی کو کراچی میں پیروی کے لئے کس نے تیار کیا اور وہ اپنے جونیئر سمیت ہائی کورٹ میں مقدمہ لڑنے کے لئے تقریباً ۲۵ ہزار روپے فیس پر راضی ہو گئے ــــــ سپریم کورٹ نے کراچی میں تاریخ دے کر ایک عجیب کشمکش پیدا کر دی۔ مسٹر اے کے بروہی ہمیشہ کی طرح کنی کترا گئے ان سے مدت کی آشنائی تھی میں ان پر الزام نہیں لگاتا احساس میرا یہ تھا کہ ان میں حکومت بالخصوص ایوب خان کو ناراض کرنے کا حوصلہ نہ تھا وہ ہاں یا نہ نہیں کرتے تھے لیکن ان کی ہاں میں بھی نہ تھی قدرت نے انہیں ایک معجزاتی دماغ دیا ہے وہ دوسرے کے طرزِ عمل سے اپنی بات کا جواز پیدا کرتے اور اپنے انکار میں ہمیشہ اقرار کا لوچ رکھتے ہیں، وہ مجید نظامی اور دوسرے دوستوں کو خدمات پیش کرتے ــــ لیکن فرماتے رہے کہ ایڈمرل اے آر خان وزیر داخلہ فلاں بات کہتے ہیں ان کی معرفت یہ سارا قضیہ ختم ہو سکتا ہے، جب یہ بات مجھ تک پہنچی تو میں نے کہلا بھیجا ایسی چیزیں میرے مذاق کے خلاف ہیں، حکومت کو غلطی کا احساس ہے، چھوڑ دے، بات چیت کیسی؟

شیخ سعید اختر ہی واحد انسان تھے جن کی ہمت، قابلیت اور ذہانت نے کسی ادنیٰ سی خواہش کے بغیر للہی اخلاص پر چٹان کے ہر نوعی مقدمہ کی عنان سنبھالی ہوئی تھی۔

اور لاہور میں ایم انور کے دوش بدوش رہے تھے، یہ ان کے ظرف کی بلندی اور اخلاص کا ثبوت تھا کہ جب ۲۵ ہزار روپے معاوضہ کا سوال پیدا ہوا تو پیچھے ہٹ گئے، ڈاکٹر مبشر حسن نے اس مرحلہ میں انہیں اپنی سیاست کی نذر کر دیا، لاہور میں مبشر حسن ہی تھے جو اس وقت کی دوستی کے باعث مقدمہ کے انچارج ہو گئے تھے اور یہ ان کا شعبدہ تھا، شیخ سعید اختر کی عالی ظرفی تھی کہ وہ بلا مزد کراچی میں پیش ہونے کے لئے تیار ہو گئے، میاں منظر بشیر نے میرے معاملہ میں اس تندھی سے کام کیا کہ دوست عش عش کر اٹھے وہ شب و روز مقدمہ کی تیاری میں لگے رہے اور یہ ان کا للہی اخلاص تھا۔

۹ ستمبر بھی آگئی، سپریم کورٹ کے تمام ججوں نے سماعت کی، حکومت نے ہائی کورٹ کے ایک سابق جج مسٹر اے آر چنگیز کو اسی غرض سے وکیل کیا۔ ان کے علاوہ اٹارنی جنرل سید شریف الدین پیرزادہ نے حکومت پاکستان کا موقف پیش کیا، مشرقی پاکستان سے مسٹر اسرار الحسن ایڈووکیٹ جنرل بلائے گئے، انہوں نے بھی حکومت کے نقطۂ نگاہ کی حمایت میں بحث کی، ہر سہ حضرات کے بعد شیخ سعید اختر نے اپنے دلائل پیش کئے اور اس طرح تین روز کی سماعت لیکن پانچ دن کی حاضری کے بعد کارروائی ختم ہو گئی، جج صاحبان نے فیصلہ محفوظ رکھا ــــ ۹ ستمبر سے پورے دو ماہ بعد ۸ نومبر کو فیصلہ سنایا، میں اس دوران میں سپریم کورٹ کے ججوں کو تار دے کر اور عرضداشت لکھ کر فیصلہ سنانے کی استدعا کرتا رہا، جسٹس حمود الرحمٰن نے فل سکیپ سائز کے ۲۶ صفحوں کا فیصلہ لکھا جس میں حکومت کی اپیل مسترد کر دی، ہائی کورٹ کے فیصلہ کو برقرار رکھا کہ

۱- ڈیفنس آف پاکستان آرڈی ننس کی دفعہ ۳ (۲) میں ترمیم کے باوجود ہائی کورٹ کو آئین کے آرٹیکل (۹۸) کے تحت کسی بھی نظر بندی کے جواز سے متعلق انتظامیہ کے جاری کردہ حکم کی عدالتی چھان بین کا حق ہے۔

۲- ان خطوط پر سوچنا بھی غلط فہمی پر مبنی ہوگا کہ ڈیفنس آف پاکستان آرڈی ننس یا

اس کے تابع مرتب کردہ ڈیفنس رولز کے تحت کسی اتھارٹی کو یکطرفہ کاروائی کرنے کے لامحدود اختیارات حاصل ہیں جن پر کوئی کنٹرول یا قدغن نہیں ہے۔

۳۔ آئین کے آرٹیکل ۹۸ (۲) ب میں یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ہائی کورٹ کو اس امر کا اختیار ہے کہ وہ اطمینان کرے کہ کسی شخص کو بغیر کسی قانونی اختیار کے حراست میں تو نہیں رکھا گیا ہے۔

خدا جانے وکلاء کی سرکاری ٹیم پر کتنا روپیہ صرف ہوا، کسی کا اپنا روپیہ ہوتا تو درد ہوتا، صرف مسٹر چنگیز کو دس ہزار روپیہ فیس کے علاوہ دو ہزار روپے یومیہ دیئے گئے اس فیصلہ کے بعد ہائیکورٹ نے باقاعدہ سماعت کے لئے سولہ دسمبر مقرر کی تو ۱۲ دسمبر کو حکومت نے پھر ایک درخواست سپریم کورٹ میں گزار دی کہ نظر بند کی طرف سے غیر ضروری گواہ پیش کیے جا رہے ہیں لہذا گواہوں کی فہرست مسترد کر دی جائے، نیز سید جمیل حسین رضوی کی فیس اور اخراجات پر نظرثانی کی جائے۔ جسٹس حمود الرحمٰن، جسٹس سجاد احمد جان اور جسٹس عبدالستار نے حکومت کی یہ استدعا مسترد کر دی۔

حکومت کی ان اُٹران گھائیوں ہی نے حکومت کو رسوا کیا تھا اُس نے مجھے بے بس کرنے کے لئے یہ نقطہ نگاہ اختیار کیا تھا کہ میرے لاہور آنے سے تحریک چل جائے گی اور پنجاب میں ہنگامے ہوں گے، اس نے سرحد کے متعلق بھی یہی مفروضہ گھڑ لیا تھا، پہلی دفعہ جب مجھے عدالت میں طلب کئے جانے کے آرڈر ہوئے تو حکومت نے یہ موقف اختیار کیا کہ اپوزیشن میں شریک جماعتیں احمدیوں کے خلاف تحریک چلا کر ۱۹۵۳ء کے سے حالات پیدا کرنا چاہتی ہیں اس پر ہمارے وکلاء نے فوراً نوابزادہ نصر اللہ خان، میاں ممتاز دولتانہ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مسٹر سی آر اسلم وغیرہ کی طرف سے حلفی بیان داخل کئے کہ حکومت کا بیان غلط ہے ہمارے پیش نظر ایسی کوئی تحریک نہیں اور نہ اس الزام میں کوئی صداقت ہے؟

سپریم کورٹ کی پیشی پر شیخ سعید اختر اور میاں منظر بشیر نے کسی عنوان سے ایک پھوٹی کوڑی نہیں لی صرف دعائیں لیں لیکن اور لوگوں کی آمد و رفت کے کرایہ، ہوٹل کے اخراجات اور بعض دوسری ضرورتوں پر میری اہلیہ کے تین ہزار پچاس روپے اٹھ گئے یہ رقم اس نے اپنا اور بچوں کا زیور بیچ کر پہلے سے جمع کی تھی ــــ انصاف کتنا مہنگا ہے؟ ایک عام آدمی سپریم کورٹ تک کیونکر پہنچ سکتا ہے؟ بلاشبہ دنیا ان لوگوں کی ہے جن کی جیبیں بھری ہوئی ہیں۔

جسٹس بشیر الدین اور جسٹس شوکت علی کو اپنے ڈھب پر لانے کی ہر کوشش سے مایوس ہو کر حکومت نے ان دونوں ججوں کو بزعم خویش تنگ کرنا شروع کیا، جسٹس شوکت علی نے گورنر موسیٰ اور ان کے وزراء و حکام کو ٹکا سا جواب دیا تو انہیں شیشہ میں اتارنا چاہا یہ نسخہ بھی کامیاب نہ ہوا تو ان کے خلاف انکوائری بٹھا دی انہیں خوفزدہ کرنا چاہا، لیکن وہ شکار نہ ہو سکے، جسٹس بشیر الدین کے متعلق ان کے عزیزوں کو بلا بلا کر کہا گیا مثلاً مسٹر طارق اسمٰعیل جو اس وقت کسی صوبائی محکمہ کے سیکرٹری تھے سے کہا گیا کہ جسٹس بشیر الدین تمہارے قرابت دار ہیں انہیں سمجھاؤ، طارق اسمٰعیل نے جواب دیا کہ وہ انہیں کہنے کا حوصلہ ہی نہیں کر سکتے، جسٹس بشیر الدین کے بھائی نشتر میڈیکل کالج میں پرنسپل تھے ان کے متعلق کہا گیا کہ محکمہ صحت کا سیکرٹری کر دیا جائے گا اگر وہ ــــ اور اسؔ اگر وہ" پر جسٹس بشیر الدین کو راضی کرنا ممکن نہ تھا۔ صدر ایوب نے گورنر ہاؤس میں ان سے (جسٹس بشیر الدین) گورنر موسیٰ کی ناراضی کا ذکر کیا، جسٹس بشیر الدین نے جواب دیا کہ گورنر کو مغالطہ ہے کہ میرا شورش سے کوئی دوستانہ علاقہ ہے میں اس سے کبھی نہیں ملا، اس کے پاس کیا ہے؟ جو مجھے دے گا، جہاں تک میں نے سنا ہے وہ اس قابل ہی نہیں کہ کسی کو کچھ دے سکے گورنر میری انکوائری کرا رہے ہیں یہ مرعوب کرنے کی چالیں ہیں، میرا کل اثاثہ والد کا ایک مکان ہے میں نے خدا سے عہد کر رکھا ہے کہ اس کرسی پر بیٹھ کر انصاف کو

ترک نہیں کروں گا۔ حی و قیوم خدا ہے جان اس کو دینی ہے، اور یہ سب کچھ مدینۃ النبی میں مجھے خود جسٹس بشیر الدین نے بتایا تھا، ان سے بالمشافہ تعارف ۱۹۶۹ء میں پہلی دفعہ روضہ رسول ہی کے سامنے ہوا، اس سے پہلے میری ان سے شخصاً کوئی ملاقات نہ تھی۔ ایک آدھ دفعہ کسی تقریب یا پھر اپنے مقدمہ میں دیکھا تھا، علیک نہ سلیک، جان نہ پہچان، میں انہیں جانتا تھا کہ وہ جج ہیں وہ شاید مجھے جانتے ہوں، میرا خیال ہے مقدمے سے پہلے وہ میری صورت سے بھی ناواقف تھے لیکن حکومت نے جو اس وقت صدر اور گورنر کے شتر گربہ کا نام تھا ان کے خلاف بھی "خفیہ انکوائری" کا حربہ استعمال کیا لیکن دیانت و صداقت کہاں مرعوب ہوتے ہیں وہ یہی کہتے تھے کہ رٹ کی سماعت کے بعد وہ اصل نتیجہ پر پہنچیں گے لیکن حکومت انہیں پہلے ہی اپنے نتیجہ پر پہنچانے کی خواہاں تھی اور یہ ہائی کورٹ کی توہین کے مترادف تھا۔

حکومت نے اس بنچ کے متعلق بہت سے جتن کئے کہ وہ مقدمہ نہ سن پائے لیکن ہائی کورٹ بہرحال ہائی کورٹ تھا کوئی ضلعی عدالت نہ تھی حقیقت یہ ہے کہ ان دو ججوں نے ہائی کورٹ کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے تھے، اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ اپنے منصب پر آنچ نہیں آنے دیں گے، یہی ہوا آخر وقت تک ڈٹے رہے، بنچ سے ریٹائر ہو گئے لیکن حکومت کا سحر یا دباؤ قبول نہ کیا۔ ایوب خان کی حکومت کے سیاہ کارناموں میں یہ واقعہ ایک افسوسناک باب کی حیثیت رکھتا ہے، فی الجملہ ایوب خان کے زوال کی تاریخ میں اس واقعہ کا بڑا حصہ ہے، آمریت نے اس مقدمہ میں وہ گھٹیا حرکتیں کیں کہ غیر ملکوں میں بنچ کی سبکدوشی کا واقعہ حکومت کی رسوائی کا باعث ہو گیا۔ عالمی ضمیر چونک گیا کہ ایوب خان کی حکومت عدلیہ کو مجروح کرنے سے بھی نہیں چوکی ہے، بنچ نے سبکدوش ہونے تک تقریباً بارہ یا تیرہ آرڈر پاس کئے سب حکومت کی منشا کے خلاف اور انصاف کی منشا کے مطابق تھے اور یہی روگ حکومت کو پریشان کر رہا تھا، حکومت کی ایک پریشانی یہ تھی کہ

اس کے چہیتے وزیر احمد سعید کرمانی کو عدالت میں لایا جائے، ہم کرمانی کو اتنی اہمیت دینے کے لئے تیار نہ تھے کہ رٹ کا موضوع بن جائے لیکن اس نے اسمبلی کے ایوان میں اتنی بڑیں ہانکی تھیں کہ مقدمہ میں شامل کئے بغیر چارہ نہ تھا، اگر کرمانی سچا تھا اور جو کچھ اس نے ایوان میں کہا تھا صحیح تھا تو اس کو عدالت میں آنا چاہیئے تھا، اس نے دستور کی دفعہ ۱۷۱ کے تحت جو تحفظ مانگا اور جس کے لئے ایڈووکیٹ جنرل کو اصرار تھا وہ قانوناً درست ہی تھا تو اس کو اخلاقاً عدالت میں حاضر ہونا چاہیئے تھا، میں اس کے گریز و فرار کا پس منظر تو جانتا تھا لیکن پیش منظر سے ناواقف تھا۔

۷ جون کو مسٹر جسٹس انوار الحق اور مسٹر جسٹس محمد افضال چیمہ نے چٹان پریس کی ضبطی اور ہفتہ وار چٹان کے ڈیکلریشن کی منسوخی کے خلاف خواجہ صادق کاشمیری کی دائر کردہ رٹ پٹیشن برائے سماعت منظور کر لی لیکن مسٹر جسٹس قاضی محمد گل اور مسٹر جسٹس کرم الٰہی چوہان پر مشتمل ایک دوسرے بنچ نے یکم جولائی سے ۸ جولائی تک اس کی سماعت کی، جسٹس گل نے فل سکیپ سائز کے ۲۵ صفحہ کا فیصلہ لکھا، جسٹس چیمہ نے صاد کیا، جسٹس محمد اقبال نے ۲۷ جولائی کو فیصلہ سنایا، سرکار کی طرف سے راجہ سید اکبر، مسٹر اسلم ریاض حسین، مسٹر اعجاز علی اور اٹارنی جنرل شیخ غیاث محمد پیش ہوئے، چٹان کی طرف سے شیخ سعید اختر نے بحث کی فیصلہ کیا ہوا، یہ کہ ۱۴ اپریل کے شمارے اور چٹان پریس کی ضبطی کے بارے میں تو حکومت کا مقرر کردہ ٹریبونل ہی فیصلہ کرنے کا مجاز ہے البتہ چٹان کے ڈیکلریشن کی تنسیخ کا فیصلہ اس بنا پر کالعدم قرار دیا جاتا ہے کہ تنسیخ سے پہلے اظہار وجوہ کا نوٹس جاری نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ فیصلہ پروان نہ چڑھا، پریس ضبط تھا جب پریس بدلنے کی درخواست دی گئی تو کرمانی کے محکمہ نے اس درخواست کو اس وقت تک دبائے رکھا جب تک حکومت کی ارتھی شمشان بھومی پر نہیں چلی گئی، عملاً ہائی کورٹ کا فیصلہ حکومت نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اخبار اور پریس لازم و ملزوم ہوتے ہیں، پریس کسی اخبار کا کمرشل مسئلہ ہے

وہ ڈیکلریشن کوئی معنی نہیں رکھتا جس کے ساتھ پریس میں طباعت کی منظوری نہ ہو، ہائیکورٹ میں اس دھاندلی کے خلاف درخواست گزاری گئی لیکن سماعت میں اتنی تاخیر ہو گئی کہ عدالتی فیصلہ سے پہلے حکومت نے عوامی تحریک کی تاب نہ لا کر ڈیکلریشن اور پریس واپس کر دیئے، ہم نے تحریک اتنی تیز کر دی تھی کہ حکومت کے لئے اور کوئی چارہ کار نہ رہا تھا۔

پریس کی ضبطی پر مُہر لگوانے کے لئے حکومت نے مسٹر محمد ایوب سپیشل جج انٹی کرپشن لاہور کا تقرر کیا انہوں نے حکومت کی درخواست منظور کرتے ہوئے کراچی میں سماعت کا فیصلہ کر دیا۔ اور ایک دن پہلے سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل کی معرفت مجھے تار دیا کہ وہ ۱۶ار جولائی کو کراچی سنٹرل جیل میں عدالت جمائیں گے یہ قانون وانصاف کے مسلمات کی توہین تھی کہ ایک شخص جو گھر سے سینکڑوں میل دور نظر بند ہے اُس کی جائیداد پر ضبطی کی توثیقی مُہر لگانے کے لیے عدالت جیل خانے میں اجلاس کرنے پر راضی ہو گئی اور اسے احساس تک نہ رہا کہ نظر بند وہاں قانون سے کیونکر فائدہ اٹھا سکتا ہے؛ جبکہ اس کی طرف سے کسی وکیل کا انتظام بھی نہیں ہے، حکومت اتنی فروتر ہو چکی تھی کہ انٹی کرپشن کے ایک جج کی عدالت میں اپنے ایڈووکیٹ جنرل اور اس کی ٹیم کو لے آئی تھی، غرض ٹربیونل کراچی پہنچ گیا، ایڈووکیٹ جنرل بھی اپنے رفقا سمیت حاضر ہو گئے ان کی روانگی مصدق ہو گئی تو خواجہ صادق کاشمیری نے پندرہ جولائی کی صبح کو ہائی کورٹ میں درخواست گزار دی کہ ٹربیونل کراچی میں مقدمہ سماعت کرنے کا مجاز نہیں مسٹر جسٹس نسیم حسن شاہ اور مسٹر جسٹس چودھری محمد صدیق نے تین بجے سہ پہر یہ استدعا منظور کر لی اور ٹربیونل کو تا حکم ثانی سماعت سے روک دیا۔

۱۶ار جولائی کی صبح کو سنٹرل جیل کے اندر اسکول کی عمارت میں جو میری بیرک کے دائیں طرف تھی، مسٹر محمد ایوب خان کی عدالت جمائی گئی راجہ سید اکبر بھی آ گئے، میں سامنے

بیرک میں بیٹھا ان کے انتظار کا لطف لے رہا تھا، کئی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مجھے بلانے آتے رہے میں مزے لیتا رہا —— کہہ دو کہ نظر بند ابھی اخبار پڑھ رہا ہے ابھی وہ نہایا نہیں، ابھی چائے پینی ہے ڈیڑھ ایک گھنٹہ یہی تماشا رہا اتنے میں معلوم ہوا کہ عدالت، ایڈووکیٹ جنرل اور ان کے ساتھی برخاست ہو کر جا رہے ہیں، انہیں ہائی کورٹ سے حکم امتناعی آ گیا ہے۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ مندرجہ ذیل تحریری بیان داخل کر کے عدالت کو تنہا چھوڑ آؤں گا، وہ جانے حکومت جانے اور اس کے وکلاء جانیں ذیل کا بیان سپرنٹنڈنٹ جیل کے پاس رہ گیا۔

بعدالت مسٹر محمد ایوب سپیشل جج ٹربیونل، اینٹی کرپشن،

ویسٹ پاکستان حال وارد سنٹرل جیل کراچی،

مقدمہ بہ عنوان ضبطی چٹان پریس و تنسیخ ہفتہ وار چٹان

التماس ہے

۱۔ مجھے اس امر کی اطلاع ۱۳ جولائی کی سہ پہر کو دی گئی ہے کہ آپ یہاں عدالت کرنے آ رہے ہیں، لیکن مقام سماعت کی اطلاع مجھے کل ۱۵ جولائی کی سہ پہر کو ہوئی ہے۔

۲۔ مجھے قطعاً معلوم نہیں کہ امروزہ سماعت کی غرض کیا ہے۔

۳۔ جیل خانہ کی چار دیواری میں عدالت کا انعقاد قانون و انصاف کے ان شہ پاروں میں سے ہے جس کی نظیر اس سے پہلے دید و شنید میں نہیں آئی ہے۔

۴۔ مقدمہ اپنے آثار و کوائف کی رو سے لاہور کا ہے لیکن حکومت نے بعض مفروضوں کی بنا پر مجھے گھر سے آٹھ سو میل کے فاصلہ پر قید کر رکھا ہے نظر بندی کے ان طویل ایام میں صرف ایک دفعہ لاہور سے میری بیوی، برادر نسبتی اور بیٹی ملاقات کے لئے یہاں آئے ہیں۔

۵۔ مجھے آج تک مقامی رشتہ داروں سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی، ان کی کئی درخواستیں سی آئی ڈی کے نگار خانہ میں غازہ التفات کی راہ دیکھ رہی ہیں۔

۶۔ میں بیرونی دنیا سے یکسر منقطع ہوں اور اپنے مقدمات میں قانونی مشورت سے بھی محروم ہوں۔

۷۔ پریس اور اخبار ضبط کر کے میری معیشت کی شہ رگ کاٹ دی گئی ہے، اندریں حالات اپنی طرف سے نہ تو کوئی وکیل کر سکتا ہوں اور نہ مجھے قانونی چارہ جوئی کے خدوخال کا علم ہے۔

۸۔ اگر عدالت کا امروزہ اجلاس عنوان بالا کی سماعت کے لئے ہو رہا ہے تو یہ محض ایک تکلف ہوگا آپ خود اندازہ فرمالیں کہ جیل خانے کی اس چہار دیواری میں حکومت کے اعوان و انصار کیل کانٹا سے لیس ہو کر موجود ہیں اور فاضل عدالت بھی ان کی درخواست پر مجرموں کی اس نگری میں فروکش ہے لیکن میں قید خانہ کی اس چہار دیواری میں تن تنہا ہوں، اس پس منظر بلکہ تہہ منظر سے میرا یہ احساس اور مضبوط ہو جائے گا کہ میں قانون کی کربلا میں تشنہ لب کھڑا ہوں اور حصول انصاف میرے لئے گویا فرات کا پانی ہو گیا ہے۔

۹۔ فاضل ایڈووکیٹ جنرل کی دائر کردہ درخواست بابت ۸ جولائی، ۷ جولائی اتوار کو گیارہ بجے صبح لاہور کے ایک سب انسپکٹر سی آئی ڈی کی معرفت یہاں پہنچی جہاں تک میری معلومات ہیں کوئی عدالت اتوار کو اپنے احکام کی تعمیل نہیں کراتی لیکن ۹ جولائی کی شکم پری کے لئے اتوار کا دن بھی استعمال کیا گیا۔

۱۰۔ میں نے اپنے دوست راجہ سید اکبر جو کبھی ہمارے ساتھ اپوزیشن میں سیاسی کہہ مکرنیاں تصنیف کیا کرتے تھے کی محولا بالا عجیب الخلقت درخواست کے

ضمن میں تحریر کیا تھا کہ مجھے طلب کئے بغیر اس کی سماعت نہ کی جائے ورنہ یک طرفہ کارروائی متصور ہوگی اسی مطلب کا ایک تار سپرنٹنڈنٹ جیل کی معرفت دیا تھا۔

۱۱۔ معلوم ہوتا ہے میری موجودگی کے بغیر کارروائی کی گئی جناب ایڈووکیٹ جنرل نے لولوئے لالہ بکھیرے، عدالت نے صاد کیا حتیٰ کہ رخت سفر باندھ کر کراچی میں قدم رنجہ فرمایا، یہ اجلاس غالباً اسی کا مطلع ہے۔

۱۲۔ میرے دل میں عدالتوں کے لئے بے پناہ احترام ہے میں اس ملک میں انہیں غریبوں اور محروموں کے لئے حصول انصاف کی واحد اُمیدگاہ سمجھتا ہوں، فاضل عدالت ایک لحہ کے لئے غور فرمایئے کہ ایک شخص جس کو عزیزوں سے دور اور قانونی معاونت سے محروم رکھا گیا ہے حتیٰ کہ اس کے ساتھ ملاقات بھی صوبائی حکومت کے پروانہ خسروی سے ہوتی ہے اس کو ایکا ایکی اس پابہ زنجیر فضا میں عدالت کے سامنے لانا کس جلی وخفی قاعدہ انصاف کی رو سے جائز ہے؟ کیا میری وکالت جیل مینول کے بوڑھے اوراق کریں گے؟ اور میرے گواہ یہ لمبی اُونچی دیواریں ہوں گی؟ اور ان آہنی سلاخوں سے نظائر وشواہد طلب کئے جائیں گے؟

۱۳۔ فاضل عدالت آگاہ ہوگی اور غالباً ایڈووکیٹ جنرل نے بھی عدالت کو مطلع کیا ہوگا کہ اسی مقدمہ کی سماعت ہائی کورٹ کا ایک ڈویژن بنچ کر چکا ہے اس کا فیصلہ ابھی تک محفوظ ہے ظاہر ہے کہ ہائی کورٹ اس عدالت کے مقابلہ میں ایک اعلیٰ عدالت ہے کیا اس دوران میں اس عدالت کو سماعت کا اختیار ہے؟ کیا یہ دُہری کارروائی نہیں؟ اور اس سے ہائی کورٹ کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا ہے؟

۱۴۔ میں نے ۷ جولائی کو ایڈووکیٹ جنرل کی درخواست پر جو کچھ لکھا پھر یہاں سے تار کے ذریعہ استدعا کی کہ اس استدعا کو غائبانہ مسترد کر کے فاضل عدالت نے اگر

کوئی یک طرفہ فیصلہ کیا ہے تو مجھے سب سے پہلے اس فیصلہ کی نقل مہیا کی جائے کیونکہ مذکورہ فیصلہ اسلامک ری پبلک آف پاکستان کے آئین کی دفعہ ۲ کے منافی ہے، میں کانسٹی ٹیوشن کے آرٹیکل ۹۸ کے تحت اس غیر قانونی اور ناجائز فیصلہ کے خلاف رٹ کرنا چاہتا ہوں کہ اس معصوم عن الخطا حکومت کے نمائندوں نے مجھے حاضری سے بالارادہ محروم رکھ کر حسب منشا فیصلہ حاصل کیا ہے، ایسے فیصلہ سے عدالتی مسلمات کی نفی ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ احساس مرتب ہوتا ہے بہ قول ابوالکلام آزادؒ کہ "تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں جنگ کے میدانوں کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہوئی ہیں"۔

کراچی سنٹرل جیل — شورش کاشمیری

۱۶ر جولائی ۱۹۶۸ء — نظر بند بجرم ختم نبوت

ہر عدالتی محاذ اور اخلاقی میدان میں شکست کھانے کے بعد حکومت حواس باختہ ہوگئی اس کے ایڈووکیٹ جنرل نے ڈویژن بنچ کو جانبدار Biase کہہ کر ایک ایسا جرم کیا کہ اس سے پہلے ہائی کورٹ کی پوری تاریخ میں توہین کا ایسا واقعہ نہیں ملتا۔ اس ساری کہانی کی تفصیلات آئندہ بیان ہوں گی، یہ ہائی کورٹ کا حوصلہ تھا کہ اس نے سید اکبر کو معاف کر دیا اور یہ حکومت کا نخرہ تھا کہ اس نے اپنے ایک نمائندے کو اتنی جرأت دلائی کہ وہ ہائی کورٹ کی توہین کا مرتکب ہوا اس کے بعد ایسی حکومت کی جتنی توہین کی جاتی کم تھی۔



سنٹرل جیل کراچی

کراچی سنٹرل جیل میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد سپرنٹنڈنٹ جیل چودھری نذیر اختر آگئے، وہ ایک پڑھے لکھے انسان تھے ان کے چہرے مہرے اور بات چیت سے ان کی شرافت کا اندازہ ہو گیا۔ انہوں نے چار باتیں کیں۔

۱۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

۲۔ دل اُداس ہو تو میرے دفتر چلے آیا کریں۔

۳۔ کوئی ایسا خط نہ لکھئے جو بے ضابطہ **(Unauthorised)**

۴۔ آپ کے متعلق حکم یہ آیا ہے کہ ایسا کوئی مشقتی (قیدی خدمت گار)، مقدم (قیدی پہرے دار) اور وارڈر نہ دیا جائے جو پنجابی ہو۔

میں نے اُن سے کہا،

"سنٹرل جیل ڈیرہ اسمٰعیل خان کے سپرنٹنڈنٹ سے میری طبیعت سخت منغص ہوئی ہے میں نہیں چاہتا وہ برتاؤ یہاں ہو، آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی، رہا دل تو وہ اُداس نہیں ہوتا، زیادتی سے خفا ہوتا ہے کوئی بلا واسطہ خط نہیں جائیگا، رہا یہ سوال کہ مشقتی، مقدم اور وارڈر کون ہو تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں، آپ جس کو لگا دیں مجھے اعتراض نہیں، آپ کی مرضی پر موقوف ہے، البتہ ایک خواہش میری ضرور ہے کہ ذیابیطس کی وجہ سے میں صبح و شام ٹہلنے کا عادی ہوں، مجھے اجازت

دی جائے کہ جیل کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ٹہل سکوں۔ سپرنٹنڈنٹ نے فوراً ہاں کر دی، اس کے بعد وہ آدھ پون گھنٹہ تاریخ پر گفتگو کرتے رہے، معلوم ہوا جیل کے بیشتر حکام کی طرح اجہل نہیں وسیع المطالعہ ہیں اور تاریخ سے شناسائی رکھتے ہیں، جو بلاک مجھے دیا گیا وہ سامنے سے کھلا تھا، اندر کیاریاں تھیں جن میں پھول کھلے ہوئے تھے بلاک کا نقشہ کچھ اس طرح تھا۔

رات جمی ہوئی تھی، کھانا کھا کے سو رہا، صبح اٹھا جیل خانہ کا جائزہ لیا تو ڈیرہ اسمٰعیل خان کے بوچڑ خانے کی بہ نسبت نگار خانہ تھا۔ اس خاکہ کے مطابق عمارت تھی۔

ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں غیر ملکی قیدی بھی تھے، پہلا حصہ صاف ستھرا تھا، نہ تو ڈیرہ اسمٰعیل خان جیسی اندھیر گردی تھی اور نہ ساہیوال سنٹرل جیل کی سی بہیمت قیدی اور افسر دونو مطمئن تھے، اہلکار خوش مزاج تھے ان میں استبداد کی خُو بُو نہیں تھی اُس وقت وہاں کوئی دوسرا پولیٹیکل قیدی بھی نہ تھا، دو یا تین مزدور لیڈر سی کلاس میں نظر بند تھے، ان کی حکایت یہ تھی کہ مل مالکوں نے مقامی افسروں سے مل کے انہیں جیل میں ڈلوا دیا تھا وہ بے چارے بلاشبہ ستم رسیدہ تھے، بی کلاس میں وہ لوگ بھی تھے جو سرکاری ملازمتوں میں رشوت یا غبن کے جرم میں قید ہوتے تھے، دو اطالوی اور تین انگریز تھے جنہیں چرس سمگل کرنے کے الزام میں پکڑا گیا تھا، ایک جاپانی جاسوس تھا ایک، چینی ترکستان کا مہاجر اور کچھ بنگالی نوجوان، جو قتل کے مقدمہ میں ماخوذ تھے ان کے علاوہ بی کلاس میں قاسم بھٹی تھا جو پہلی دفعہ اسکندر میرزا کے زوال پر سمگلنگ، کے الزام میں پکڑا گیا، اب غنڈہ ایکٹ، کے تحت ماخوذ تھا، اس کے علاوہ کراچی کے مشہور "اہل فن" کالا ناگ، اور شیرو بلوچ بھی اندر ہی تھے، کالا ناگ تو جوں کا توں تھا لیکن شیرو نے داڑھی چھوڑ دی اور حفظ قرآن پر زور دے رکھا تھا، وہ قیدیوں کو نماز پڑھاتا اور روزے رکھاتا تھا۔ معلوم ہوا کہ مولانا احتشام الحق نے اس کی سرشت بدل دی ہے۔

میرے بلاک کے ساتھ کی بیرک میں کچھ نوجوان قتل کے مقدمہ میں ماخوذ رہے تھے، امرتسر کا ایک نوجوان اعظم ان کا چیف، تھا بڑی بات یہ تھی کہ تازہ گرفتار شدگان میرے ساتھ کی بارک میں ہر روز آتے جاتے ان میں کچھ بابو لوگ ہوتے، اکثریت ان لوگوں کی ہوتی جنہیں پولیس بلاوجہ دھر کے بھیج دیتی دو چار دن میں اُن کی ضمانت ہو جاتی لیکن جتنے دن رہتے انہیں چھوٹے عملہ کو رشوت دینی پڑتی نہ دیتے تو خوار ہوتے۔ ہر حوالاتی (انڈر ٹرائل) سے بلاقاعدہ نالیاں صاف کرائی جاتیں، میری وجہ سے ایک فائدہ ہو گیا کہ پڑھے لکھوں کو اس بیگار سے نجات مل گئی۔

یہاں پنجابی برانڈ قیدی نہیں ہوتے کراچی کے جرائم کی نوعیت ہی دوسری ہے۔ اکثر فریب دہی، جعل سازی، غبن یا ہلکی پھلکی چوری میں ماخوذ ہو کے آتے ہیں، پولیس کیا کرتی ہے اس کی تصویریں یہاں مل جاتی ہیں، جن لوگوں کا میں نے ذکر کیا اُن کی زبانی جو واقعات معلوم ہوئے اور روزمرہ کے مشاہدہ نے جس امر کی توثیق کی وہ یہ تھا کہ کراچی جتنا خوبصورت ہے اتنا ہی گھناؤنا ہے، یہاں نیکیاں بھی ہیں اور بدیاں بھی، کسی انتظامیہ کے لئے اس سے بڑا آمدنی کا شہر نہیں، یہاں جرم کے بغیر بھی بہت سے لوگ سزا بھگتتے ہیں۔

میں کسی حد تک اس لحاظ سے اجنبی تھا کہ یہاں کسی سے میرا سیاسی رشتہ نہ تھا، عوام مجھے اس طرح نہیں جانتے تھے جس طرح پنجاب یا سرحد کے لوگ واقف تھے، میر خلیل الرحمٰن مدیر جنگ میرے دوست تھے لیکن میرے لئے کوئی "خطرہ" مول نہ لے سکتے تھے اور اس میں حق بجانب تھے، میرا ان پر کوئی حق نہ تھا، ایوب خان یا موسیٰ خان کی ناراضی مول لینا آسان نہ تھا، بعض دوسرے اخبار نویس و ورکنگ جرنلسٹ، جن سے دوستانہ علاقہ تھا ان سنگین پابندیوں میں ملنے ملانے سے معذور تھے، میرے دو خلیرے بھائی وہاں تھے لیکن انہیں ملاقات کی اجازت نہ تھی، انور عارف جگری دوست تھا لیکن حکومت اس کے معاملہ میں نامہربان تھی۔

نظر بند ہوئے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا لیکن حکومت نے ابھی تک ملاقاتیوں کی فہرست ہی منظور نہ کی تھی، کراچی بھجوا کر بھی مقامی عزیزوں کو ملاقات کی سہولت نہ دی، قواعد نظر بندی کے تحت ہر ہفتہ ملاقات ہو سکتی ہے ظاہر ہے کہ لاہور سے ہر ہفتہ بیوی بچوں کا آنا مشکل تھا، کراچی میں جو عزیز تھے یا دوست! وہ سیاسی بالکل نہ تھے لیکن حکومت منتقم ہو چکی تھی ایک نظر بند ہفتہ میں چار خط لکھ سکتا اور جس قدر باہر سے آئیں وصول کر سکتا ہے دونوں صورتوں میں خطوں کو سی آئی ڈی

دسپیشل برانچ) سینسر کرتی ہے، خط لکھو سپرنٹنڈنٹ کو دو وہ سپیشل برانچ کے دفتر بھیجے وہاں سینسر ہو پھر واپس آئے تب ڈاک کے حوالے ہو، یہی معاملہ باہر سے آنے والے خطوں کا تھا، ڈیرہ اسماعیل خان میں سرکاری طور پر مجھے کوئی خط نہ ملا تھا، کراچی میں ابتداً یہی ہوا، البتہ دوسرے تیسرے روز ایک بن باپ کا خط آنے لگا، جس پر ڈاک خانہ کی مہر غائب ہوتی اس خط میں گالی گلوچ کے سوا کچھ نہ ہوتا، لازماً ان خطوط کا نویسندہ کوئی میرزائی تھا میں نے سی آئی ڈی کی اس بدمذاقی پر احتجاج کیا، نتیجتہً وہ خطوط رک گئے، یکم جون کو میں کراچی پہنچا، تین جون کو ہائیکورٹ میں پیش ہونے گیا اس دن لاہور سے ڈویژن بنچ نہ آسکا، ہائی کورٹ میں پولیس اور سی آئی ڈی کا ازدحام تھا شہر کے لوگ خاصی تعداد میں جمع ہو گئے تھے پولیس ان سے بلاوجہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ مجھے مال مسروقہ کی طرح چھپائے پھرتی۔ ہدایات لاہور سے جاتی تھیں، مجھے خواہ مخواہ ایک خطرہ بنا دیا تھا۔ ع

کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہ تھا

سب سے بڑی پریشانی جو اس دن پولیس کے لئے مصیبت کا باعث ہوئی وہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی عدالت میں آمد تھی۔ پولیس نے حائل ہونا چاہا میں نے آگے بڑھ کے بھٹو سے معانقہ کیا، بس یہ ایک ایسا خطرہ تھا جس سے حکومت اور بھی ننگی ہو گئی پولیس نے رجسٹرار سے تاریخ لے کر مجھے فوراً واپس کر دیا۔

۲۴ جون کو دوبارہ حاضری تھی لیکن حکومت پہلے ہی سپریم کورٹ میں چلی گئی اس کا ذکر آچکا ہے کہ وہاں ۹ ستمبر کی تاریخ مل گئی، ۹ نومبر کو فیصلہ سنایا گیا، اس طرح سب سے بڑی عدالت کے باعث سماعت کی میعاد میں چھ مہینے اور تیرہ دن بڑھ گئے اس طویل تاریخ کے بعد سپرنٹنڈنٹ مجھے ڈیرہ اسمٰعیل خان واپس کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے پانچ منٹ میں فون پر لاہور اطلاع کرادی وہاں سے دس منٹ کے اندر اندر

خواجہ صادق کاشمیری نے سپرنٹنڈنٹ سے استفسار کیا، ہائی کورٹ کی واضح طور پر ہدایت تھی کہ جب تک مقدمہ ختم نہ ہو نظر بند کو کراچی رکھا جائے، نتیجۃً چالان رک گیا، لیکن سپرنٹنڈنٹ حیران تھا کہ خبر اتنی جلدی لاہور کیونکر پہنچی کہ وہاں سے فٹا فٹ ٹیلی فون آگیا سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے پوچھا میں نے ہنس کر ٹال دیا کہ یہ کام ہمزاد کرتے ہیں اس قسم کا واقعہ ہو تو جیل والے نگرانی میں سختی کر دیتے یا خدمت گاروں کو بدل دیتے ہیں لیکن میں کبھی ان لوگوں سے کام نہیں لیتا جو میری ڈیوٹی پر ہوں، میرے ہمزاد کچھ اور ہی لوگ تھے، حکومت کے سنگدلانہ رویہ سے تنگ آکر میں نے اُڑتی ہوئی خط و کتابت اور گرفت سے بالا بالا نام و پیام کا تہیہ کر لیا، گھریلو خط و کتابت میں اس قسم کا انتظام کیا کہ کوئی سی کوشش بھی ان خطوط کے پکڑنے پر قادر نہ ہو اور اگر وہ خطوط پکڑے جائیں تو ان میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو قابل اعتراض ہو، پر لطف چیز یہ تھی کہ صدر ایوب گورنر موسیٰ، ہوم سیکرٹری وغیرہ کو بہت سے بے ضابطہ خط لکھے، بعض خط باہر سے ٹائپ کراتے ان پر دستخط کئے اور رجسٹرڈ بھجواتے، میرے علم کے مطابق جیل والوں سے مطلقاً نہ پوچھا گیا کہ یہ خط کیونکر پوسٹ ہوتے ہیں، کسی کو علم ہی نہ تھا کہ جو خط ان کے نام آرہے ہیں وہ خلاف قاعدہ ہیں۔

اور جو خط میرے نام آتے تھے انہیں حاصل کرنے کے لئے مجھے بڑی جد وجہد کرنی پڑتی، وہ خط مسلسل غائب ہو رہے تھے میں نے اس دھاندلی پر ہوم سیکرٹری کو پے در پے خط لکھے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات آخر میں نے ۱۲ جون کو سپرنٹنڈنٹ جیل کی معرفت کراچی ہائی کورٹ میں مسٹر یار محمد سپرنٹنڈنٹ پولیس سپیشل برانچ کے خلاف درخواست گزاری کہ میرے خط ان کے ہاں مسلوب و مصلوب ہوتے ہیں انہیں روکا جائے ۲۶ جون کو سید علی مددشاہ ایڈیشنل جج نے مجھے خط لکھا کہ حسب ہدایت ہائی کورٹ کو مطلع کردوں کہ:

۱۔ وہ کونسے خطوط یا کوئی خط ہے جن کی ترسیل میں مدعا علیہ نے آٹھ یا نو دن تاخیر کی ہے اس کے متعلق کوائف مہیا کیے جائیں۔

۲۔ سرکاری مہر اور دستخط کے بغیر جو قواعد نظربندی کی رو سے خطوط پہ لازم ہیں یہ کیونکر معلوم کیا ہے کہ ان کی ترسیل میں آٹھ یا نو دن کی تاخیر ہوئی ہے۔

۳۔ وہ لفافے اور ٹکٹ مہیا کئے جائیں جنہیں مدعا علیہ نے بدچہرہ کیا ہے۔ مزید برآں یہ بتائیں کہ آپ نے یہ کیونکر اندازہ کیا کہ اس کا مسئول مدعا علیہ ہے۔

میں نے ۲۷ کو جواب میں لکھا کہ آنریبل کورٹ کچی پیشی مقرر کرے میں تصریح طلب دستاویز پیش کر دوں گا تاکہ اس کی روشنی میں باقاعدہ سماعت کی تاریخ مقرر ہو۔

اس چیز نے بھی حکومت کو پریشان کیا وہ مجھے عدالت کی حاضری سے باز رکھنا چاہتی تھی یہ ایک نیا جھگڑا تھا اس کے دوسرے یا تیسرے روز چودھری نذیر اختر سپرنٹنڈنٹ جیل تشریف لائے اور کہا درخواست واپس لے لو آئندہ ڈاک کی شکایت نہ ہو گی، یار محمد کی چٹھی آگئی ہے کہ ڈاک بھیجنے کی ضرورت نہیں، وہ پوسٹ آفس میں سنسر کر لیں گے۔ اس طرح یہ قضیہ ختم ہو گیا۔ نتیجۃً ڈاک باقاعدہ ملنے لگی، پہلے کوئی خط نہیں ملتا تھا اب ہر روز دس دس بارہ بارہ خط ملنے لگے۔

اَیکبے میں نے حکومت سے مطلقاً درخواست نہ کی کہ بیمار ہوں میرا علاج کرایا جائے یا مجھے ہسپتال بھیج دیا جائے، میرا علاج میری کتابیں تھیں جو میں نے گھر سے منگوالی تھیں یا میرا قلم کہ میں نے اپنے سوانح حیات لکھنا شروع کئے، نوشت و خواند میں اتنا ڈوب گیا کہ بیماری کا احساس ہی نہ رہا، باہر پبلک جلسوں نے حکومت کو اتنا تنگ کر رکھا تھا کہ اپنے کئے دھرے پر پچھتا رہی تھی ہر روز پیشاب ٹیسٹ کیا جاتا، خون ٹیسٹ کرنے کے لئے سول ہسپتال سے اہلکار آتے ایک اسسٹنٹ پروفیسر نے معائنہ کیا کوئی ہفتہ بعد پروفیسر افتخار احمد دیکھنے آگئے۔ معلوم ہوا کہ میرے بچوں

کے زبردست احتجاج پر حکومت نے سپرنٹنڈنٹ کو لکھا ہے کہ پروفیسر سے کمتر کوئی ڈاکٹر میرا معائنہ یا علاج نہ کرے، پروفیسر افتخار احمد دیکھ بھال کے چلے گئے ان کی تجویز کردہ دوائیں کھا رہا تھا اور مطمئن تھا، قواعد کی رو سے مجھے حق حاصل تھا کہ اپنا معالج نامزد کروں، پروفیسر افتخار احمد نے جتنی محنت کی اُس سے طبیعت کو اطمینان ہو گیا، ایک دوسرے پروفیسر ڈاکٹر احمد بینائی ٹیسٹ کرنے آتے، وہ بھی اپنی شرافت کا اثر چھوڑ گئے وہ ہفتہ میں ایک آدھ دفعہ آنے لگے، علاج ہوتا رہا، جون کے دوسرے ہفتہ میری بیوی آگئی اس نے صحت کو متزلزل پایا، ڈیرہ اسماعیل خان سنٹرل جیل کا برتاؤ سُنا تو متوحش ہوئی لاہور جا کر اس نے وہ ہنگامہ کیا کہ حکومت کو کان ہو گئے اس نے گورنر موسیٰ کو پہلے تو خط لکھا پھر بچوں اور بہنوں کو لے کر گورنر ہاؤس چلی گئی وہاں مظاہرہ کیا، اخبارات میں ان دنوں کچھ نہیں آتا تھا اور عوامی تحریک ابھی اُبھری نہیں تھی لیکن خاندان کی اس مٹھی بھر جماعت نے گورنر ہاؤس کو سیدھا کر دیا۔ وہ خط یہ تھا۔

جناب گورنر مغربی پاکستان،

لاہور

سلام مسنون،

میرے شوہر آغا شورش کاشمیری جو اس وقت تحفظ ختم نبوت کے جرم میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت زنداں کی نذر ہیں گرفتاری سے پہلے میو ہسپتال لاہور میں دس بارہ روز شدید علالت کے باعث زیر علاج رہے تھے، میو ہسپتال میں ڈاکٹروں کے علاج سے ان کی شوگر کنٹرول ہو گئی تھی انہوں نے ۲ مئی ۱۹۶۸ء کو ہسپتال چھوڑا ۷ مئی ۱۹۶۸ء کی رات کو انہیں گرفتار کر کے ڈیرہ اسمٰعیل خان جیسی

دُور دراز اور ہر قسم کی سہولتوں سے محروم جیل میں پہنچا دیا گیا۔

آغا شورش کاشمیری کے ڈیرہ اسمٰعیل خان جیل میں نظر بند رہنے کے دوران سپرنٹنڈنٹ جیل ڈیرہ اسمٰعیل خان نے انہیں پھانسی کی کوٹھڑی میں رکھا اور انہیں زہر (Slow Poison) دینے کی کوشش کی گئی، ڈیرہ اسمٰعیل خان کی اذیتوں کے باعث وہ اب تک بیمار ہیں۔ ان کی شوگر خطرہ کی حد سے تجاوز کر چکی ہے بینائی کمزور ہو رہی ہے جسم کے مختلف حصے عموماً سُن رہتے ہیں،

میں آپ سے مطالبہ کرتی ہوں کہ اس امر کی تحقیقات کرائی جائے کہ میرے شوہر آغا شورش کاشمیری کو زہر دینے کی سازش میں کون کون شریک تھا کس کس نے اپنے مذہبی، سیاسی اور ذاتی اختلافات کی بنا پر میرے شوہر کو ختم کرانے کی سازش کی، امید کرتی ہوں کہ آپ پاکستان کے ایک معزز صحافی اور آزاد خیال سیاست دان، محب الوطن شاعر اور قومی ادیب کو زہر دے کر مروا دینے کی اس سازش کی فوری تحقیقات کرائیں گے۔

(خورشیدہ بیگم شورش کاشمیری)
۲۴ شاہراہ قائداعظم، لاہور

نقل برائے اطلاع۔

۱۔ ہوم سیکرٹری حکومت مغربی پاکستان، لاہور
۲۔ مسٹر اے بی اعوان سیکرٹری وزارت داخلہ، حکومت پاکستان راولپنڈی
۳۔ مسٹر الطاف گوہر سیکرٹری محکمہ اطلاعات، حکومت پاکستان، راولپنڈی

اس غرض سے کہ ہم زندہ ہیں۔

میر عبدالباقی بلوچ جو تقریباً دو سال سے نظر بند تھے انہی دنوں لاہور سے کراچی آ گئے، میں ان سے پہلے متعارف نہ تھا وہ آئے تو ان سے تعارف ہو گیا۔ وہ اپنا مقدمہ خود لڑتے اور قانون و دستور کے حافظ ہو گئے تھے اس کے علاوہ وہ بڑے ذہین سمجھدار اور سیاسیات کے مزاج دان طالب علم تھے، ان کا ادبی ذوق بہت اچھا تھا وہ بلوچستان اور سندھ کے پالیٹیکس پر بڑے کام کی باتیں کرتے، وہ لاہور میں کئی گولیاں کھا کر بچ رہے تھے، ان کا بچنا ایک معجزہ تھا ملک کی سیاست سے وہ خود کٹ گئے، بہرحال اس تنہائی میں بھی ایک انجمن تھے دو چیزیں انہیں مرغوب تھیں ایک انگریزی کھانے، دوسرے مطالعہ، میں ان دنوں اپنے سوانح لکھ رہا تھا اور مجھے خلوت کی ضرورت تھی لیکن باقی آجاتے تو بین الاقوامی سیاست پر گھنٹوں باتیں کرتے، انہیں بلوچستان سے ایرانی سرحد تک ایران کو وہ زمینی پٹی دینے پر سخت اعتراض تھا جو صدر ایوب نے بخش دی تھی وہ اس کو پاکستان کے ایران سے دوستانہ تعلق خاطر کا مہمل ایثار سمجھتے تھے، اس غرض سے انہوں نے عدالت عالیہ میں مقدمہ کر رکھا تھا، لیکن پھر اپنی رائے پر نظر ثانی کر کے واپس لے لیا — انہیں دست شناسی کا بہت شوق تھا میں بھی کچھ دلچسپی رکھتا تھا میری دست شناسی سے وہ بہت خوش ہوئے آخر ایک دن ہائی کورٹ سے رہا ہو گئے۔ اسی دوران میں حیدر بخش جتوئی آ گئے وہ ایک معمر انسان تھے سندھ کے ہاری لیڈر! انہیں بھی سندھی لیڈروں کی طرح پنجاب سے سخت گلا تھا، وہ کھلم کھلا اس کا اظہار کرتے ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ دو چیزوں سے ناراض ہیں۔

اولاً: پنجابی افسروں کا رویہ ان کے خیال میں صحیح نہ تھا، ملک میں جو سیاسی سازشیں ہوتی رہیں وہ ان سب کا ذمہ دار پنجابیوں کو گردانتے تھے۔

ثانیاً: وہ سندھ کی زمینوں پر پنجابیوں کے تصرفات کو ناجائز سمجھتے تھے۔

مجھ سے اکثر ان کی بحث ہوتی انہیں تعجب تھا کہ میں پڑھا لکھا آدمی ہو کر

مذہب پر یقین رکھتا ہوں، وہ اس زمانہ میں قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کر رہے تھے۔ سندھی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے اپنی اہلیہ کی یاد میں کئی نظمیں لکھی تھیں۔ کسانوں کے لئے ان کے دل میں بڑا درد تھا وہ پی سی ایس سے ریٹائر ہو کر مصائب و ابتلا کے اس راستہ پر گامزن ہوئے تھے ان میں اختلاف فکر و نظر کے باوجود ایک بڑے آدمی کی شرافتیں پائی جاتی تھیں، وہ بلوچ تھے، ایک اور بلوچ نوجوان ——— جلال دین ——— سکھر جیل سے منتقل ہو کے آیا تھا وہ نوجوان انتہائی غمزدہ تھا، اس کے سات سگے اور چچیرے بھائی بلوچستان میں بغاوت کرنے پر سکھر لاکر پھانسی دیئے گئے تھے، اس کے باپ سردار نوروز خان کو بڑھاپے اور جلال دین کو اس کی کمسنی کے باعث عمر قید ہوئی تھی لیکن نوروز خان جیل ہی میں مر گیا جلال الدین سخت قسم کا مسلمان اور کم گو نوجوان تھا۔ کوئی سی بات نہ کرتا وہ ایک نہ بھولنے والے صدمہ کے تحت زندگی گزار رہا تھا، ان تینوں بلوچوں (باقی، جتوئی، جلال) نے اپنے لئے قیدی خدمت گار بلوچ ہی رکھے تھے۔ انہیں اور کسی پر اعتماد نہ تھا، میں نے اندازہ کیا کہ سندھ اور بلوچستان کی لیڈر شپ کا اسلوب فکر بہمہ وجوہ علاقائی ہے۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان جیل میں جو ریڈیو نصب تھا اس سے عموماً کابل کے پروگرام سنے جاتے یا انڈیا ریڈیو کی خبریں، اپنی خبریں کم ہی سنتے تھے، میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا تو وہ طرح دے گیا، اُس کا جواب تھا کہ ہماری خبریں اُردو میں ہوتی ہیں وہ یہاں قیدیوں کی سمجھ میں نہیں آتیں اس لئے عام قیدی کابل ریڈیو پر اصرار کرتے ہیں ——— میں نے کہا انڈیا ریڈیو؟ کہنے لگے کبھی غلطی ہو جاتی ہے اتفاق سے اس وقت آکاش وانی پہ خبر دے رہا تھا کہ شورش کاشمیری ڈیرہ اسمٰعیل خان جیل میں بھوک ہڑتال پر ہیں ۔ آج ان کی ہڑتال کا سترھواں دن ہے اور یہ غلط

تھا، میں ۹ دن بھوک ہڑتال کے بعد اپنا مطالبہ منوا چکا تھا ــــــ سرحد کا مزاج بھی
پنجاب کے موافق نہ تھا میں نے ڈیرہ میں رہ کر اور یہاں کراچی میں آکر پنجاب سے
ناراضی کے اسباب معلوم کرنے چاہیے، یہاں اور وہاں عوام اس تاثر میں مبتلا تھے
کہ ان کی غربت کا باعث پنجابی ہیں لیکن خواص بالخصوص سیاستئین یہ کہتے تھے کہ
ملک غلام محمد (گورنر جنرل)، اور جسٹس محمد منیر (چیف جسٹس)، نے اس ملک کی جمہوری
سیاست کو برباد کیا ہے ان کے نزدیک ہر سیاسی جرم کا ذمہ دار پنجاب تھا، مثلاً اسکندر مرزا
نے قومی اسمبلی کو ختم کرنے کے لئے نواب قلات کو بغاوت پر اکسایا تھا لیکن وہ اس کے
نتائج کا مسئول پنجاب کو ٹھہراتے تھے، اسکندر مرزا ! پنجابی تھے نہ پنجاب میں کبھی
رہے تھے وہ مرشد آباد (بنگال) کے باشندہ تھے، ان کی ملازمت کا بڑا حصہ
سرحد میں کٹا تھا وہ برطانوی استعمار کی تعمیر تھے، غرض ان تینوں صوبوں کے راہنماؤں
کو یہ احساس بالکل نہ تھا کہ پنجاب بیوروکریسی کا نام نہیں، وہ ان محبان وطن کا بھی
نام ہے جو شہری آزادیوں کے لئے لڑتے رہے۔ اور جب کبھی ان صوبوں کے
حریت پسند عناصر پر کوئی افتاد آئی تو پنجاب کے اخباروں اور سیاسی کارکنوں نے ان
کے حق میں آواز اٹھائی، بہرحال ان کا ذہن اتنا راسخ ہو چکا تھا کہ اسے ہموار کرنا مشکل
تھا یہ ذکر آچکا ہے کہ چند بنگالی نوجوان جو ابھی نوجوان بھی نہیں تھے اسی جیل میں
قتل کے ایک مقدمہ میں ماخوذ تھے وہ اپنی مصیبت کا باعث بھی پنجاب ہی کو
گردانتے تھے جب اگرتلا سازش کیس کا اعلان ہوا اور اس میں شیخ مجیب الرحمٰن
بھی شامل تھے تو یہ نوجوان کھل گئے، ان کی ہمدردیاں زمین کا بیٹا ہونے کی وجہ سے شیخ
مجیب الرحمٰن کے ساتھ تھیں اس چیز نے انہیں اور بھی یک رخہ کر دیا کہ اگرتلا کیس کے
لئے جج سرکاری وکیل اور ان کی ٹیم کے افراد سب کے سب پنجابی تھے اور یہی چیزیں
پنجاب کے خلاف علاقائی تعصب کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ میں اس ذہن کے مضمرات

سے سخت پریشان تھا ہر چند ان دوستوں سے کہا کہ میں خود پنجابی ستمگاروں کا شکار ہوں لیکن وہ قائل نہ ہوتے تھے چینی ترکستان کے ایک صاحب پورا نام تو یاد نہیں لیکن عرفاً صابری کہتے تھے ایک جاپانی جاسوس کے ساتھ ماخوذ تھے، اس جاپانی کے متعلق روایت تھی کہ وہ جاپان کی فوج میں جرنیل تھا اور اب جاپان کے لئے جاسوسی کرتا ہے دونو پر کیا الزام تھا مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں اس قسم کے لوگوں سے کھچا رہتا، باقی بلوچ، صابری کے قرب میں تھے ان دونو میں قدر مشترک علم غیب تھا، صابری قیافہ شناس اور ستارہ شناس تھا، میں بھی اس سے واقف ہو گیا، تو بہت سی باتیں معلوم ہوئیں، وہ ریڈیو پاکستان کے غیر ملکی شعبہ میں ملازم تھا۔

اپنی خدمات کے بارے میں بہت کچھ بتاتا اور شاکی تھا کہ اسے محض مفروضے پر گرفتار کیا گیا ہے، حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے لیکن اس سے ایک عجیب سی بات معلوم ہوئی کہ حکومت ترکی کی خواہش پر وہ ربوہ میں کئی سال رہا اور وہاں رہ کر قادیانی جماعت کے مفصل حالات معلوم کئے، ان حالات پر ایک تجزیاتی رپورٹ لکھی کہ اس جماعت کے لوگ پاکستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے سخت و پختہ کر رہے ہیں اور مختلف فعال شعبوں میں ان کا تناسب اپنی کل تعداد سے کہیں زیادہ ہے، اس نے اپنے تجزیہ میں لکھا کہ آئندہ دس پندرہ سال میں بعض بیرونی طاقتوں کی مدد سے پاکستان میں ان کے غلبہ پا جانے کا اندیشہ ہے، صابری نے اپنی رپورٹ کی نقل حکومت پاکستان کو بھی دی، ان دنوں میاں بشیر احمد (ریٹائرڈ آئی جی) کراچی میں ڈی آئی جی تھے، انہوں نے صابری کو بلا کر تجزیہ کے ماخذ معلوم کئے جب انہیں یہ بتایا گیا کہ وہ ربوہ میں رہا ہے تو میاں صاحب نے ڈانٹ دیا کہ بڑے نمک حرام ہو، ان کا نمک کھا کے انہی کے خلاف رپورٹ کی ہے، صابری کا کہنا تھا کہ اس رپورٹ نے اسے یہاں تک پہنچا دیا ہے رپورٹ کے متعلق اس نے جو کچھ زبانی بتایا میں حیران

رہ گیا کہ اس کی معلومات کتنی وسیع اور جامع ہیں؟ ہمارے ہاں تحریک ختم نبوت کے لوگ بھی وہ معلومات نہیں رکھتے جو اس غیر ملکی نے جمع کی تھیں۔

وہ ستارہ شناسی کے مطابق عجیب و غریب پیشگوئیاں کرتا تھا مثلاً جب سامنا ہوتا یہی کہتا ہائی کورٹ آپ کو نہیں چھوڑے گا لیکن آپ اسی سال دسمبر کے آخر تک رہا ہو جائیں گے اور ایوب خان اگلے سال کی سہ ماہی سے زیادہ حکمران نہیں رہ سکتا۔

میرے ساتھ کی بارک میں سکندر اعظم اور ان کے پانچ چھ ساتھی قتل کے مقدمہ میں سال بھر سے پڑے تھے میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اعظم اپنی چال ڈھال بات چیت اور رہن سہن کے لحاظ سے کئی پولیٹیکل قیدیوں کی بہ نسبت عمدہ اخلاق کا مالک تھا یہاں پہلی بھوک ہڑتال نے میری صحت پر جو اثر ڈالا اس سے وہ کانپ اٹھا، اس کی سب سے بڑی ادا جو مجھے پسند آئی وہ اس کا غریب قیدیوں سے حسن سلوک تھا، وہ بہت سے ایسے قیدیوں کے جرمانے ادا کر دیتا جو طویل قید کاٹنے کے بعد چند سو روپیہ جرمانہ کی عدم ادائیگی میں سال دو سال کے لئے رک جاتے اور اس محرومی پر انہیں اپنی غربت کا شدید احساس ہوتا۔ کئی عمر قیدی جو اپنی قید کاٹ کے پانچسو یا ہزار روپیہ جرمانہ میں رہ گئے تھے اس کی بدولت رہا ہوئے۔ ہمارے نظام تعزیر کی نرمی اور سختی نے ہزار ہا گھر اجاڑ دیئے ہیں قانون بلاشبہ موم کی ناک ہے۔ یا بہ قول سولن تار عنکبوت کہ طاقت ور سے ٹوٹ جاتا اور کمزور کو پھانس لیتا ہے، کئی ایسے قیدی ملے جنہیں ون یونٹ کی بدولت سرحد سے اٹھا کر کراچی اور سندھ میں رکھا گیا ______ صرف اس لئے کہ وہ غریب تھے اور جالان کی ضرورتیں ہمیشہ غریب قیدیوں سے پر کی جاتی ہیں مثلاً ایک قیدی جو میری شیو بناتا تھا ہری پور ہزارہ کا تھا وہ ایک سے دوسری جیل میں منتقل ہوتا ہوا کراچی پہنچ گیا۔ ہری پور ہزارہ کے کسی دور افتادہ گاؤں میں اس کا گھر تھا اس نے اپنی بہن کو

چھیڑنے کے جرم میں ایک اوباش کو ڈھیر کیا تھا۔ اس کے سب اعزہ مرکھپ گئے لیکن ایک ستر بہتر سالہ بوڑھی ماں رہ گئی تھی جو وہاں کسی خان کے ہاں کام کاج کرتی تھی۔ وہ کہتا تھا مجھے ماں کو دیکھے ہوئے دس سال ہو گئے ہیں ماں کے پاس کرایہ نہیں یہاں آ سکے، میرا بس نہیں کہ ہری پور جا سکوں۔ اس روگ نے اس کو پریشان کر رکھا تھا جیل میں قیدیوں کے ننانوے فی صد کام رشوت اور سفارش سے ہوتے ہیں۔ قیدیوں کا راشن تو انگریزوں کے عہد میں بھی اہلکار کھا جاتے تھے لیکن آزادی کے بعد رشوت کی نئی راہیں کھلی ہیں اب ملاقات بھی چونی سے لے کر دس روپے میں ہوتی ہے یہ چیزیں اتنی شرمناک ہیں کہ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے، ایک قیدی چودہ سال قید گزار چکا تو پانچ سو روپیہ جرمانہ میں سال بھر کے لئے رک گیا، اس کی بوڑھی ماں محنت مزدوری سے جرمانہ جمع کر کے لائی تو جیب تراش نے صاف کر دیا، یہ دوہرا غم تھا، اس ادب پتی کراچی میں اس کے لئے کوئی عافیت کدہ نہ تھا اس نے بیٹے کو چھڑانے کے لئے جیل ہی کے دروازہ پر بھیک مانگنی شروع کر دی، خدا جانے پانچ سو روپیہ کب جمع ہوتا؛ لیکن جو دس بیس روپیہ پہلے دن جمع ہوتے وہ بھی چراغ تلے اندھیرا ہو گئے آخر اس قیدی کا پانچسو روپیہ جرمانہ بھی اعظم نے ادا کر کے رہا کرا دیا۔ امیروں اور بدمعاشوں کے لئے جیل خانے تکیہ ہو گئے ہیں، پیسہ دے کر سب کام ہو سکتے ہیں۔ عورت اور روپیہ بڑی خطرناک چیز ہیں ایک دن جیلر کے پاس ایک بنی ٹھنی عورت آگئی اس کے لئے بڑا دروازہ کھولا گیا وہ ٹھاٹھ سے آکر جیلر کے بازو کی کرسی پر بیٹھ گئی معلوم ہوا سوسائٹی گرل ہے، اس کا آشنا کسی سیٹھ سے ہاتھا پائی میں اندر ہو گیا ہے، جیلر نے سیٹھ صاحب کی سفارش پر اس کو تنہائی قید میں ڈال رکھا ہے، اس عورت نے چھٹتے ہی کھردرے پن میں کہا،

"حد ہو گئی اتنی راتیں گزارنے کے بعد بھی پرنالہ وہیں ہے، ابھی تک

اس کو قید تنہائی سے نکالا کیوں نہیں "؟

جیلر خفیف ہو گیا ہم اُٹھ کے اندر آ گئے میرا خیال ہے کراچی سنٹرل جیل کے جیلر کی آمدنی پریذیڈنٹ آف پاکستان کی تنخواہ سے کم نہیں۔

ایک زمانہ میں لاہور کے متعلق مشہور تھا کہ انگریز کسی تھانیدار سے خوش ہوتے تو ٹبی کے تھانہ میں لگا دیتے کسی جیلر سے خوش ہوتے تو سنٹرل جیل کا داروغہ بنا دیتے کسی سیشن جج سے خوش ہوتے تو لاہور کا سیشن جج مقرر کرتے اسی طرح کراچی سنٹرل جیل افسروں کے لئے غیبی خزانہ ہے، جو روز بھرتا اور لٹتا ہے، وہ جیل خانے نہیں رہے جو کبھی تھے اب جیل خانے کچھ اور ہو گئے ہیں کسی نے اصلاحات کی فکر نہیں کی نتیجتہً جیل خانوں کا نظام دگرگوں ہو گیا ہے، جس نظام کے اعصاب رشوت لیں گے وہ نظام کبھی صحیح نہیں رہے گا۔ جیل خانوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ راشی و مرتشی حکام کا ثمرہ ہے، اس سے بڑی شرمناک بات کیا ہو سکتی ہے کہ اصلاحات کمیشن کی آڑ میں بعض لوگوں نے اپنی ریٹائرمنٹ کو سرکاری خزانہ سے آسودہ کیا اپنی مدتِ کار کو طول دے کر تنخواہ یا الاونس پاتے رہے، نتیجہ کیا نکلا۔ صفر + صفر = صفر۔ اس میں کبھی کلام نہیں تھا کہ جیل خانوں کا نظام وحشیانہ ہے لیکن اب ذرہ برابر کلام نہیں رہا کہ آزادی کے بعد جیل خانے جرائم کی تربیت گاہ ہو گئے ہیں ایوب خان کے عہد میں جیل خانے سیاسی قیدیوں کے لئے سخت کئے گئے لیکن اخلاقی قیدیوں کے لئے "ہوسٹل" ہو گئے۔

میں بعض امراء کے لاڈلوں کو جانتا ہوں وہ قید ہو گئے جرم بھی ان کے سنگین تھے لیکن ان کی ایت واریں گھر میں گذرتی تھیں۔

کراچی میں ایک بڑی بیگم اپنی نوکرانی کو قتل کرنے کی پاداش میں قید ہو گئیں، اس کے لئے احکام جاری کئے گئے کہ اس کو جیل خانہ میں نہ رکھا جائے باہر رکھا جائے، چنانچہ ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کا مکان خالی کرایا گیا اور وہ بیگم صاحبہ اس میں ٹھہرائی

گئیں۔ کیا یہ جیل خانہ تھا؟ جیل خانہ ہمارے لئے تھا کہ گھر سے اُٹھا کر آٹھ سو میل دُور پھینک دیا اور جو رشتہ دار کراچی میں تھے انہیں ملاقات کی اجازت نہ تھی اُن کے کاغذات سپیشل برانچ کی زنبیل میں تھے اس اہانت کے بعد حکومت کا یہ توقع رکھنا کہ وہ ہم سے عزت کرانے کا مطالبہ کر سکتی ہے اس کے دماغ کا فتور تھا۔ میرے خطوط ان تک پہنچتے تھے یا نہیں لیکن صدر اور گورنر کو بے ضابطہ خط لکھ کر میں اپنی بھڑاس نکالتا رہا وہ مجھے ایک ہی طرح جھکا سکتے تھے کہ میری زندگی ختم کرا دیں۔

قاسم بھٹی پہلی دفعہ ایوب خان کے آغازِ اقتدار میں پکڑا گیا، اس پر سونے کی سمگلنگ کا الزام تھا اخباروں نے اس کا نام گونجا دیا تھا، اب وہ نو برس بعد غنڈہ ایکٹ میں ماخوذ ہو کر انتظامیہ کے استحصال کا شکار تھا، وہ جھنجلاتا تھا کہ "میں غنڈہ ہوں تو شریف کون ہے؟" اس کے منوڑہ میں بنگلے تھے اور کراچی میں بھی، کراچی میں ایک سنیما بھی تھا اس کے کئی لانچ سمندر میں مچھلی کا شکار کرتے اور یہی اس کا بزنس تھا، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بہت بڑی جائداد کا مالک ہے، جیل میں تھا تو اس کے ٹھاٹھ شاہانہ تھے، سارا دن جیلر کے دفتر میں بیٹھا رہتا بیسیوں لوگ آتے اور اس سے ملتے تھے اس کی بستی کے بے شمار غرباء ہر روز جیل کے دروازہ پر آ کر امداد لے جاتے وہ ہاتھ کا بے حد سخی تھا، اعظم کی طرح اس نے بھی بیسیوں قیدیوں کے جرمانے ادا کئے وہ کسی سائل کو ٹھکراتا نہیں تھا، اس سے جیل کے بعض افسر مستفید ہوتے، جیلر کے لئے سونے کی کان تھا اس کی فیاضی کا ہر کہیں چرچا تھا اس کو دل کا عارضہ تھا لیکن اس کی ضمانت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ گورنر موسیٰ کے ایک یار باش ایم پی اے سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا اور وہی جھگڑا اس کی مصیبت کا باعث ہوا ــــ استغاثہ نے جو گواہ پیش کئے تقریباً سب عدالت میں اس کی فیاضیوں اور سخاوتوں کی شہادت دے گئے لیکن "خدائے مجاز" کی ناراضی کے باعث اس کی ضمانت نہیں ہو رہی تھی۔

کسی طرح اس نے سول ہسپتال منتقل ہونے کا بندوبست کیا اپنی بیماری کے بلاوجود اس نے ہر شخص کو کچھ نہ کچھ دیا، ڈاکٹر عبدالرحیم پراچہ، آنریری پروفیسرڈومیڈیکل کالج اس کے ذاتی معالج تھے اور ایک بھاری رقم لے کر اس کو داخل کرنے پر راضی ہوئے تھے، بیں دو دفعہ سول ہسپتال منتقل ہوا تو قاسم دل کے ہاتھوں وہیں پڑا تھا ساری پولیس گارد اس کی مرہون منت تھی وہاں بھی دن بھر غریبوں کا تانتا بندھا رہتا وہ کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا تھا اس کے پاس بڑے بڑے گھڑ دوڑیئے آتے کیونکہ اس کے بھی ریسی گھوڑے تھے اس کی کاریں ہسپتال کے دروازہ پر کھڑی رہتیں ڈاکٹر سے اجازت لے کر وہ کبھی کبھار پولیس کی معیت میں ساحل کی سیر کو جاتا، ایک دفعہ راہ میں ایک بڑی مسجد ادھوری نظر آئی سبب پوچھا تو معلوم ہوا پیسہ ختم ہو گیا ہے اسی وقت منتظمین سے کہہ دیا کہ جو خرچ آتا ہے میرا ذمہ روپیہ لو اور بنوائی شروع کر دو، حافظہ غلطی نہیں کرتا تو سول ہسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے بھی ایک رکی ہوئی عمارت کے لئے اس سے دس یا بیس ہزار روپے کا عطیہ لیا تھا۔ یہ ایک سنگین اور شرمناک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحیم پراچہ نے اس کے مرض کو ہوس زر کا ذریعہ بنا لیا۔ وہ سول ہسپتال میں ٹھہرنے کا بیسیوں ہزار روپیہ دے چکا اور آئے دن ان کی نئی طلب کا شکار ہوتا تھا، اس نے ڈاکٹر عبدالرحیم پراچہ کی اس دھمکی سے خوف زدہ ہو کر کہ وہ اس کو سنٹرل جیل واپس بھیج دے گا ایک نئی کار لے دی، ڈاکٹر عبدالرحیم پراچہ کالج اور ہسپتال میں تو آنریری تھا لیکن جلب منفعت میں انتہائی سنگدل قاسم اس کی ہنڈی تھا قاسم کی شہرت ایوب خان کے مارشل لاء میں اتنی داغدار ہو چکی تھی کہ اس کی جائز مدد کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا اس کی دولت اس کے لئے عذاب ہو گئی تھی زمانہ تھا کہ اسکندر میرزا کو ملنے وہ پریذیڈنٹ ہاؤس میں دقت بے وقت چلا جاتا اور اس کی کار کے لئے کوئی روک نہ تھی اب یہ وقت تھا کہ رشوت دیئے بغیر ہسپتال میں رہ نہیں سکتا تھا، اس کے معالج نے اس

کی زندگی اجیرن کر دی تھی اس نے تنگ آکر ڈاکٹر عبدالرحیم پراچہ سے لڑائی باندھ لی آخر کار اسی لڑائی کا شکار ہو گیا، میں رہا ہو کر لاہور پہنچا تو مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد کسی اخبار کے ایک کونے میں چھوٹی سی خبر نظر پڑی کہ قاسم بھٹی کا بڑا بھائی ایک دن پہلے رحلت کر گیا تھا وہ بھی خبر سنتے ہی حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گیا ہے میں نہیں کہہ سکتا اس کی موت کا ذمہ دار کون تھا؛ وہ خود تھا قانون تھا اس کا روپیہ تھا یا ایک ڈاکٹر کی حرص تھی؛ لیکن قاسم بھٹی جو بھی تھا بد سے بدنام زیادہ تھا، اور جو اس کا خون نچوڑ رہے تھے وہ بدنام نہ سہی بد ضرور تھے۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سمگلر ہے لیکن بعض دوسرے لوگوں سے سننے میں آیا کہ اس کی بدولت کئی شہزادے "قارون ہو گئے" بعض سلاطین صرف اس لئے اس کے دشمن تھے کہ وہ ان کے لئے سمگلنگ نہیں کرتا ہے، انہی واقعات سے بسا اوقات گمان ہوتا ہے کہ بے شمار حقیقتیں گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کھو گئی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحیم پراچہ اور قاسم بھٹی کی موت میں صرف ایک سال کا فاصلہ ہے، ایک دل کا مریض تھا ایک دل کا ماہر لیکن دونوں دل کے ہاتھوں مارے گئے۔

جیل میں اخلاقی قیدیوں کی حکایتیں سن سن کر اور بعض نو گرفتاروں سے پولیس کے کارنامے معلوم کر کے عجیب انکشاف ہوتے ہیں، اخلاقی قیدی ہر حالت میں سچ نہیں بولتے جب تک ان کا مقدمہ چلتا ہے وہ غلو اور اخفا سے کام لیتے ہیں لیکن جب سزایاب ہو جاتے اور قیدیوں میں رچ پچ جاتے ہیں تو پھر دوستوں کی ٹکڑی میں سچی کہانیاں سناتے اور ان کہانیوں میں اتنے انکشافات ہوتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اخلاقی قیدیوں کی بہت بڑی اکثریت واقعی مجرم ہوتی ہے لیکن پولیس بہمہ وجوہ انہیں عادی مجرم بنا دیتی ہے، اور جیل خانے اس فن میں آنارو کر دیتے ہیں وہ قیدی جنہیں غنڈہ کہتے ہیں یا اسی قماش کے بعض دوسرے قیدی باہر پولیس سے مل کر جرم کرتے، اندر

مزید تربیت حاصل کرتے ہیں وہ کبھی توبہ تلا نہیں کرتے، ان قیدیوں سے جیل خانے والے بھی ڈرتے ہیں ایسے قیدی کیونکہ کوئی عبرت حاصل کر سکتے ہیں جب اندر ان کے لئے ہر قسم کی آزادی ہو، اور وہ افسروں کو رشوت دے کر سہولتوں اور آسائشوں سے متمتع ہوتے رہیں۔

ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج مسٹر ایس اے محمود کی صدارت میں جیل ریفارمز کمیٹی قائم کی گئی وہ دو ڈھائی سال کام کرتی رہی یہ انگریز کی عادت تھی کہ اشک شوئی یا دفع الوقتی کے لئے وہ اس قسم کی کمیٹیاں یا کمیشن بنا دیتا تھا اس کے ارکان بڑے بڑے معاوضوں پر لمبا لمبا عرصہ کام کرتے تھے اس ریفارمز کمیٹی نے جانے کیا رپورٹ کی لیکن ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد اس رپورٹ کے پبلک ہونے کا امکان ہی نہ رہا۔ اس کمیٹی کی ہیئت ترکیبی سے کسی کو خوش فہمی نہ تھی اس کمیٹی کے لئے ہائی کورٹ کا ریٹائرڈ جج نہیں ایک ایسا شخص ہونا چاہیئے تھا جو قومی جدوجہد میں رہا ہو اور ان صعوبتوں کو جانتا ہو جو قیدیوں کو برے سے برا بنا دیتی ہیں، حیدر بخش جتوئی نے اس کمیٹی کو بہت سی تجویزیں بھیجی تھیں میں نے ہوم سیکرٹری کی معرفت کمیٹی کو خط لکھا کہ ہمہ پہلو تجاویز بالمشافہ پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن کمیٹی کے چیئرمین نے جواب ہی نہ دیا اگر ہم لوگ جیل کے مسائل پر گفتگو نہیں کر سکتے تو پھر ایسی رپورٹ کے ادھورے ہونے میں کوئی شک ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ جیل ریفارمز کے متعلق کیا جان سکتے ہیں جنہیں اس وادی کے پیچ وخم ہی کا اندازہ نہیں ہے۔ جرائم اس لئے بھی بڑھ گئے ہیں کہ جیل خانوں نے مجرموں کو تربیت دے کر بے باک کر دیا ہے، نوے فی صد اخلاقی قیدی مجرمانہ افعال کی نئی ادائیں سیکھ کر رہا ہوتے اور وارادات کرتے ہیں، وہ جیل خانے جو کم عمروں کے لئے بنائے گئے ہیں وہ نظماً اور مقابلتہً مجرمانہ اور بہیمانہ ہیں وہاں بچوں کو بری عادتوں کی لت پڑ جاتی ہے وہ بڑی عمر کے مجرموں کی گرفت میں آ کر معصیتوں کی پوٹ ہو جاتے ہیں، کراچی میں

لانڈھی کے علاقہ میں بچوں کی جیل ہے جہاں سولہ یا اٹھارہ سال کی عمر تک کے لڑکے رکھے جاتے ہیں، ان میں سے درجن دو درجن لڑکے ہر سال سیکنڈری بورڈ کا امتحان دینے سنٹرل جیل آتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کن سانچوں میں ڈھالے گئے ہیں۔ اس قسم کے قیدی سوسائٹی کا بیرومیٹر ہوتے ہیں۔ میرپور سندھ کا ایک لڑکا شاہد جو کسی لیڈی ڈاکٹر اور اسکول ہیڈ ماسٹر کا بیٹا تھا اپنے ہاں کی ایک نرس کو قتل کر کے دس سال قید ہوا تھا نہایت شستہ اُردو بولتا اور اپنی کہانی مزے لے لے کر سناتا تھا کوئی افسانہ نگار ہوتا تو اس کی کہانی ایک معرکہ آرا ناول کا موضوع بن سکتی تھی وہ انگریزی پڑھنے کا حد درجہ شوقین اور دلدادہ تھا وہ ایک شریف لڑکا تھا لیکن اس کی باتیں سُن کر اندازہ ہوتا تھا کہ ہم نے نئی نسلوں کو فراموش کر دیا ہے۔

عام قیدی نرم خو افیسر کے لئے رطب اللسان رہتے ہیں، دو قسم کے افسران کے موافق ہوتے ہیں رحم دل یا راشی، رحم دل تو خیر ان کے لئے رحمت ہوتے ہیں راشی سے وہ خوش رہتے ہیں کہ رشوت کھا کے ان کے لئے مصیبت کھڑی نہیں کرتا، بعض راشی افسر ظالم بھی ہوتے ہیں اور وہ ظالم افسروں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

قیدی کم ہی افسروں کی تعریف کرتے ہیں لیکن چودھری نذیر اختر جو اس وقت سپرنٹنڈنٹ تھے وہ نرم خو اور شریف الطبع افیسر سمجھے جاتے اور قیدی ان سے مطمئن تھے ان کے پیشرو حاجی احسان غنی کے متعلق قیدیوں میں احترام و ستائش کے مِلے جُلے جذبات پائے جاتے تھے اکثر قیدی انہیں بہت یاد کرتے، انہوں نے قیدیوں کے لئے اسکول کی خوبصورت عمارت بنوائی اور ملاقاتیوں کے لئے ایک نفیس شیڈ بنوایا تھا۔ ایسا سپرنٹنڈنٹ شاذ ہی ہوتا ہے جو عملہ اور قیدیوں میں یکساں محبوب ہو، احسان غنی کے معاملہ میں عام فضا یہی تھی ان سے پہلے مصطفےٰ نام کا ایک سپرنٹنڈنٹ تھا وہ قیدیوں کو ان کا راشن صحیح صحیح کھلاتا اور ان سے مینول کے مطابق کام لیتا تھا لیکن جب جیل میں

رہا پٹ کے نکلا سکھر جیل میں قیدیوں نے اسے مار بھگایا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں کھڑے پاؤں نکالا گیا غالباً ہری پور میں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا، کراچی میں بھی خوار ہوا آخر جیل خانہ کی ملازمت چھوڑ کے فرو ہو گیا۔

ایک صبح اخبار میں جسٹس حمود الرحمٰن کا رشوت ستانی کے متعلق بیان نظر سے گزرا وہ غالباً عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی سے متعلق کمیشن کے صدر تھے، بیان پڑھ کر میں نے انہیں خط لکھا وہ یہ تھا۔

معرفت سپرنٹنڈنٹ

سنٹرل جیل کراچی

۱۸ ر جولائی ۱۹۶۸ء

گرامی منزلت

سلام مسنون، ایک روزنامہ میں آپ کا انٹرویو دیکھا، آپ نے فرمایا ہے کہ ملک کے ہر حصہ سے کمیشن کو رشوت کی افزونی کے متعلق شکایات پہنچی ہیں، اسی طرح عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کے متعلق بھی زور دیا گیا ہے، بالخصوص اعلیٰ پولیس افسروں نے کہا ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے سے الگ ہونا ضروری ہے تعجب ہے کہ بار ایسوسی ایشنز نے اس بارے میں کم توجہی کا ثبوت دیا ہے، بہت دن ہوتے ہیں آپ نے کہیں فرمایا تھا کہ قانون میں تاخیر انصاف سے محرومی کے ہم معنی ہے، آپ کے ہمراہی ارکان بھی ان اشکال کے مزاج دان ہیں، آپ کی سفارشات پر اس بدنصیب ملک کے کروڑوں عوام کی شہری آبرو کا انحصار ہے۔

جہاں ایک دستوری نکتہ کی وضاحت کے لئے تین تین ماہ کی تاریخیں پڑتی ہوں اور قانونی مسلمات کے خلاف ایک شخص کی نظر بندی کے امتناعی

(Preventive) اور (Punitive) ہونے کا امتیاز

ہی نہ رہے وہاں آپ کا مشن ہم لوگوں کے لئے امید کی ایک کرن ہے، بلاشبہ آپ نیابت الٰہی کا فرض ادا کر رہے ہیں، عدل اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے، مجھ ایسے لوگ جو "بر ہمی یار" کے تابع نظر بند کئے گئے اور انصاف کے مبادیات سے بھی محروم ہیں آپ کی جد و جہد کے نتائج کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔

جہاں تک رشوت کا تعلق ہے میں نے ہمیشہ اس کے ظواہر و آثار اور برگ و بار پر غور کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ رشوت کی جو شکلیں اب قائم ہوئی ہیں اس سے پہلے کبھی نہ تھیں، رشوت مرض نہیں رہا فرض ہو گیا ہے، مجازی خداؤں سے لے کر بندگان حقیر تک ننانوے فی صد اس غزالہ شب تاب کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں میر کا دیوان جو کبھی رام پور سے شائع ہوا تھا اس میں اتنے اشعار نہیں تھے جتنی قسمیں اور صورتیں اس عہد ہمایونی میں رشوت کی قائم کر دی گئی ہیں۔ ایک نیک سیرت دوشیزہ بھی اوباشوں کے نرغہ میں اتنی عاجز نہیں ہوتی جتنی یہ سوسائٹی اور اس کا نظام رشوت کے ہاتھوں بلا ہوا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ رشوت کا یہ سارا نقشہ آپ کے سامنے رکھوں لیکن کوئی صورت ذہن میں نہیں آ رہی راہنمائی فرمائیں کہ یہاں سے اس طلسم ہوشربا کو آپ کے علم میں لانے کی راہ کونسی ہے؟ کیا اس غرض سے کمیشن پسند کرے گا کہ روبرو حاضر ہو کر عرض کر سکوں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک ڈوبتے ہوئے معاشرہ کے فرد ہیں اور اس معاشرہ کو وہی لوگ بچا سکتے ہیں جنہیں آخرت کی فکر ہے اور جس کا دامن ہر آلائش سے پاک ہے۔

میں یہ خط اُردو میں لکھ رہا ہوں انگریزی زبان کے مزاج سے آشنا ہوں، مگر زبان پر قابو نہیں، کوئی اٹکاؤ ہو تو جسٹس انوارالحق کے ذوق سلیم سے استفسار کیا جا سکتا ہے۔

احترام کے ساتھ

سنٹرل جیل کراچی — المخلص

۱۸ جولائی ۱۹۶۸ء — شورش کاشمیری

نظر بندی (Detention) امتناعی (Preventive) چیز ہے، تعزیری (Punitive) نہیں لیکن نظر بند (Detenue) کے معاملہ میں قواعد کی سنگینی قیدی (Convict) سے متعلق قواعد کی سختی سے کہیں زیادہ غیر انسانی ہے پاکستان میں سیاسی قیدیوں اور سیاسی نظر بندوں کے متعلق قومی حکومتوں کا طرزِ عمل انتہائی شرمناک رہا ہے ان کے متعلق قواعد میں سختی روز بروز بڑھی ہے گھٹی نہیں، لیکن میں اپنے متعلق یہ مغالطہ دینا نہیں چاہتا اور نہ بعض بڑے لیڈروں کی طرح جھوٹ بول کر اپنی کسی خواہش کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ کراچی جیل میں بہیمانہ سلوک کیا گیا یا مجھے ایسی کوٹھڑی میں رکھا گیا جہاں چوہے دوڑتے تھے ایسا کہنا غلط ہوگا بلکہ سفید جھوٹ۔ اکثر حکومتوں کے فرعونوں نے مجھے حقیر سمجھا میں نے ان سب کو حقیر جانا بلکہ اُن کی ہتک کر کے خوشی ہوئی۔ یہ میرا حق تھا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے سپرنٹنڈنٹ نے مجھے غلط جگہ رکھا میں نے اُس کو احساس دلا دیا کہ وہ غلطی پر ہے اس نے کوئی اور غلطی کی تو اس کا خمیازہ بھگتے گا، نتیجتہً وہ مجھ سے اس طرح بھاگتا تھا جس طرح غبی طالبعلم مدرسہ سے کنی کتراتے ہیں۔ کراچی جیل ایک تو پاکستان کے سب سے بڑے شہر کی جیل تھی دوسرے اس کا سپرنٹنڈنٹ اور بیشتر عملہ شرفا پر مشتمل تھا۔ بالخصوص سپرنٹنڈنٹ چودھری نذیر اختر کا رویہ انتہائی شریفانہ تھا۔ وہ کوئی غلط آدمی نہ تھا البتہ غلط سروس میں شریک

منہ ور تھا اسے کسی یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہونا چاہیئے تھا۔

میں خود بیڈھب آدمی تھا مجھ سے بدسلوکی نہ ہو سکتی تھی میں نے کبھی زندگی سے محبت نہیں کی، موت کا دن مقرر ہے جان سے محبت کرنے والے گھاٹے میں رہتے ہیں، میں برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ قواعد میں لوچ کے بجائے سنگینی پیدا کی جائے، یا بلاوجہ سختی ہو، کوئی سخت حاکم مجھ سے عزت کا مطالبہ نہیں کر سکتا، میرے ساتھ جو سختی برتی گئی اس کے احکام لاہور اور راولپنڈی سے صادر ہوتے تھے، کوئی تعزیری حکم مجھ پر وارد نہ ہوتا اور نہ میں مانتا تھا امتناعی قواعد میں نے ارادۃً بے آبرو کر دیئے تھے کھانے پینے کا میں شوقین نہیں تھا کہ اس کے لئے لڑتا، دال دلیا جو مل گیا کھا لیا بھوک ہڑتال کے مختلف معرکوں میں معدہ اس سے بھی انکار کر چکا تھا میں نے میڈیکل چیک اپ کے لئے بھی درخواست نہ دی تھی اور نہ کبھی استدعا کی میں ان چیزوں سے بے نیاز تھا۔ لیکن بے ضابطہ (Unauthorised) خط و کتابت سے میں نے حکومت کے امتناعی قواعد بے معنی کر دیئے تھے میں روزانہ حکومت کو جائز و ناجائز خط لکھتا اور بعض دوستوں یا عزیزوں سے تو خط و کتابت کا ایک سلسلہ بندھا ہوا تھا، آج بھی حکومت کے پاس میرے خطوط کا ریکارڈ ہو گا وہ خطوط جو حسب قواعد سپرنٹنڈنٹ کی معرفت حکومت کو لکھتا رہا ان خطوط سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میں نے ان میں کبھی کوئی ایسا لفظ نہیں لکھا جو غیرت اور شرافت کی نفی کرتا ہو۔ شاید ہوم ڈیپارٹمنٹ کے لئے سب سے زیادہ پریشان کن نظر بند میں ہی تھا، "نہج البلاغت" میرے زیر مطالعہ تھی اس میں سے ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا فقرہ نکال کر جو ظلم و عدوان اور اقتدار و حکومت کے خلاف ہو اور جس سے جزا و سزا اور آخرت و عبرت کا سبق ملتا ہو گورنر موسیٰ کو لکھ دیا کرتا، ان کے سیکرٹری پیش کرتے یا نہیں لیکن گورنر کا مزاج یہ بن گیا تھا کہ میرا ذکر ہمیشہ غصہ سے کرتے اور ماتھے پر تیوری چڑھا لیتے تھے۔

ستمبر کے دوسرے یا تیسرا ہفتہ میں حکومت کی طرف سے اخباروں میں اس امر کا نوٹیفیکیشن چھپا کہ فلاں فلاں کتابیں سیاستہً قابلِ اعتراض ہونے کی وجہ سے ضبط کر لی گئی ہیں، ان کے علاوہ بعض ایسی کتابیں جو مذہبی اختلاف کو مشتعل کرتی ہیں جن میں ایک آدھ کتاب نظم اور دو نثر کی ہیں بحق سرکار ضبط کی گئی ہیں، میں نے یہ خبر پڑھتے ہی ہوم سیکرٹری کے نام ۱۲ستمبر کو ایک خط لکھا جس میں نوٹیفیکیشن کی سپرٹ کا خیر مقدم کرتے ہوئے قادیانی جماعت کے لٹریچر کی طرف توجہ دلائی کہ میرزا غلام احمد اور میرزا محمود احمد کی فلاں فلاں کتابیں مسلمانوں کی اجتماعی دلازاری کا باعث ہیں اور فلاں فلاں کتابوں کے مندرجات سے عیسائیوں یا لخصوص عیسیٰ علیہ السلام کی توہین ہوتی ہے۔ ان کے خلاف بھی نوٹیفیکیشن کے ہم معنی کاروائی کی جائے یا مجھے اجازت دی جائے کہ میں ان کتابوں کے خلاف کورٹ آف لاء میں چارہ جوئی کروں۔ حکومت کیا جواب دیتی؟ خط ہوم ڈیپارٹمنٹ کے دانشوروں کی فائلوں میں گم ہو گیا۔ میرزائی ایک سیاسی تنظیم ہیں اور میں نے ہمیشہ اسی نقطہ نگاہ سے ان کا احتساب کیا ہے لیکن وہ ہمیشہ مذہب کے نام پر تحفظ چاہتے اور حکومت انہیں مذہبی فرقہ قرار دے کر تحفظ دیتی ہے۔ ان کے نشوونما پانے کا یہی راز ہے۔

قادیانی عجمی مسلمانوں میں یہودیت کی فطرت پر استوار ایک ایسی تحریک ہے جو مسلمانوں میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے ان کی وحدت میں نقب لگاتی لیکن ان کے حقوق غصب کرنے کے لئے معاشرتی طور پر ان کے دائرہ میں رہنے پر اصرار کرتی ہے۔ پاکستان میں اچھی اور بری سبھی قسم کی حکومتیں نہیں ہیں لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ ہر حکومت نے قادیانیوں کو تحفظ دیا ہے وہ علامہ اقبال کی زبان میں بھی اس خطرے کو محسوس نہیں کر سکی ہیں۔ جب تک خطرے سامنے نہیں آجاتے بہت کم حکومتیں ان کا تدارک کرتی ہیں۔ قادیانیت اس ملک کے عظیم تر سیاسی خطرے کا نام ہے لیکن

اُس کی خوش قسمتی ہے کہ وہ حکومت کے نزدیک زیادہ معتبر ہے اور بین الاقوامی طاقتوں میں اس کے سرپرست موجود ہیں۔

یاد نہیں آرہا کیا موقع تھا، گورنر نے آمریت کے دہ سالہ جشن کی مدح میں قصیدہ پڑھا میں نے فوراً ایک خط لکھا اور اپنی ہوائی ڈاک سے روانہ کر دیا۔

گرامی منزلت،

سلام مسنون

آپ کی زبان سے موجودہ آمریت کے حق میں کلمہ استحسان نکلتا ہے تو مجھے حیرت نہیں ہوتی کہ آپ اس کا جزو ہیں افسوس ضرور ہوتا ہے۔

امام زین العابدین کے نورِ نظر سے حجاج نے سوال کیا۔

"کیسے گزر رہی ہے"؟

فرمایا۔ ہر حالت میں اللہ کی رضا شریک حال ہے،

حجاج بولا۔ کشتی کیسے ہے؟

فرمایا۔ ہماری مصیبت کے دن بھی تمہارے اقتدار کی طرح جلد جلد گزر جائیں گے۔

اقتدار سے زیادہ کوئی چیز فانی نہیں ماضی کے کتنے ہی باجبروت حکمران آج قبروں میں مٹی کے چراغوں اور سبزہ وگل کو ترس گئے ہیں اُن کے مزار عبرت کے نوشتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے کیا عمدہ بات کہی ہے۔

"کمینہ سے اُس وقت بچو جب اقتدار میں ہو۔ شریف سے اس وقت ڈرو جب مظلوم ہو۔" کلامِ اسداللہ کی یہی ادائیں ان ویرانوں میں ہم ایسوں کی ڈھارس بندھاتی ہیں، امیر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"حکومت بارش کے قطرے کی طرح ہے صدف میں جاتا تو موتی بن جاتا ہے سانپ کے منہ میں جائے تو زہر ہو جاتا ہے۔"

میں یہاں رہ کر غافل نہیں، میرے رشتے عوام سے ہیں آپ کے حکام سے! اور حکام میں بھی وہ لوگ اور وزراء آپ کے گردو پیش ہیں جن کا وجود مٹی کے آبخورے سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا آپ تلوار کے آدمی ہیں آپ نے قلم سنبھال کے غلطی کی ہے، یہ آپ کے بس کا روگ نہیں، قلم تلوار سے کمزور چیز ہے لیکن اس کی کاٹ بڑی خطرناک ہے اور ہمیشہ رہتی ہے۔

آخر میرے مقدمہ میں آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں اس طرح نہیں مروں گا، حکومت نے ہائی کورٹ میں جو روش اختیار کی ہے اُس کی عزت میں اس سے ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوا، بلکہ آپ کے خانہ زاد بھی اس پہ ہنستے ہیں، ججوں کو متاثر و مرعوب کرنے کی رسم آخر کار ان لوگوں کے لئے بھی قید و بند کی دیوار بن سکتی ہے جو آج حکومت کی مسند پہ بیٹھ کر خدائی کا دعوے کر رہے ہیں، اللہ کا فیصلہ آپ کے فیصلہ سے بالکل مختلف ہے انشاءاللہ آپ سے ملاقات ہوگی ــــ ضرور ہوگی، والسلام

شورش کاشمیری

سنٹرل جیل۔ کراچی

میرے خلاف جو کچھ ہو رہا تھا اس کے مسئول صدر، گورنر، الطاف گوہر، احمد سعید کرمانی اور ان کے بعض ضمنی کھلنڈرے تھے جو لوگ میرے خلاف احکام کی تعمیل کرتے اور حکومت کی طرف سے مقدمہ کی دیواریں چنتے تھے ان کے دل بھی میرے ساتھ تھے ان دوران میں تین چیزوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

(۱) ڈیرہ اسمٰعیل خان میں مجھے معلوم ہوا کہ احمد سعید کرمانی کے بعض نمک خواروں

نے میرے مکان پر بچوں کو خوفزدہ کرنا چاہا ہے میں نے ۲۸ مئی کو لاہور کے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر حبیب الرحمٰن خان پی ایس پی کو خط لکھا کہ مجھے اس قسم کی خبر آئی ہے انہوں نے جواب میں جو خط لکھا اس کی کاپی میری اہلیہ کو بھیجی اور ایک کاپی کراچی کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو اس استدعا کے ساتھ کہ وہ اس کی نقل مجھے بھجوا دیں۔ انہیں توفیق نہ ہوئی کہ یہ خط مجھے بھجوا دیتے، میری کاپی ڈیرہ اسمٰعیل خان سے ہوتی ہوائی مجھے کراچی مل گئی ان کا خط شرافت و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھا اور میرے دل میں آج تک اس کا اثر ہے کاش ہمارے افسر اس قسم کے ہوتے انہوں نے مجھے لکھا۔

۱۔ خط ملتے ہی میں نے آپ کے گھر میں ۶۳۲۱۰ نمبر کو فون کیا وہاں سے آپ کا بیٹا مسعود اختر بولا، اس نے مجھے مطلع کیا کہ پورا خاندان خیریت سے ہے اور اضطراب کی کوئی سی وجہ نہیں ہے۔

۲۔ چند دن ہوتے ہیں آپ کے سالے خواجہ صادق کاشمیری میرے پاس آئے تھے انہوں نے مجھے شکایت کی کہ کچھ لوگوں نے آپ کے مکان سے نزدیک بک بکا کی ہے میں نے فوراً ڈی ایس پی پرانی انارکلی کو فون کیا کہ وہ خبردار رہیں اور سفید کپڑوں میں آپ کے مکان پر کنسٹیبل مقرر کریں جو ایسے لوگوں کو پکڑ سکیں، شورش کاشمیری کے بچوں کو ایسی کوئی سی پریشانی نہ ہونی چاہیئے میں نے یہ بھی ہدایت کی ہے کہ بیگم شورش کاشمیری کو مطلع کردیں کہ ایسی صورتِ حال میں وہ مجھے ہر وقت دن یا رات فون کرسکتی ہیں۔

۳۔ آپ یقین کریں آپ کی غیرحاضری میں آپ کے بچوں کی نگہداشت کی جائے گی ایک پولیس افسر کی حیثیت میں یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں ان کی زندگی، عزت اور جائداد کی محافظت کروں۔

مسٹر حبیب الرحمٰن نے بطور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس یہی نہیں کیا بلکہ میری

رہائی تک ایک ڈی ایس پی کی ڈیوٹی لگادی کہ وہ ہر روز میرے بچوں سے خیریت کی خبر لیتے رہا کریں ـــ میں نے تادم تحریر ان سے کبھی ملاقات نہیں کی، اور شاید اچھی طرح ان کا چہرہ شناس بھی نہیں۔ لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حبیب الرحمٰن نے عوامی تحریک کے دنوں میں بھی جس تدبر و تحمل اور شرافت و اخلاق کا مظاہرہ کیا پولیس کو اس پر فخر کرنا چاہیئے کہ اس کی صف میں اس قسم کے فرض شناس لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔

(۲) میں بھوک ہڑتال پر تھا ملتان میں احتجاجی مظاہرے ہو رہے تھے، وہاں علماء کی ایک میٹنگ میں کسی ایس پی نے میرے متعلق غلط الفاظ استعمال کئے مجھے اطلاع ملی تو میں نے مسٹر محمد یوسف اورک زئی، ڈی آئی جی کو خط لکھا کہ مجھے جانے بغیر اس شخص کو اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ ایک آدمی جو قید میں ہو اور بھوک ہڑتال پر، اس کے بارے میں غلط الفاظ بولنا بدتمیزی ہے۔

مسٹر اورک زئی (آج کل کراچی میں ایڈیشنل آئی جی ہیں) نے مجھے فوراً جواب دیا۔

محترم شورش صاحب

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ آپ کا خط ملا، ایس پی صاحب مذکورہ جس سے آپ کو شکوہ ہے یہاں سے تبدیل ہو گئے ہیں امید ہے آئندہ آپ کو ایسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ والسلام

اورک زئی

مسٹر اورک زئی سے میں قدرے واقف تھا وہ لاہور میں سینئر سپرنٹنڈنٹ رہ چکے تھے، اور ایک دیانت دار، نیک سیرت، فرض شناس افیسر کی حیثیت سے مشہور تھے۔

(۳) مسٹر مسعود نبی نور ہوم سیکرٹری کے متعلق میرے بچوں کی رائے اتنی بلند تھی کہ وہ ان کی تعریف کرتے ہوئے نہ تھکتے تھے، ان کے نزدیک وہ ایک مثالی افیسر

تھے، میری بیوی ہمیشہ یہی کہتیں کہ جس طرح ہم انہیں تنگ کرتے ہیں اور کوئی افسر ہو تو تلوار کی طرح کھچا رہے اور دوبارہ ملنے سے انکار کر دے لیکن ان کا سلوک ہمارے ساتھ بھائیوں کی طرح کا ہے۔

یکم یا دو جولائی کو (تاریخ یادداشتوں میں درج نہیں)، سپرنٹنڈنٹ نے شام کے وقت مطلع کیا، کل صبح آپ کو سول ہسپتال منتقل کیا جائے گا۔

"کیوں؟"

"میڈیکل چیک اپ کے لئے۔"

"میں نہیں جانا چاہتا۔ میں ٹھیک ہوں، علاج ہو رہا ہے اور مجھے اطمینان ہے۔"

"ہوم سیکرٹری کے احکام آئے ہیں"

"کہہ دیجئے میں نہیں جاؤں گا۔"

ہائی کورٹ کا حکم ہے، حکومت یہی چاہتی ہے، آپ کے بچوں نے مطالبہ کر رکھا ہے پروفیسر افتخار احمد نے یہاں سے لکھا ہے۔

حیدر بخش جتوئی اور عبدالباقی بلوچ بھی مُصر ہو گئے کہ ضرور جانا چاہیئے، چیک اپ ہو جائے بہتر ہے، ہفتہ عشرہ ٹھہر کر چلے آنا، چنانچہ اگلی صبح لکھا پڑھی کا سامان لے کر سول ہسپتال چلا گیا۔ وہاں پینگ وارڈ (PAYING WARD) کی دوسری منزل میں کمرہ دیا گیا، پولیس اور سی آئی ڈی نے اس کمرہ کا اس طرح احاطہ کر لیا جیسے وہ کسی بڑے ڈاکو کی نگرانی کر رہی ہے، جیل میں تو پھر چار ساتھی تھے یہاں کسی سے بات کرنا ایک طرف رہا علیک سلیک کرنا بھی جرم تھا۔



بھوک ہڑتال کے ۵۲ دن

میرا یوم پیدائش ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء ہے۔ ۱۹۶۸ء میں میری عمر ۵۱ برس کے پیٹے میں تھی کہ مجھے ایوبی آمریت کی ستمگری کے خلاف بھوک ہڑتال کرنا پڑی، بھوک ہڑتال کبھی نہیں بہت کم لوگ اس آزمائش میں پورا اترتے ہیں، رہ گئی حکومت تو اس کو سیاسی قیدیوں کی بھوک ہڑتال میں جھکنا ہی پڑتا ہے، برطانوی پنجاب میں سیاسی قیدیوں نے بھوک ہڑتال سے بڑے بڑے معرکے سر کئے، بیسیوں دفعہ حکومت سپرانداز ہوئی لیکن بسا اوقات بھوک ہڑتالیں جلد ہی تصفیہ کا باعث ہوئیں کبھی کبھار خاصا طول کھینچتیں اور بڑی جدوجہد کے بعد حکومت مطالبات تسلیم کرنے پر راضی ہوتی بہت سے اخلاقی قیدی بھوک ہڑتال کی وجہ سے مارے گئے لیکن سیاسی قیدیوں میں بنگال کا جتندر ناتھ داس واحد نوجوان تھا جو پنجاب کی جیلوں میں ۶۲ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد سورگباش ہو گیا، بھوک ہڑتال کوئی فیشن نہیں اس میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں

۱۔ جن کا عزم پختہ ہو، قوت ارادی مضبوط

۲۔ پیٹ کھانے پینے کا شکار نہ ہو

۳۔ حتی الامکان عیبوں سے بچے رہے ہوں

۴۔ کوئی سچا نصب العین سامنے ہو

۵۔ کوئی سا نشہ نہ ہو

۶ - جب بھوک ہڑتال کرلیں تو موت وحیات سے بے نیاز ہو جائیں

۷ - حکام کی سختیوں کو جھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

میں عمر کی اس منزل میں تھا کہ میرے لئے بھوک ہڑتال کی بھوک سہنا مشکل تھا۔ ۱۹۵۶ء سے ذیابیطس چمٹی ہوئی ہے۔ نتیجتہً جسم کے اعضاء یاری نہیں کرتے —— جی نہیں رہا بہ قول جوش جینے کی نقل کر رہا ہوں، اس عمر اور حالت میں بھوک ہڑتال کرنا سہل نہ تھا بلکہ موت کا سفر تھا لیکن حکومت نے ایکے وہ سلوک کیا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا، حکومت کو "حق" حاصل ہے کہ وہ اپنے مخالفوں کو گرفتار کرے انہیں جیل میں ڈالے یا تختہ دار پر کھنچوادے، اس قسم کے اقدامات میں کوئی سا اخلاقی انسانی قانونی جواز ہو یا نہ ہو حکومت کا اختیار ہی اس کا حق ہو جاتا ہے، لیکن جب حکومت انسانی قدروں کو پامال کرنے لگے اور جوش انتقام میں تہذیب و انسانیت سے عاری ہو جائے تو اس کے گھمنڈ کو توڑنا ہر غیرت مند سیاسی انسان کا فرض ہے، میں ہر لحاظ سے بہتر کلاس کا مستحق تھا، حکومت نے منتقم ہو کر غیر انسانی سلوک کا آغاز کیا تھا، میں نے اس کو آغاز ہی میں شکست فاش دی، سات مئی کو پکڑا گیا، آٹھ کی شام کو ڈیرہ اسمٰعیل خان سنٹرل جیل پہنچا، اور اسی وقت بھوک ہڑتال شروع کر دی، نو دن کی بھوک ہڑتال سے حکومت نے ہار مان لی، پہلے باب میں تفصیلی ذکر آچکا ہے مختصراً تمام دن جیل کے ہسپتال میں گزارے، پورے جیل میں اور کوئی جگہ نہ تھی جہاں مجھے رکھتے، چوتھے دن ناک کے راستہ نلکیوں سے دودھ دینے لگے، کچھ نمبردار مجھے ہاتھ پاؤں کے علاوہ سر اور شانے سے پکڑ لیتے، ڈاکٹر ناک میں ربڑ کی نالی ڈالتا اور دودھ پلاتا، تقریباً ۱۸ سال بعد بھوک ہڑتال کا نیا تجربہ تھا، قوت ارادی نے کسی لمحہ بھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ بھوک ہڑتال سے ہوں، یا میری صحت کی دیوار گر جائے گی بھوک ہڑتال چوتھے یا پانچویں روز اپنی شدت چھوڑ دیتی ہے، آنتیں صاف ہو جائیں تو پھر درد نہیں

ہوتا کوئی ساخوف نہ ہو تو بڑھاپے میں بھی آدمی اپنے تئیں جوان محسوس کرتا ہے ،
بھوک ہڑتال چھوڑنے کے بعد تقریباً ایک ہفتہ میں نے صرف دودھ پر گذارا کیا، ہاضمہ میں ایک قسم کی ویرانی پیدا ہو گئی، ڈاکٹر نے یخنی لکھ دی لیکن ڈیرہ اسمٰعیل خان کی یخنی پشاوری چلم کا پانی تھا۔

سپرنٹنڈنٹ "مضبوط اعصاب" کا مالک تھا جب کبھی اس سے کھانے پینے کی اس خرابی کے متعلق کہا جاتا وہ خنجر قاتل کی طرح مسکراتا اور یہی کہتا کہ گورنمنٹ نے راشن کے جو نرخ مقرر کئے ہیں اس گرانی کے زمانہ میں اس قیمت میں یہی راشن مل سکتا ہے۔
مجھے بہت سی جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا لیکن ڈیرہ اسمٰعیل خان سنٹرل جیل سے زیادہ متعفن ناکارہ، مضر صحت اور ذائقہ کا دشمن کھانا کہیں نہیں دیکھا، اور نہ ایسا سپرنٹنڈنٹ کہیں پایا جو اس ناقص غذا پر فخر کرتا ہو۔

یہ لکھ چکا ہوں کہ کراچی سنٹرل جیل سے سول ہسپتال میں میری منتقلی میری خواہش اور علم کے بغیر تھی، پولیس نے سول ہسپتال میں وہ حصار باندھا کہ دوسرے مریضوں کو بھی تکلیف ہو گئی کوئی شخص میرے کمرے میں جھانک نہ سکتا تھا دو مسلح پولیس والے میرے کمرے کے دروازہ پر اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے گڑ گئے ہیں۔ سی آئی ڈی کے اہلکاران پر مستزاد۔ ہسپتال کا ملازم کھانا لایا تو سب انسپکٹر اس کے ساتھ گھس آیا، میں نے اس سے کہا،

"آپ باہر چلے جائیں کسی نظر بند کے ساتھ آپ ہسپتال میں اس طرح نہیں رہ سکتے، اور نہ اس کے کمرے میں آ سکتے ہیں، فوراً چلے جائیے ورنہ مجھے سنٹرل جیل واپس کر دیجئے۔ آپ نہ گئے تو میں علاج کرانے ہی سے انکار نہیں کروں گا بلکہ بھوک ہڑتال بھی کر دوں گا۔"

وہ چلا گیا۔ پینگ وارڈ کے کمرے بہت چھوٹے ہیں، جس کمرہ میں مجھے رکھا

گیا اس کے عقب میں بھی ایک کھڑکی تھی اس کھڑکی کے پاس سی آئی ڈی کے دو اہلکار آ کھڑے ہوتے۔ یہ گویا کھانے کی میز، بیمار کی غذا اسپتال کے خدمتگار (Attendance) کا احتساب تھا میں نے انہیں جھڑک دیا اور کہا۔ آپ یہاں کھڑے نہ ہوں جس طرح آپ سر پہ سوار ہو گئے ہیں اُس سے میری بیماری میں اضافہ ہو گا، میں ڈاکو نہیں، انسان ہوں اور ان لوگوں سے زیادہ شریف ہوں جنہوں نے مجھے نظر بند کیا اور اب بیمار کر کے یہاں بھیج دیا ہے۔

اگر آپ اس طرح کھڑے رہے اور ہٹے نہیں تو میں ابھی اُلٹے پاؤں واپس جیل چلا جاؤں گا، میں نے اُٹھ کر کھڑکی کا دروازہ بند کر دیا اور چلا کر کہا خبردار کسی نے اندر جھانکنے یا دروازہ پہ وحشیانہ انداز میں کھڑا ہونے کی کوشش کی، اسی وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس، سپرنٹنڈنٹ جیل اور میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ہسپتال کو خطوط لکھے کہ پولیس اور سی آئی ڈی نے جس طرح ناکہ بندی کی ہے میرے لئے ناقابل برداشت ہے، اگر فوراً تدارک نہ کیا گیا اور قواعد نظر بندی کی اس طرح خلاف ورزی کی گئی تو میرے لئے علاج کرانا مشکل ہے مجھے معذور سمجھا جائے۔ کوئی گھنٹہ بعد سب انسپکٹر آگیا اور کہا کہ ہم آپ کے ممنون ہیں ہم خود شکنجہ میں آگئے تھے اب ایک ہی ملازم ایک طرف کھڑا رہے گا، سی آئی ڈی والوں کو ہدایت ہو گئی ہے کہ یہاں بالکل نہ آئیں دُور رہیں اور نگرانی کریں۔ میں نے اس سے کہا کہ کوئی افسر آئے تو اس سے کہہ دیجئے کہ میرے کمرے میں بلا اجازت داخل نہ ہو اور نہ میرے آرام یا مطالعہ میں خلل ڈالے، میں پولیس کا قیدی نہیں میری نظر بندی کے انچارج یہاں بھی سپرنٹنڈنٹ جیل ہیں۔ پولیس کے صرف دو کام ہیں۔

۱۔ میں بھاگ نہ جاؤں۔

۲۔ کوئی مجھ پہ حملہ آور نہ ہو۔

کوئی تیسرا کام پولیس کے ذمہ نہیں اپنے افسروں سے کہہ دیں کہ میں بیڈھب آدمی ہوں ان کی آمد سے مجھے ذہنی کوفت ہوتی ہے۔

پولیٹیکل قیدیوں اور نظر بندوں پر ان حالتوں میں ہمیشہ ایسی گارد لگائی جاتی ہے جو سرد مہر اور سنگدل ہو۔ میرا کسی فرد سے جھگڑا نہیں تھا اس ذہن سے جھگڑا تھا جو میں نے ہسپتال میں داخل ہونے کے دوسرے گھنٹہ ہی میں چکا دیا۔

تھوڑی سی دیر میں پروفیسر افتخار احمد، پروفیسر کرنل نجیب اللہ کے ہمراہ تشریف لائے، معائنہ کیا، دوائیں لکھیں اور یہ کہہ کر چلے گئے اطمینان سے علاج کراؤ۔ مختلف ٹسٹ ہوتے رہیں گے یہاں جیل کی فضا کے ذہنی اثر کو دُور کرنے کے لئے بُلوایا ہے میں نے پولیس کی شکایت کی انہوں نے کہا۔ ایسا نہیں ہوگا، پھر سب انسپکٹر کو بلاکر کہا — "میں ان کے ہسٹری شیٹ پر لکھ رہا ہوں انہیں جیل کی چار دیواری میں صبح وشام گھمائیے پھرائیے تاکہ ان میں انسولین پیدا ہو یہ جتنا چلیں گے اتنا ہی ان کی بیماری گھٹے گی۔

میں نے پروفیسر صاحب سے کہا، یہ کمرہ قبر کی طرح ہے کوئی کھلا کمرہ ہونا چاہیئے کہنے لگے ابھی تھوڑی دیر میں میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سرجن اے رحیم سے بات کرتا ہوں، آپ بھی ان سے کہیں۔ بلکہ لکھ کر بھجوادیں۔ اسی بلاک میں چار کمرے، دو نچلی منزل میں دو اوپر کی منزل میں، وی آئی پی روم کہلاتے ہیں، ان میں سے ایک کمرہ آپ کو دے دیں"۔

پروفیسر افتخار نے کہا میں ایک ماہ کی چھٹی پر جا رہا ہوں آئندہ کرنل صاحب آپ کا علاج کریں گے کوئی تکلیف ہو تو انہیں کہہ دیجئے گا یہ ہر چیز ٹھیک کر لیں گے۔

کرنل نجیب اللہ ذیابیطس کے سپیشلسٹ تھے ذیابیطس اور اختلاج قلب کے متعلق انہوں نے دو کتابیں لکھی ہیں ان میں مریض کو سمجھانے کے لئے نہایت

سہل وسادہ انداز اختیار کیا ہے، کرنل صاحب لیاقت میڈیکل کالج حیدرآباد
میں پرنسپل رہے تھے یہاں ان سے جونیئر لوگ آگے بڑھے ہوتے تھے، ڈو میڈیکل
کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمود شاہ این ای ڈی کے اُستاد تھے، مذہباً قادیانی، مسٹر اے بی
اعوان کے ہمزلف، سرجن اے رحیم جونیئر تھے لیکن گورنر موسیٰ کی نگہ التفات
نے انہیں سول ہسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ بنا دیا تھا، مشہور تھا کہ وہ ہندوستان
کے مشہور کرکٹ ایکٹر دلیپ کمار کے چچیرے بھائی ہیں، اہلیہ ان کی جرمنی تھیں۔
نہایت سخت گیر تھے، ماتحت عملہ ان سے بہت ڈرتا تھا، ہسپتال کو انہوں نے
زیبائش کدہ بنا دیا تھا، وہ ماتحت ڈاکٹروں اور نرسوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے، ڈسپنسروں
اہلکاروں، خاکروبوں، چوکیداروں اور خدمت گاروں پر ہاتھ تک اُٹھا لیتے تھے
مریضوں کے رشتہ دار ان سے گھبراتے۔ عام مریض جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ ہسپتال
کو سجانے اور بڑھانے میں انہوں نے بڑی محنت کی لیکن طبیعت کا کڑواپن اُن کی
خوبیوں پر حاوی تھا، خود ہڈیوں کے سرجن تھے لیکن سارے ہسپتال کی سرجری کرتے،
ایک آدھ پروفیسر کو چھوڑ کر بہت سے پروفیسر ان سے ناخوش تھے وہ بھی کسی کو خاطر
میں نہ لاتے فی الجملہ وہ ہسپتال کے لئے معمار، مریضوں کے لئے تھانیدار اور عملہ
کے لئے چوبدار تھے، اُن میں عام روایتوں کے مطابق ہمدردی کا جذبہ کم تھا، پہلے
ہی دن مجھ سے ملنے آئے تو ان کے ذہن میں یہ تھا کہ سنٹرل جیل سے مولانا احتشام الحق
تھانوی آئے ہیں۔ دوسرے تیسرے روز میں گارد کے ہمراہ نیچے ٹہل رہا تھا معلوم
ہوا کہ ڈاکٹر سید غلام بھیک نیرنگ جائنٹ سیکرٹری محکمہ صحت لاہور سے آئے ہیں،
میرا ان کا آمنا سامنا ہوا تو میں نے علیک سلیک کے بعد ان سے کہا کہ جس کمرہ میں
مجھے رکھا گیا ہے وہ جیل خانہ کی کوٹھڑی (CELL) سے بھی چھوٹا ہے کسی بڑے
کمرے کا انتظام کیجئے، وی آئی پی روم خالی ہے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ——

بہت اچھا سوچ کر مطلع کروں گا، میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا سوچنا بھی آپ ہی کو ہے ابھی سوچ لیجئے یہ کونسی جاگیر ہے جس کے لئے مشورہ کی ضرورت ہے ڈاکٹر صاحب طبعاً شر لیف انسان تھے ـــــ مسکراتے اور سرجن اے رحیم سے کہا وہ کمرہ دے دو، چنانچہ میں پہلی منزل کے وی آئی پی روم نمبر ۲ میں آگیا ـــــ اس کے سامنے ہی وی آئی پی روم نمبر ا تھا، کچھ ہی دن پہلے یہاں مخدوم زادہ حسن محمود رہ گئے تھے اور جاتی دفعہ اس کمرے کے لئے اپنا فرنیچر اور قالین چھوڑ گئے تھے یہ کمرہ چہیتی ہستیوں کے لئے مخصوص تھا۔

میرے متعلق ابھی تک حکومت کا رویہ وہی تھا نہ کوئی عزیز ملاقات کر سکتا نہ کوئی دوست آسکتا تھا اُن عزیزوں کے سوا جو لاہور سے اجازت لے کر آئیں، اور وہ بھی اہلیہ، بچیاں یا خواجہ صادق کاشمیری۔

مقامی عزیز جو روز آسکتے تھے ان کی درخواستیں برابر لٹک رہی تھیں البتہ ایک فائدہ ضرور پہنچا تھا کہ لاہور سے فون آجاتا، ڈاکٹروں اور نرسوں کی ہمدردیاں چونکہ میرے ساتھ ہو گئی تھیں لہٰذا اسی وقت فون ملا دیتے، بات چیت ہو جاتی بات چیت بھی کیا؟ یہی کہ گھر میں خیریت ہے، آپ کیسے ہیں؟ میں اچھا ہوں ہم آ رہے ہیں وغیرہ۔

چودھری نذیر اختر سپرنٹنڈنٹ جیل ایک دن مزاج پرسی کے لئے آئے تو جاتی دفعہ فون ملانے سے منع کر گئے نتیجتہً ہسپتال میں ایکس چینج کے اوپریٹروں نے فون ملانا چھوڑ دیا۔ مجھے بلاواسطہ کہہ دیتے تو ممکن ہے میں اصرار نہ کرتا، میو ہسپتال لاہور میں ایسی کوئی روک نہ تھی۔ میری بیٹی نے لاہور سے فون کیا کہ چھوٹی بہن سخت بیمار ہے امی کو آنا تھا لیکن اس کی وجہ سے رُک گئی ہیں۔ میں بیماری کی نوعیت معلوم کر رہا تھا کہ ایکس چینج نے جھٹکا دے کر فون کاٹ

دیا، مجھے معلوم ہوا سرجن رحیم نے آرڈر کیا ہے، اس حرکت سے مجھے رنج پہنچا۔ میں نے سرجن رحیم کو بلوایا وہ کنی کترا گئے آخرا نہی سے معلوم ہوا کہ انہیں جیل کے سپرنٹنڈنٹ اور سی آئی ڈی کے حکام نے منع کیا ہے، میں نے ان سے کہا کہ آپ اُن کے پابند نہیں، وہ کہنے لگے میں پابند تو نہیں لیکن کسی نظر بند یا قیدی کے متعلق ان کی ہدایات پر عمل کرنا پڑتا ہے، باتوں باتوں میں ان سے ترش کلامی ہوگئی وہ مزاجاً سرکار پرست تھے ان سے جھگڑا ہوتے ہی ذیابیطس بڑھ گئی، کرنل نجیب اللہ نے ٹسٹ رپورٹ دیکھی تو پریشان ہوئے انہوں نے میری ہسٹری شیٹ پر لکھ دیا کہ مریض رُو بہ صحت ہو رہا تھا لیکن آج یکایک میں نے اس کو روبہ انحطاط پایا پیشاب اور خون کی رپورٹ دیکھی تو معلوم ہوا کہ تناسب بہت بڑھ گیا ہے مریض سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے اُس کی تو تکار ہوگئی ہے سپرنٹنڈنٹ پولیس اور جیل کے افسروں سے مل کر مریض کے لئے پریشانی کا باعث ہوئے ہیں۔ مریض کی بچی کا لاہور سے فون آیا تھا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے حکم سے کاٹ دیا گیا جس سے مریض سخت مضمحل ہوا ہے اس طرح مریض کو پریشان نہ کرنا چاہیئے ورنہ مرض کے بگڑ کر مہلک ہو جانے کا امکان ہے۔

میں کچھ دنوں اعصابی طور پر سخت مضمحل رہا، ذیابیطس خون اور پیشاب میں ایسی بڑھی کہ گھٹنے کا نام نہ لیتی تھی میں نے ۹ اگست سے پہلے یعنی ہسپتال کے دوران قیام میں ہوم سیکرٹری کو چار خط لکھے تھے کہ وہ مجھے جیل واپس بھیج دیں لیکن کوئی سا جواب نہیں آ رہا تھا اس واقعہ کے بعد میں نے انہیں ذیل کا خط لکھا۔

جناب ہوم سیکرٹری صاحب

حکومت مغربی پاکستان، لاہور

معرفت کرنل نجیب اللہ صاحب، پروفیسر میڈیسن ڈو میڈیکل کالج، کراچی
(اس حکومت کے نام جو ہوم سیکرٹری کی معرفت اختیار کرتی ہے)

محترمی،

یہ چوتھا خط ہے جو آپ کو ہسپتال سے لکھ رہا ہوں، لیکن آپ کی طرف سے مجھے کسی خط کا جواب نہیں ملا، جس سے مجھے یہ نتیجہ مرتب کرنے میں مدد ملی ہے کہ

۱۔ محض قانون کی اشک شوئی یا اپنے ضمیر کی سرزنش کو مغالطہ دینے کے لیے حکومت نے مجھے سول ہسپتال منتقل کیا ہے۔

۲۔ میں اپنی بیماری کے بارے میں جو محسوس کرتا ہوں الفاظ میں کہہ سکتا ہوں لیکن اس کا تعین نوعیت اور تشخیص معالج ہی کر سکتے ہیں۔

۳۔ میرے معالج بتا سکتے ہیں کہ مرض کس حال میں ہے اور اس کے اُتار چڑھاؤ کی رفتار کیا ہے مجھے ان کی صداقت پر بھروسہ ہے۔

۴۔ لیکن آپ نے مجھے یہاں اس طرح رکھا ہے کہ دشمن ملک کے جنگی قیدی بھی اس طرح نہیں رکھے جاتے، حکومت میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے سی آئی ڈی کے سپرنٹنڈنٹ کا کام لینا چاہتی ہے اور یہ ان کے شریفانہ پیشہ کی نفی کرتا ہے۔

۵۔ میری بیماری کی نوعیت تقاضا کرتی ہے کہ میرا کوئی عزیز میرے ساتھ ہو مثلاً میری اہلیہ میری بیٹی جیسا کہ لاہور میں سردار شوکت حیات، ملک غلام جیلانی اور خود مجھے زمانہ نظر بندی میں یہ خصوصیت حاصل رہی ہے لیکن یہاں آپ نے مجھے اس حال میں رکھا ہے جس طرح قربانی کے بکرے کو چارہ دیا جاتا اور دیکھا جاتا ہے کہ وہ بیمار تو نہیں ہے

اس کے بعد خود چھری پھیر کر ثواب حاصل کیا جاتا ہے۔

۶۔ میں عزیزوں کی ملاقات سے محروم ہوں ؛ اہل دعیال لاہور میں ہیں یہاں آنے کی مقدرت نہیں رکھتے غرض مجھے کراچی میں رکھ کر اس قسم کا خط لکھنا کہ میرے قریبی رشتہ دار مجھ سے مل سکتے ہیں سرکار کی فیاضی طبع کا انوکھا شاہکار ہے اور اس کا احساس اُن لوگوں کو تجربہ سے قبل نہیں ہو سکتا جن لوگوں نے اس فیاضی کے الفاظ منتخب کئے ہیں دُعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں وقت کی گرفت سے محفوظ رکھیں۔

۷۔ جس دن سے ہسپتال میں ہوں آپ کی مقامی سی آئی ڈی میرے بچوں کے خطوط اس طرح ہضم کر رہی ہے جس طرح یہاں عام شہرت کے مطابق رشوت کا مال ہڑپ کیا جاتا ہے۔

۸۔ اگر حکومت ایک ایسا پتھر ہو گئی ہے جس میں کوئی جونک نہیں لگ سکتی تو پھر علاج کے تکلف کو جو حفظ ماتقدم کی ایک دلاویز فصل ہے ترک کیجئے اور اس دن کو نزدیک لائیے جو بندگان عالی متعالیٰ کے نہاں خانہ دماغ میں حسینۂ شب کے ارادوں کی طرح پرورش پا رہا ہے۔

۹۔ میں اس دودھاری علاج کے لئے حکومت کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں، بزدل نہیں ہوں کہ موت سے ڈروں ایک مسلمان کی طرح موت کا خیر مقدم کروں گا۔

والسلام

شورش کاشمیری

نظر بند حال وارد

سول ہسپتال، کراچی

کراچی

۹ اگست ۱۹۶۸ء

جواب اس خط کا کبھی نہ آیا۔

ایک دن شام کے وقت پتہ چلا کہ گورنر کے بھتیجے اور داماد جو ابھی نوجوان ہی ہیں فالج کا شکار ہو گئے ہیں ان کے لئے سارا ہسپتال دوڑ رہا تھا انہیں فوراً وی آئی پی روم نمبر ا میں لایا گیا، پروفیسروں کے علاوہ سرجن رحیم اور کئی نرسوں نے تمام رات آنکھوں میں کاٹ دی، خدا نے فضل کیا اور وہ بچ گئے۔ رات بھر پیئنگ وارڈ اور گورنر ہاؤس کے مابین فون کا سلسلہ بندھا رہا اگلی صبح خود گورنر موسیٰ تشریف لائے، میرا کمرہ چونکہ سامنے تھا لہذا پولیس کی نفری میں اضافہ کر دیا۔

گورنر کی آمد سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے کئی سب انسپکٹر اور کچھ اسسٹنٹ سب انسپکٹر میرے دروازہ پہ آ کھڑے ہوئے، عبداللہ بٹ کے ایک بھائی کراچی میں رام باغ چوکی کے انچارج تھے وہ میرے کمرے میں آ گئے، ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے ظاہر ہے کہ یہ سب احتیاطی تدبیریں تھیں ان کا خیال ہوگا مبادا میں گورنر سے کسی تلخی کا اظہار کروں میں سائل تھوڑی تھا کہ گورنر سے کوئی شکایت یا حکایت کہتا، سب کچھ ان کے علم میں تھا وہ کچھ دیر اپنے داماد کے پاس رہے باہر نکلے تو پوچھا۔

یہاں کون ہے؟ سرجن رحیم نے جواب دیا ـــــ شورش کاشمیری

فرمایا ـــــ Let him Die "مرنے دو"

نرسوں میں سے ایک نے یہ الفاظ مجھے بتا دیئے۔ اس حالت میں بھی اقتدار کی رعونت کا یہ حال تھا۔ میرا معمول تھا کہ ہر نماز کے بعد میں اس نوجوان کے لئے دعا کرتا۔ گو وہ میری دعا کا محتاج نہ تھا لیکن میری طبیعت کا ایک انداز تھا، قدرت نے اس نوجوان کو جلد شفا دی اور وہ ہفتہ عشرہ ہی میں گھر چلا گیا لیکن بعض ڈاکٹروں اور ماتحت سٹاف نے جس شبانہ روز محنت سے اس نوجوان کا علاج کیا اور سرجن رحیم نے جس اخلاص سے صبح و شام حاضری دی وہ متاع صرف گورنر ہی

کی اولاد کو مل سکتی تھی۔

میری عادت تھی طبیعت اکتا جاتی تو باہر کاریڈور میں کرسی بچھا کے کھلی ہوا اور فضا کا لطف لیتا، میرے پاس سے گورنر کے بھائی سردار اسحاق اور بعض دوسرے عزیز گزرتے، وہ اس وقت شاہی خاندان کے افراد تھے یہ اُن کے منصب سے فروتر تھا کہ ایک نظر بند بیمار سے علیک سلیک کرتے، گارد کے لوگ انہیں آتے جاتے سلام کرتے، ڈاکٹر جلو میں ہوتے غرض ان کے آتے ہی سارا عملہ باملاحظہ باادب ہو جاتا لیکن میرے لئے ان کا آنا جانا کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ وہ تکبر سے آتے اور تکبر سے چلے جاتے میں تکبر سے بیٹھا رہتا اور اس طرح بے نیازی برتتا جیسے ان کا وجود ہی نہیں، اس بے نیازی سے چڑ کر سرجن رحیم نے پولیس گارد سے کہا گورنر کا بھائی آتا ہے اور نظر بند سامنے ڈٹ کے بیٹھا رہتا ہے وہاں نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ گارد کے انچارج نے جواب دیا کہ یہ بات آپ کہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے اور نہ وہ ہماری بات مانے گا۔ میرے کانوں میں بھنک پڑی تو میں نے سرجن رحیم کو بلا کر کہا— آپ پولیس کو آرڈر نہ دیا کریں میرے متعلق جو کہنا ہو مجھے کہا کریں۔ گورنر کے بھائی آپ کے لئے بہت بڑی چیز ہوں گے میرے لئے کچھ نہیں، انہیں مجھ سے کوئی شکایت ہو تو آپ مجھے بتا دیں۔

س: کاریڈور اس طرح بیٹھنے کے لئے نہیں"۔

م: یہ شکایت آپ کو اب پیدا ہوئی ہے پہلے کیوں نہ تھی کیا اس لئے کہ گورنر صاحب کے بھائی کو ناگوار گزرتا ہے"۔

اُسی شام میں نے سی آئی ڈی کے اہلکار کو ڈانٹ دیا کہ اُوپر کیوں آیا ہے؟ کرنل نجیب اللہ نے سرجن رحیم کے متعلق میری ہسٹری شیٹ پر جو شکایتی ریمارکس لکھے تھے سرجن رحیم وہ کاغذ اتار کر لے گئے مجھے معلوم نہ تھا کہ سرجن رحیم

کو کرنل نجیب اللہ ناپسند کرتے ہیں، کرنل صاحب نے کبھی اشارۃً یا کنایۃً بھی اس کا ذکر نہ کیا تھا، لیکن سرجن رحیم نے جانے اُوپر کیا شکایت کی کہ کرنل نجیب اللہ کو علاج سے روک کر مجھے ایک دوسرے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر نذیر چودھری کے سپرد کر دیا، یہ افسوس ناک حرکت تھی، نذیر چودھری بلاشبہ ایک شریف انسان تھے لیکن سرجن رحیم کو یہ حق کسی طرح نہ پہنچتا تھا کہ میرے معالج کو بدلوائیں۔ معالج کا انتخاب نظر بند کی مرضی پر ہے۔ اور اسی کو حق پہنچتا ہے، کہ وہ فلاں سے نہیں فلاں سے علاج کرانا چاہتا ہے۔

میں نے ٹھان لی کہ اب یہاں نہیں رہوں گا۔ چنانچہ کمشنر اور ڈی آئی جی کو لکھ دیا کہ مجھے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ پر اعتماد نہیں رہا جان کا خطرہ ہے لہٰذا مجھے فوراً سنٹرل جیل منتقل کر دیا جائے۔ اگر آج شام تک منتقل نہ کیا گیا تو کھانا پینا چھوڑ دوں گا اور کوئی سی دوائی نہیں لوں گا۔ ڈاکٹر لوٹا دیئے، نرسوں سے کہہ دیا کہ انجکشن نہ لگائیں۔

حکومت کو لحظہ لحظہ کی خبر ٹیلی پرنٹر پر دی جا رہی تھی، دن چڑھے تین ڈاکٹروں کا ایک بورڈ آ گیا۔ بورڈ صوبائی حکومت کی مرضی پر قائم ہوا تھا، بورڈ نے بہت کوشش کی کہ میں اس سے معائنہ کرالوں لیکن میں نے انکار کر دیا ——— بورڈ کے ارکان سر کھپا کے رہ گئے میں نے رسید ہی نہ دی، نہ پوچھا وہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں ان کے اسمائے گرامی کیا ہیں؟ نو بجے بورڈ آ کر ناکام چلا گیا، میرا ایک ہی مطالبہ تھا کہ میں یہاں رہنا نہیں چاہتا مجھے واپس جیل بھیج دیا جائے۔

کرنل نجیب اللہ نے میرے متعلق حکومت کو لکھا تھا کہ مریض کی حالت صحیح نہیں، کئی امراض کا مجموعہ ہوتا جا رہا ہے، سرجن رحیم کا بطور معالج مجھ سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن حکومت کی خواہش کا انہیں علم تھا وہ اس کے اعتماد میں تھے۔ انہی کے مشورہ پر محکمہ صحت کے صوبائی سیکرٹری نے بورڈ بنایا لیکن یہ بورڈ جس طرح آیا اسی طرح لوٹ گیا۔

میں ہسپتال میں رہنا ہی نہیں چاہتا تھا حکومت نے ہسپتال بھیج کر خواہ مخواہ تکلف کیا تھا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ حکومت میرے علاج میں جو دلچسپی لے رہی ہے وہ ہمدردی نہیں کچھ اور چیز ہے۔

گورنر نے لاہور جا کر ہیلتھ سیکرٹری کو لکھا کہ مجھے وی آئی پی روم میں کیوں رکھا گیا، ڈاکٹر سید غلام بھیک کو جواب دینا پڑا اسرجن رحیم کمرہ چھیننے پر تیار ہو گئے لیکن ان میں صاف کہنے کا بوتا نہیں تھا ہاؤس سرجن سے کہلوایا، میں نے کہا یہ کمرہ کن لوگوں کے لئے ہے؟ امراء و حکام کے لئے؟ میں یہ کمرہ نہیں چھوڑوں گا۔

دوسرے تیسرے روز میرے خلیرے بھائی مجھ سے مل لیتے، کئی دوست جو کسی طرح بھی سیاسی نہ تھے ہر روز چلے آتے سب دوستوں کا نام لینا تو مصلحت کے منافی ہوگا لیکن انور عارف، جن سے میرے دوستانہ تعلقات عزیزداری سے بڑھے ہوئے تھے بلاناغہ ملتے، ہفتہ وار پیمان کراچی کے ایڈیٹر فرید احمد بھی چلے آتے، ایک دفعہ خواجہ مشفق بھی آ گئے ابن انشاء نے بڑی ہمت کی اور کتابیں دے گئے، ابوسلمان شاہجہانپوری بھی آتے رہے لیکن ایک دن وہ سی آئی ڈی کے اہلکار کی نظر میں آ گئے اس نے تعاقب کیا، ابوسلمان کے لئے مصیبت کھڑی ہو گئی۔ وہ آنے سے رک گئے میں نے سی آئی ڈی کا ناطقہ اس طرح بند کیا کہ پھر کسی نگران سپاہی میں سامنے آنے کا حوصلہ نہ تھا۔ سبب یہ نہیں تھا کہ میں حکومت سے طاقتور تھا سبب یہ تھا کہ موت کے خوف سے بے نیاز ہو کر میں بے پناہ ہو گیا تھا۔ حکومتیں ہمیشہ اپنی موت سے ڈرتی ہیں میری بیماری اور بھوک ہڑتال پر پنجاب میں سخت مظاہرے ہو رہے تھے۔ میں اپنے دوستوں سے بلا اجازت ملاقات کر لیتا تھا، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ پولیس گارڈ کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ ڈیوٹی آفیسر اغماض کرنے لگے سرجن رحیم کے سوا سارا عملہ میرے ساتھ تھا اور حکومت کی خواہش و منشا سے متفق نہ تھا — اسی دوران میں ڈاکٹر

مبشر حسن جو اُن دنوں ہمارے دوست تھے ـــــــ ڈاکٹر بن کر ملنے آ گئے اُن سے وکلا کی تبدیلی کا سبب پوچھا وہ بس ٹھیک ہو رہا ہے کہہ کے ٹال گئے۔ لیکن بھٹو صاحب کی طرف سے پیغام دیا کہ سپریم کورٹ میں پیش ہونے کے لئے ان کا نام لکھ دو میں نے کہا وہ باقاعدہ پریکٹس نہیں کرتے اور نہ ان کا نام سپریم کورٹ کے وکلا میں درج ہے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا بس تم لکھ دو، مقصود تو حکومت کو ستانا ہے، پیش تو شیخ سعید اختر ہوں گے بہرحال میں نے سپریم کورٹ کو لکھ دیا جواب آیا کہ سپریم کورٹ کے وکلا میں ان کا نام نہیں ہے۔

میں نے ۱۵ اگست کو سپریم کورٹ میں ہوم سیکرٹری کی معرفت درخواست گزاری وہ درخواست ہوم سیکرٹری کے خط بحوالہ ۶۸-۱-ایس پی ایل-ایچ-۲۷-۲ بتاریخ ۱۳ اگست کو روانہ کی گئی۔

جسٹس فضل اکبر ریٹائرمنٹ کے اواخر میں تھے ان کا لمبی تاریخ ڈالنا ظاہر کرتا تھا کہ انہیں مجھ سے کوئی سی ہمدردی نہیں۔ میرے اس خط کا پانچ ستمبر کو جواب آیا ـــــ بحوالہ آئی-سی-ایس-۶۸-۸-۴۸-اے-سی آر ـــــ کہ

۱- مسٹر سعید اختر محولا مقدمہ میں پیش ہو سکتے ہیں اس کے لئے اجازت ضروری نہیں۔ مسٹر بھٹو کا نام سپریم کورٹ کے وکلا میں درج ہی نہیں ان کی اجازت کے مسئلہ پہ ۹ ستمبر کو مرافعہ کے وقت غور کیا جائے گا۔

۲- سپریم کورٹ، ہائی کورٹ میں حکومت کے جمع کردہ روپیہ پر تا فیصلہ اپیل حکم امتناعی جاری کر چکی ہے ایسا کوئی فنڈ نہیں جو مسئول علیہ (Respondent) کے وکیل کو ادا کیا جائے۔

۳- نظر بند سے مسٹر بھٹو کی ملاقات کا فیصلہ تب کیا جائے گا جب مسٹر بھٹو کو ان کے مقدمہ میں پیش ہونے کی اجازت دی جائے گی۔

میرے پاس اس قسم کے شواہد جمع ہو گئے تھے کہ میرا ہسپتال سے چلے جانا ہی بہتر تھا۔ ایک قادیانی العقیدہ نرس بشریٰ (غالباً یہی نام تھا) کی پینگ وارڈ میں ڈیوٹی لگ گئی ایک دوسری نرس نے مجھے آگاہ کیا بشریٰ انجکشن دینے آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

بیٹی، آپ ربوہ میں رہتی ہیں۔

اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ وہ بہر حال بیٹی تھی۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ اس کے ہاتھوں مجھے کوئی نقصان پہنچتا لیکن میں بہر حال بدگمان تھا، میں نے اس سے کہا بیٹی! میں نے علاج کا بائیکاٹ کر دیا ہے، آپ تکلیف نہ کریں۔ وہ چلی گئی لیکن اسی دن اس کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ میرے شبہات کچھ اتنے قوی ہوتے گئے کہ میں نے ہسپتال میں رہنا مہلک سمجھا۔ چنانچہ میڈیکل بورڈ کے بائیکاٹ کے علاوہ میں نے کمشنر کراچی اور ڈی آئی جی کراچی کو اس مفہوم کا تار دیا کہ

"میں شورش کاشمیری نظر بند آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ سول ہسپتال میں مجھے میری خواہش کے خلاف رکھا گیا ہے میرے ساتھ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کا سلوک غیر انسانی اور بدنیتی پر مبنی ہے میں اب یہاں علاج کرانا نہیں چاہتا میری زندگی خطرہ میں ہے مجھے یہاں سے فوراً منتقل کیا جائے اور میری زندگی بچانے کے لئے فوری کاروائی کی جائے۔"

شورش کاشمیری

چنانچہ ۲۰ اگست کو مجھے واپس جیل بھیج دیا۔

حکومت نہیں چاہتی تھی کہ سپریم کورٹ میں اپیل کے دوران میں بھوک ہڑتال ہو اس کو پنجاب میں زبردست عوامی احتجاج کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس نے ہائیکورٹ میں اس قسم کے دستاویز مہیا کئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرے پنجاب یا سرحد میں میری منتقلی سے لاء اینڈ آرڈر کی دوشیزہ کے اغوا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ جس

نیت سے حکومت نے مجھے گرفتار کیا تھا وہ سب کیا دھرا رہ گیا اب ذہنی عذاب کا شکار تھا میں نے ۲۶ اگست کو بھوک ہڑتال شروع کی اور ۲۹ کو جیل سے ہوم سیکرٹری کے نام ذیل کا خط لکھا۔

ختم نبوت زندہ باد

بخدمت جناب ہوم سیکرٹری صاحب، حکومت مغربی پاکستان لاہور

جناب مکرم،

میں نے حکومت مغربی پاکستان کے جبر و تشدد کے خلاف ۲۶ اگست سہ پہر سے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔

اپنے مطالبات میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو لکھوا دیئے ہیں، جیل کا محکمہ مجھے جبری طور پر دو وقت پاؤ بھر دودھ پلا رہا ہے، میں محسوس کر رہا ہوں کہ حکومت میرزائی نواز ہو گئی ہے اس نے ختم نبوت کے عقیدہ کو مجروح و مظلوم کر دیا ہے اس کی اس روش کے خلاف احتجاج کرنا میرا فرض ہو گیا ہے میری بھوک ہڑتال دراصل روزہ ہے، جب تک حکومت اپنے رویہ پر نظر ثانی نہیں کرتی میں اس روزہ کو اس وقت تک جاری رکھوں گا تا آنکہ میرا پیمانہ زندگی لبریز ہو جائے ــ میں اپنا روزہ پانی سے رکھوں گا اور پانی ہی سے افطار کروں گا۔ آپ سے متمنی ہوں کہ آپ جیل کے محکمہ کو جبری (Feeding) سے روک دیں۔ یہ ایک دینی فرض کی اہانت ہے اس سے مداخلت فی الدین ہوتی ہے۔ مزید برآں یہ مداخلت دستور پاکستان کے آرٹیکل (۶) بنیادی حق نمبر (۱۰) کی خلاف ورزی ہے واضح رہے کہ یہ دفعہ ہنگامی قوانین کے تحت معطل نہیں ہوئی ہے۔

اگر آپ نے جیل کے محکمہ کو جبری (Feeding) سے نہ روکا تو مجھے مداخلت فی الدین کی اس ذہنیت کے خلاف مدافعت کا حق حاصل ہوگا اس صورت میں مزید قدم اٹھانے کا بھی اسلاماً اور اخلاقاً مجھے حق پہنچتا ہے۔ والسلام

المخلص

کراچی سنٹرل جیل — شورش کاشمیری

۲۹ اگست ۱۹۶۸ء — نظر بند بجرم ختم نبوت

جن مطالبات کا حوالہ دیا ہے وہ یہ تھے:

۱۔ حکومت میرا علاج کرانا چاہتی ہے تو میری مرضی کے مطابق کرائے۔ سول ہسپتال میں سرجن رحیم کے ہوتے ہوئے میں علاج نہیں کراؤں گا۔

۲۔ مجھے لاہور میو ہسپتال میں تبدیل کیا جائے حکومت وہاں بھیجنا نہ چاہے تو یہاں جناح ہسپتال میں بھیجا جائے اور کسی ہسپتال میں نہیں جاؤں گا۔

۳۔ میرے ملاقاتیوں کی فہرست جو میں نے بھیجی ہے فوراً منظور کی جائے۔

۴۔ حکومت نے میرا کاروبار ہڑپ کر رکھا ہے نتیجۃً ہماری آمدنی ختم ہوگئی ہے، میرے اہل خانہ کو الاؤنس دینا چاہیئے۔

مرزائی نوازی کا اس سے بڑا ثبوت کیا تھا کہ آمریت نے اپنی چند روزہ طاقت کے گھمنڈ میں مرزائیوں کو مسلمانوں کا فرقہ قرار دیا اور نہایت ڈھٹائی سے ان کا دفاع کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ صوبائی حکومت نے انہی دنوں ایک قادیانی کو جو وہاں کسی دوسرے عہدہ پر تھا کراچی میں ڈپٹی کمشنر لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اسی وقت صدر ایوب کے نام ایک بے ضابطہ (UN-AUTHORISED) رجسٹرڈ خط لکھا اور اس کے نتائج سے مطلع کیا کہ جو مسئلہ کراچی میں نہیں ہے وہ پیدا ہو جائے گا، خدا

جانے دانشوروں سے ان تک پہنچا یا یا نہیں لیکن وہ صاحب تب کراچی کی ڈپٹی کمشنری سے رہ گئے۔ گورنر کو بھی ایک خط لکھا کہ مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ضد سے مسئلہ حل نہیں ہوتے جس وزیر کو وہ معتمد سمجھتے ہیں اس نے کبھی کسی سے وفا نہیں کی وہ بیسوا اور ہوا کی طرح بدل جانے کا عادی ہے، دیکھتی آنکھوں انگریزوں کا جاہ وجلال رخصت ہو گیا تو وہ لوگ کیونکہ ٹھہر سکتے ہیں جن کا وجود ہی زوال کی پیداوار ہے۔

اخبارات جبراً خاموش تھے وہ بھوک ہڑتال کی خبر تک دینے سے کتراتے اور گھبراتے تھے ــــ پنجاب میں اس کے باوجود احتجاج ہو رہا تھا۔ مسٹر مسعود نبی نور نے مجید نظامی کو بلا کر کہا کہ وہ میرے پاس جائیں اور بھوک ہڑتال چھڑا دیں۔ نظامی صاحب نے کہا کہ ــــ شورش نہ مانا، تو حکومت بدگمان ہو گی بہتر ہے کوئی اور دوست تلاش کیا جائے۔

ہوم سیکرٹری نے کہا۔

سالات خراب ہو رہے ہیں، شورش کی حالت بھی اچھی نہیں ــــ یہ بتائیے کہ انہیں اپنے بچوں میں سب سے زیادہ لگاؤ کس کے ساتھ ہے اور وہ کس بچے کی بات مانتے ہیں۔

نظامی صاحب نے کہا۔

میرا خیال ہے وہ اپنی بڑی بیٹی شائستہ کی بات مانتے ہیں۔

ہوم سیکرٹری نے کہا۔

ان کی اہلیہ اور ان کی بیٹی کے ساتھ کوئی ایسا دوست جائے جو ان کا معتمد ہو اور وہ اس کی بات، مان لیں۔

نظامی صاحب نے کہا۔

"اس غرض سے مولانا تاج محمود (لائل پور) مفید بھی ہیں اور معتمد بھی"
یکم ستمبر کو اتوار تھا میری بیوی، بیٹی اور مولانا تاج محمود رات کے جہاز سے کراچی پہنچ گئے، صبح جیلر نے بتایا کہ آپ کی بیٹی، اور اہلیہ آئی ہیں۔ میں نے کہا آج اتوار ہے کہنے لگے ملاقات ہو جائے گی ہوم سیکرٹری نے فون پر حکم دیا ہے۔
"کوئی اور بھی ساتھ ہے؟"
"آپ کے کچھ عزیز ہیں"
"اور؟"
"اور کوئی نہیں، سی آئی ڈی کے انسپکٹر کا انتظار ہو رہا اور وہ آ رہا ہے، ابھی تھوڑی سی دیر میں ملاقات ہو گی"
"جو عزیز ان کے ساتھ آئے ہیں انہیں بھی اجازت مل گئی ہے"
"نہیں — ان کی اجازت نہیں آئی ہے"
"تو پھر ملاقات کی ضرورت نہیں انہیں واپس کر دو"
"ان کی ملاقات کے لئے ابھی لاہور سے پوچھ لیتے ہیں"
"لیکن میں سی آئی ڈی کے انسپکٹر کی موجودگی میں ملاقات نہیں کروں گا"
جیلر دوڑا دوڑا ڈیوڑھی گیا اس نے شروع میں کہا تھا کہ ہوم سیکرٹری ملاقات کا نتیجہ سننے کیلئے بیٹھے ہیں اب جواب لایا کہ اتوار کی وجہ سے باہر ہیں، میں نے جواب دیا۔
"ضروری نہیں کہ آج ہی ملاقات ہو کل بھی ہو سکتی ہے" اتنے میں میری بیوی اور بیٹی اندر آ گئیں، حالت میری اچھی نہیں تھی، دونو اشکبار ہو گئیں، ان سے پوچھا تمہارے ساتھ اور کون ہے، کہنے لگیں "مولانا تاج محمود آئے ہیں، یہاں سے احمد اور انور عارف ہیں"
میں نے جیلر سے کہا۔ ان تینوں کو بلاؤ اس کے بس میں نہیں تھا، اتنے میں ایک

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے اطلاع دی کہ مولانا تاج محمود کے متعلق بھی اجازت مل گئی ہے۔

میں نے کہا باقی دو کے متعلق؟

جیلر نے کہا "ان کی اجازت بھی مل جائے گی"۔

مولانا تاج محمود آتے ہی آبدیدہ ہو گئے، پاؤں پکڑ لئے کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دو۔ میں نے عرض کیا "اس کے علاوہ بھی کئی موضوع ہیں" مولانا تاج محمود نے کہا جیل کے افسر بیٹھے ہیں تو سی آئی ڈی کے انسپکٹر کو روکنے سے کیا فائدہ ہے وہ ایک شریف آدمی ہے ہم کونسی سازش کر رہے ہیں، میں نے انسپکٹر پولیس کو روک دیا تھا کہ وہ موجود ہوگا، تو میں ملاقات نہیں کروں گا وہ باہر بیٹھا تھا۔

میں نے مولانا سے کہا سی آئی ڈی نے جس طرح ستایا ہے یہ اس کا جواب ہے۔ ورنہ مجھے شخصاً کوئی شکایت نہیں۔

مولانا نے انسپکٹر کو بلوا لیا، ظہیر الدین نام تھا، واقعی شریف آدمی تھا، اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا سمجھدار ہے عیار نہیں۔

میری بیٹی اور اہلیہ نے بہت کوشش کی حتیٰ کہ رونے لگیں، مولانا تاج محمود نے کئی جتن کئے لیکن میں نے مطالبات تسلیم کرائے بغیر بھوک ہڑتال چھوڑنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اور ان سے کہہ دیا کہ یہ ناممکن ہے۔

انور عارف اور احمد میرزا بھی آ گئے وہ بھی منت کرتے رہے لیکن میں حکومت سے اس قدر متنفر تھا کہ مطالبات منوائے بغیر بھوک ہڑتال چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔

میں نے انسپکٹر سے کہا۔

ایسی حکومت کے عہد میں زندہ رہنا بھی شدید جرم ہے، آمریت کے دامن پر ایک ایسا خون ضرور ہونا چاہیئے جو ہمیشہ زندہ رہے اور جب تک آمروں کی

گی ہے وہ پریشان رہیں۔

وہ صبح نو بجے آئے تھے شام پانچ بجے لوٹ گئے اگلے روز میری بیٹی، اہلیہ اور تاج محمود پھر سے آئے، وہی اصرار لیکن میں نے وہی جواب دیا جو دے چکا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا ـــــ اس طرح حکومت نہیں جھکے گی،

میں نے کہا ـــــ تو مجھے بھی آپ اُتنا ہی سخت پائیں گے۔

قاضی فضل اللہ نے کراچی میں اخباری نمائندوں کے سوال پر جواب دیا کہ شورش کاشمیری نے اس لئے بھوک ہڑتال کی ہوئی ہے کہ وہ جناح ہسپتال میں جانا چاہتا ہے لیکن جناح ہسپتال صوبائی حکومت کے ماتحت نہیں، اس کے سوا وہ جس صوبائی ہسپتال میں جس ڈاکٹر سے جہاں علاج کرانا چاہے حکومت تیار ہے۔

میں نے یہ پڑھتے ہی گورنر موسیٰ، قاضی فضل اللہ اور ہوم سیکرٹری کو تار دیا کہ آپ کے معمر ہوم منسٹر نے اخبارات کو اس مطلب کا بیان دیا ہے آپ مجھے میو ہسپتال لاہور بغرض علاج بھجوا دیں وہ بلاشبہ صوبائی حکومت کے ماتحت ہے۔

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، حکومت نے مطالبات مان لینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن جناح ہسپتال بھجوانے پر تیار نہ ہوئی کہ وہ ہسپتال اس کے اختیارات میں نہیں تھا میو ہسپتال خارج از بحث تھا۔ جناح ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کرنل خواجہ عبدالرشید سے پوچھا گیا کہ شورش آپ کے ہاں علاج کرانے پر کیوں مصر ہے انہوں نے جواب دیا میرا دوست ہے مجھ پر اعتماد ہوگا۔

حکومت نے سول ہسپتال کراچی کی پیش کش کی میں نے کہا دوبارہ وہاں جانے کا سوال ہی نہیں، آخر وہی ہوا جو میں نے چاہا تھا، کامیابی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ تمام صوبہ مشتعل تھا، لاہور میں اعزہ و احباب کا دباؤ بڑھ گیا عام جلسوں میں کھلم کھلا حکومت کو مطعون کیا جا رہا تھا موچی دروازہ کے ایک جلسہ عام میں جو ملک اسلم حیات

کی صدارت میں ہوا حکومت کو یہاں تک کہا گیا کہ شورش کاشمیری مر گیا تو ملک میں بغاوت ہو جائے گی۔ ماسٹر تاج الدین انصاری جیسا نرم خو اور نرم گفتار انسان بھی حکومت کو چیلنج دینے پر تیار ہو گیا۔ بعض خانہ زاد کاسہ لیسوں کے سوا ہر سیاسی مکتب فکر کے راہنماؤں نے اس جلسہ کو خطاب کیا، کہتے ہیں اتنی حاضری تھی کہ لوگ درختوں پر چڑھے ہوئے تھے۔

حکومت، مان گئی کہ

۱۔ علاج میری مرضی کے مطابق ہوگا۔

۲۔ مجھے فوراً جناح ہسپتال بھیجا جائے گا۔

۳۔ ملاقاتیوں کی فہرست منظور کر لی گئی۔

۴۔ فیملی الاؤنس زیر غور ہے اسی ہفتہ احکام جاری ہو جائیں گے۔

۲۶ اگست سے چھ ستمبر تک، کل بارہ دن کی بھوک ہڑتال نے رائے عامہ کے زور پر حکومت کو جھکا دیا میں چھ ستمبر کو جناح ہسپتال پہنچا، تو معلوم ہوا صحت کا ملاً تلف ہو گئی ہے بدن میں سکت نہیں، ڈاکٹر لطیف منہاس معالج مقرر کئے گئے، فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک شریف انسان ہیں، کرنل خواجہ عبدالرشید تشریف لائے اور اطمینان دلایا کہ یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی جب تک صحت کاملہ نہ ہو آپ یہاں سے نہیں جا سکتے، خواجہ صاحب علم و ادب کے رسیا، اور فکر و نظر میں عالم انسان ہیں، ان سے یہی توقع تھی، پولیس گارد قریب قریب انہی سب انسپکٹروں پر مشتمل تھی جو میرے ساتھ سول ہسپتال میں رہے تھے۔ ۹ ستمبر کو سپریم کورٹ میں حکومت کا مرافعہ شروع ہو رہا تھا جو دوست آ تا مل جاتا، ۸ ستمبر کو شیخ سعید اختر اور ان کے اٹارنی مسٹر تنویر احمد پہنچ گئے۔ شیخ صاحب اسی دن مجھ سے ملے اس درویش انسان نے بلا فیس مقدمہ لڑ کے وہ ایثار دکھایا کہ رواں رواں ان کا شکر گزار

تھا، مزے ان وکلاء کے تھے جنہیں میری نظر بندی کو جائز ثابت کرنے پر خزانہ حکومت سے منہ مانگی فیسیں مل رہیں اور وہ گلچھڑے اڑا رہے تھے۔

میاں منظر بشیر بھی اسی شام مل گئے، میں ان کا ممنون تھا، انہوں نے میرے مقدمہ میں بڑی دوڑ دھوپ دکھائی اور یہاں تک پہنچے ان کے والد میاں بشیر احمد (مدیر ہمایوں) بھی تشریف لائے، دیر تک بیٹھے رہے، غرض اس طرح لوگ آتے جاتے رہے، میری بیوی اور بیٹی ہسپتال میں میرے داخل ہونے کے اگلے ہی روز واپس چلی گئی تھیں۔

سپریم کورٹ نے ۹ سے ۱۳ تک سماعت کی، گیارہ کو چھٹی تھی تین دن سرکاری وکلاء نے بحث کی، چوتھے روز میرے وکیل شیخ سعید اختر نے تین گھنٹہ میں اپنی بحث مکمل کر لی اور فیصلہ کسی تاریخ بغیر محفوظ ہو گیا۔ حکومت نے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے چیف ججوں کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ کسی مقدمہ کے متعلق کوئی سی کاروائی چھپنے سے روک سکتے ہیں ایک مدت سے یہی ہو رہا تھا، میرے مقدمہ میں جسٹس فضل اکبر کا عمومی رجحان بھی یہی تھا۔

۱۱ ستمبر کو مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا تاج محمود کے ہمراہ ملنے آ گئے، ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

۱۲ ستمبر کی شام کو مسٹر بھٹو آئے، عیادت کی اور چلے گئے۔ پیرزادہ عبدالستار کی بیٹی غالباً اسی بلاک میں زیر علاج تھیں ان کی اہلیہ اور بچی پیرزادہ کی بیٹی کے کمرے میں چلی گئیں بھٹو صاحب بھی مجھ سے مل کے وہاں چلے گئے، لیکن سی آئی ڈی نے طوفان کھڑا کر دیا آدھ گھنٹہ کے اندر اندر پولیس گارد بدل گئی نئے سب انسپکٹر آ گئے پہلے سب انسپکٹروں میں سے دو کو چارج شیٹ ہو گیا۔ بھٹو صاحب نے صرف مزاج پرسی کی تھی کوئی خفیہ سازش نہ کی تھی لیکن سرکاری مشینری کا یہ حال تھا۔

اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہے، پورا کمرہ پولیس کے نرغہ میں تھا۔

ایک چلتی رقم سب انسپکٹر جس کی زبان کترنی کی طرح چلتی تھی اور وہ غالباً جنت کے کسی قصبہ سے پاکستان پر احسان کر کے آیا تھا میرے ساتھ چپک گیا۔

میں نے اس کو منہ نہ لگایا لیکن وہ میرے ساتھ سائے کی طرح تھا۔ میری چارپائی کے پاس کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔ باہر سہ طرفہ مسلح کنسٹیبل کھڑے ہو گئے، میں نے کرنل خواجہ عبدالرشید کو بلوایا، وہ آگئے ان سے ماجرا بیان کیا۔ انہوں نے سب انسپکٹر سے کہا کہ وہ قواعد نظر بندی کی رو سے اندر نہیں بیٹھ سکتے، وہ جز بز ہونے لگا لیکن کرنل صاحب نے اسے باہر چلے جانے کو کہا اور وہ چلا گیا۔ پندرہ منٹ میں ایس پی محمود بخاری جو اس گارڈ کا انچارج تھا۔ آگیا، معلوم ہوا کہ ذوالفقار بخاری کا بھانجہ یا اسی قسم کی کوئی شے ہے۔ اس کی اتنی سروس نہ تھی جتنی میں قید کاٹ چکا تھا۔ اس نے آتے ہی کرنل صاحب سے کہا میں ایس پی ہوں، کرنل صاحب نے کہا۔

"بہت اچھا، کام کیا ہے؟"

وہ۔ "آپ سے ملنا ہے"

کرنل۔ "دفتر میں آئیے"

وہ۔ "کام ابھی ہے"

کرنل۔ "اس وقت ممکن نہیں، دفتر میں جائیے وہاں آدھ گھنٹہ میں راؤنڈ کر کے آتا ہوں"

وہ۔ (میری طرف اشارہ کر کے) "انہی کا مسئلہ ہے"

کرنل۔ "کسی کا ہو لیکن دفتر ہی میں بات ہو سکتی ہے۔

وہ اُلٹے پاؤں لوٹ گیا پندرہ بیس منٹ بعد کرنل صاحب بھی چلے گئے گھنٹہ بعد پھر آیا اور مجھ سے استفسار کرنے لگا۔

وہ۔ "آپ سے بھٹو ملے ہیں"

میں۔ "جی ہاں"

وہ۔ "ان کے پاس کوئی اجازت نامہ تھا"

میں "۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ یہاں مجھے تھوڑی ملنے آئے تھے اپنے کسی عزیز کو جو اسی بلاک میں اوپر کے کمروں میں بیمار ہے ملنے آئے تھے میں راستہ میں کھڑا تھا مجھ سے بھی مصافحہ کیا، خیریت پوچھی اور چلے گئے"۔

وہ۔ "آپ نے کیا کہا"

میں۔ "جو کلمات مزاج پرسی پر کہے جاتے ہیں"

وہ۔ "وہ کلمہ کیا تھا؟"

میں۔ "بس ایک مصرع تھا"

وہ۔ "کونسا مصرع"

میں۔ "جنوں میں جیسا ہونا چاہیئے ویسا گریبان ہے"

وہ۔ "کتنی دیر آپ کے پاس کھڑے رہے"

میں۔ "میں نے گھڑی نہیں دیکھی تھی"

وہ۔ "اندازاً"

میں "جب تک ان کا جی چاہا"

وہ۔ "کوئی سیاسی بات ہوئی"

میں۔ "کوئی نہیں۔ آپ کے اہل کار ساتھ کھڑے تھے"

وہ۔ "ان لوگوں نے آپ کو روکا"

میں۔ یہ کیونکر روک سکتے اور کیسے روک سکتے تھے مجھے یا بھٹو کو؟ میں تو پہلے ہی قید ہوں، بھٹو کو روکنا ان کے منصب میں نہیں، اور شاید انہیں تو

آپ بھی روک نہیں سکتے۔

وہ:۔ "ایسی کوئی مشکل بھی نہیں ہے"

میں:۔ "تو حل کر لیجئے!"

میں نے محسوس کیا محمود بخاری کے پاس صرف مصنوعی رعب ہے اور وہ بھی اپنے ماتحتوں کے لئے، مجھے اپنی ذہانت دکھانی چاہ رہا تھا میں نے اندازہ کیا کہ وہ ایک اوسط درجہ کا پولیس افسر بھی نہیں، بزعم خویش ہوشیار بننا چاہتا ہے لیکن رپٹ نویس قسم کا افسر ہے۔

شام کے وقت، شیخ سعید اختر ملنے آئے، تو انہیں روک دیا، وہ ایڈووکیٹ تھے دور سے علیک سلیک کی اور چلے گئے، خواجہ صادق کاشمیری نے بہتیرا کہا کہ میں ان کا بھائی ہوں میرے پاس ہوم سیکرٹری کا اجازت نامہ ہے کل مجھے لاہور جانا ہے لیکن سب انسپکٹر ماش کے دانے کی طرح اینٹھا ہوا تھا، اکڑ کے کہا ــــ نہیں مل سکتے، دونوں میں تو تکار ہو گئی، صادق نے کہا کچھ ہو میں نہیں جاؤں گا۔ وہ دھرنا مار کے بیٹھ گیا، پولیس نے افسران مجاز سے رابطہ پیدا کیا، غالباً محمود بخاری کے حکم پر ایک سب انسپکٹر کچھ مسلح سپاہی لے کر آیا اور زیر دفعہ ۱۱۷، ۱۵۱ اور ۱۰۷ گرفتار کر کے لے گیا۔ میں نے فوراً اعلان کر دیا کہ میں حکومت کی طوطا چشمی کے خلاف بھوک ہڑتال کرتا ہوں اور ہسپتال میں رہنا نہیں چاہتا، مجھے میرے صوبہ اور گھر کے قریب کسی ضلع میں منتقل کیا جائے۔ محمود بخاری اپنے ساتھ قبائلی علاقے کی ایڈیشنل پولیس لے کر آ گیا، ایک انسپکٹر، دو سب انسپکٹر، کئی سپاہی جو انسانوں پر صرف گولی چلانا جانتے ہیں اور اس کے سوا انہیں کچھ نہیں آتا، جس سب انسپکٹر سے صادق کا جھگڑا ہوا تھا اس کو بھی بدل دیا اور مجھے اِن قبائلیوں کے حوالے کیا، محمود بخاری نے کچھ کہنا چاہا میں اتنا غصہ میں تھا کہ ماتھے پہ تیوری

ڈال کے نکل گیا، ان آفریدی پولیس والوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا، ایک گن مین آگے آگے ایک پیچھے پیچھے اور انسپکٹر شانہ بشانہ گویا میں کوئی خطرناک جنگی قیدی تھا ان کا خوف اتنا تھا کہ علامہ رشید ترابی جو اپنے بھائی کی عیادت کے لئے آئے اور میرے کرم فرما تھے عقبی دیوار پھلانگ کے نکل گئے مبادا میرا ان کا سامنا ہو اور انہیں علیک سلیک کرنا پڑے اور یہ علیک سلیک ان کے لئے انٹیروگیشن کا باعث ہو۔

انسپکٹر آفریدی میرے کمرے میں چارپائی کے ساتھ کرسی پر ڈٹ کے بیٹھ گیا: یہ اعصاب پر ایک زبردست بوجھ تھا میری طبیعت خراب ہو گئی،

میں نے انسپکٹر سے کہا ــــ ڈاکٹر کو بلاؤ۔

اس نے سر ہلا کے کہا۔ میں اردو نہیں جانتا، میں نے باہر نکل کے دوسرے سب انسپکٹر اور کنسٹیبلوں سے کہا وہ بھی اردو نہ پوئی دا(اردو نہیں جانتا) کہہ کر طرح دے گئے،

میں چھ ستمبر سے عملاً بھوک ہڑتال پر تھا کیونکہ بھوک ہڑتال چھوڑنے کے بعد ہفتہ عشرہ پکی غذا کھانا مشکل ہوتا ہے مجھے بھوک ہڑتال چھوڑے ہوئے کل چھ دن ہوئے تھے آج کل صرف دودھ یا ساگودانہ لے رہا تھا لیکن تیرہ کو یہ بھی چھوڑ دیا، کرنل خواجہ عبدالرشید سمجھاتے آئے لیکن میں نے کہا کرنل صاحب اب حکومت سے نپٹ لینا ہی بہتر ہے یہ بھوک ہڑتال قطعی ہے ــــ ممنون ہوں گا۔ مجھے واپس بھجوا دیں ان وحشیوں کے ساتھ رہنا شرفا کی توہین ہے۔

چنانچہ ۱۴ ستمبر کو گیارہ بجے سہ پہر مجھے سنٹرل جیل لوٹا دیا گیا، عجب نہ تھا کہ مجھے کسی بہانہ وہ گولی مار دیتے، صوبائی حکومت پچھلے تین چار ماہ میں کئی افراد کو سمیٹنے کے لئے اس قسم کے کارنامے انجام دے چکی تھی اور اس کے ہوتے ہوئے

یہ اندیشہ قوی تھا۔

میں نے سنٹرل جیل میں قدم رکھتے ہی خدا کا شکر ادا کیا،

انسپکٹر فریدی سے کہا،

یہ نمازیں جو ساتھ لئے پھرتے ہو اور یہ داڑھی جو سینہ تک بڑھا رکھی ہے

قیامت کے دن کم سے کم تمہارے کام نہیں آئے گی۔

وہ مسکرایا معلوم ہوا کہ اب اُردو سمجھ میں آتی ہے۔

دوسری دفعہ بھوک ہڑتال سے سپرنٹنڈنٹ جیل ذرا کشیدہ ہو گئے۔

کیا کرتے؛ حکومت اپنی جگہ گل کھلا رہی تھی میں اپنی جگہ ضدی تھا، اکیلے میں نے حکومت سے لڑنے اور مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حقیقتہً یہ بھوک ہڑتال ۲۶ اگست سے شروع ہوئی تھی، چھ ستمبر سے ۱۲ ستمبر تک آدھ سیر دودھ اور کسی قدر ساگودانہ پر گزارا کر رہا تھا کیونکہ ذیابیطس میں بھوک ہڑتال کی وجہ سے امراض کی پوٹ ہو گیا تھا۔ اب ۱۳ ستمبر سے باقاعدہ بھوک ہڑتال نے اس دوران کی سب بیماریوں کو جگا دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ میں ایک ایسی ہمت پیدا کر دی تھی کہ میں نے کسی مرحلے میں بھوک ہڑتال کو محسوس نہ کیا۔

راجہ فیض محمد اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ میرے پاس حکومت کا ایک پروانہ لائے کہ حکومت مغربی پاکستان نے میرے لئے تین سو روپے ماہانہ الاؤنس مقرر کیا ہے، میری نظر بندی اور پریس کی ضبطی کے بعد حکومت پر لازم تھا کہ الاؤنس دے، یہ ہر نظر بند کا استحقاق تھا لیکن ساڑھے چار ماہ بعد حکومت کو فیاضی سوجھی۔ اور جس شخص نے یہ فیصلہ کیا وہ عجب مسخرا تھا ایسا شخص نظر بند ہوتا تو میں اس کو چھ سو روپے ماہوار الاؤنس دینے کو تیار تھا، یہ الاؤنس گویا اس توہین کا جزو تھا جو میرے متعلق حکومت کا شعار ہو چکی تھی۔ آج تک کسی نظر بند نے الاؤنس ترک

نہیں کیا میں نے اُس الاؤنس کو ٹھکرا دیا حکومت کو ذیل کا خط لکھا۔

جناب سپرنٹنڈنٹ صاحب، سنٹرل جیل کراچی

جناب مکرم،

ہوم سیکرٹری صاحب کو اطلاع کر دی جائے کہ حکومت مغربی پاکستان نے ازراہ "مراحم خسروانہ" میرے گیارہ بچوں اور اہلیہ کے لئے تین سو روپے ماہانہ کا جو الاؤنس اپنی غیر نمائندہ بادشاہت کے خزانہ عامرہ سے مقرر کیا ہے وہ ہمارے معیار زندگی عزت نفس اور رہن سہن کے قطعاً منافی ہے بلکہ بالارادہ ہماری توہین کی گئی ہے۔ میں اس نمک پاشی کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہوں اور آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ یہ رقم میرے گھر والوں کو بالکل نہ بھیجی جائے۔ بلکہ اس خانہ ساز نبوت کے فنڈ میں دے دی جائے جس کی حمایت میں حکومت مجھے اور میری اولاد کو ختم کرنا چاہتی ہے۔

والسلام

۱۴ ستمبر ۱۹۶۸ء شورش کاشمیری

سپرنٹنڈنٹ نے بہت سے نامور لیڈروں کا حوالہ دیا کہ وہ اس قسم کے الاؤنس وصول کرتے رہے ہیں، فلاں لیڈر انڈوں کو تول لیا کرتا تھا فلاں لیڈر یہ تھا اور فلاں لیڈر وہ تھا لیکن میرے لئے ترغیب و تحریص عبث تھی، میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ مقصود حکومت سے الاؤنس لینا نہیں اس کی ذہنی اکھاڑ پچھاڑ ہے، میں ہائی کورٹ کی منظور کردہ رقم نہیں لے رہا یہ تو حکومت کی بخشش ہے، حکومت سے لڑنے والے حکومت سے وظیفہ نہیں لیا کرتے۔

۱۵ ستمبر کو میں نے سپریم کورٹ میں ہوم سیکرٹری کی معرفت درخواست گذاری

حکومت کی سنگدلی، بھوک ہڑتال کی کہانی اور مقامی پولیس کی طوطا چشمی کا ذکر کیا، اور التدعا کی کہ سپریم کورٹ میرے مقدمہ کا جلد سے جلد فیصلہ کرے اس کے فیصلہ ہی سے حکومت کا استبداد ختم ہو سکتا ہے۔

میں نے اس باضابطہ درخواست کے علاوہ ایک بے ضابطہ خط گورنر کو لکھا کہ وہ بااختیار ضرور ہیں لیکن جو کچھ ان کی حکومت کر رہی ہے وہ نامناسب بھی ہے اور نازیبا بھی۔ ؏

ٹوٹ تو سکتا ہوں لیکن میں لچک سکتا نہیں

میں نے اس خط میں اُن تمام غلطیوں سے انہیں آگاہ کیا جو اب تک حکومت کی بے تدبیری کا نتیجہ تھیں چونکہ میرے خطوط ذرا گستاخانہ لہجہ" میں ہوتے یعنی اُن میں بزدل الفاظ استعمال نہیں کئے جاتے تھے اور نہ کوئی منت کی جاتی تھی اس لئے حضور فیض گنجور، عزت مآب، فیض مستطاب قسم کے الفاظ سننے والوں کی طبیعت لازماً اِن خطوط سے مشتعل ہوتی اور وہ شاید انہیں کسی جواب کے قابل نہ سمجھتے تھے لیکن ان کی بے چینی کا جو حال تھا مجھ سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ مجھے مروا سکتے تھے اور یہ ان کے لئے مشکل نہ تھا لیکن اتنا سہل بھی نہ تھا ملک کے حالات اس پھرتی سے بدل رہے تھے کہ ایسا سوچنا ہی مشکل ہو گیا تھا، میرے بچوں نے حکومت کو اِس طرح دِق کیا کہ ایک شورش کے بجائے اُسے گیارہ شورش ستا رہے تھے۔

ابکے بھوک ہڑتال ایک کھلم کھلا یدھ تھا جیل کے افسروں کا خیال تھا کہ بیماری کی شدت مجھے خود رام کر لے گی لیکن انہیں اندازہ نہ تھا کہ ایک شخص جب موت سے بے نیاز ہو جائے تو حکمرانوں سے خود بخود بے نیاز ہو جاتا ہے، پہلی دفعہ ناک کے راستہ نلکیوں سے دودھ دیا تھا اب وہ بھی مشکل ہو گیا تھا، میں نے زبردست مزاحمت کی، ڈاکٹر اور اُن کا عملہ دن کا ایک حصہ میرے پاس گزارتے لیکن آخر

تھک گئے، میری بے ضابطہ خط وکتابت دھڑا دھڑ شروع ہو گئی افسروں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ نامہ و پیام کیونکہ ہوتا ہے، لاہور سے ہر روز فون آتے جواب چلا جاتا، جیل والوں نے میری طرف قیدیوں کی آمدورفت بند کر دی، ساتھ کی بیرکوں میں جتنے قیدی تھے انہیں اندرونی حصہ میں بھجوا دیا۔ معتمد وارڈر لگا دیئے، پہلے قیدی نمبرداروں کو ہٹا کر اردو ناآشنا بلوچ لگائے لیکن میرا قاصد باقاعدہ جاتا اور باقاعدہ جواب لاتا تھا۔

نویں دن یعنی ۲۱ ستمبر کو میری حالت اتنی خراب ہو گئی جیسے کوئی عمارت گر رہی ہو، دن میں کئی دفعہ بیہوشی طاری ہوتی، میں نے مولانا تاج محمود، ملک اسلم حیات اور خواجہ صادق کاشمیری کو نار دیئے کہ حالت اگرچہ خراب ہے، لیکن بھوک ہڑتال اسی وقت ختم ہو گی جب حکومت اعلان کر دے گی کہ وہ مجھے گھر کے نزدیک کسی جیل میں رکھنے پر تیار ہے۔

اس خبر نے صوبے کے مختلف شہروں میں آگ لگا دی، ۲۲ ستمبر کو لائل پور میں آل پارٹیز میٹنگ بلائی گئی، ۲۳ ستمبر کو دھوبی گھاٹ کے میدان میں جلسہ عام ہوا، جس میں حکومت کو للکارا گیا، لاہور میں بھی یہی جوش و خروش تھا، ان شہروں کے علاوہ سرگودھا، چنیوٹ، جھنگ، راولپنڈی، گوجرانوالہ میں جلسے کئے گئے، سارا پنجاب بلکہ سندھ اور سرحد کے بعض مقامات میں بھی احتجاج ہونے لگا۔

یہی وہ دن تھے جب حکومت کو اتنی پریشانی ہوئی کہ مغربی پاکستان کے انسپکٹر جنرل پولیس بھی لیڈر بن گئے، وہ جگہ بہ جگہ تقریریں کرنے لگے کہ حکومت فرقہ وارانہ مسئلہ برداشت نہیں کرے گی، اگر اس قسم کی تقریریں کی گئیں تو سختی سے نپٹا جائے گا۔ گویا ان کے نزدیک مسئلہ ختم نبوت اور میری رہائی کا مسئلہ فرقہ وارانہ تھا لیکن یہ اعلان و بیان ظاہر کرتے تھے کہ حکومت اندر سے ہلی ہوئی ہے۔

بارہویں یا تیرہویں روز میری حالت مخدوش ہوگئی، میرے بچے گورنر ہاؤس پہنچ گئے وہاں مظاہرہ کیا لیکن ہوم سیکرٹری نے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ مظاہرہ ایک دفعہ پہلے بھی ہو چکا تھا لیکن بعض پولیس افسروں نے تب بھی دانشمندی سے کام لے کر انہیں گھر پہنچا دیا تھا ۲۵ ستمبر کو مولانا محمد علی جالندھری، مفتی زین العابدین، مولانا تاج محمود، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا محمد شریف جالندھری ہوم سیکرٹری سے ملے اور قضیہ نپٹانے پر زور دیا۔ ملک اسلم حیات وکلاء کا ایک وفد لے کر گئے، مسٹر مصطفیٰ صادق ایڈیٹر وفاق نے بعض جرنلسٹوں کے ساتھ ہوم سیکرٹری سے ملاقات کی۔

اخبارات پر قدغن لگی ہوئی تھی لیکن لائل پور سے روزنامہ ملت، بھوک ہڑتال کی خبریں دے رہا تھا، وزیر اطلاعات سخت پریشان تھا، ملت کے ایڈیٹر مسٹر حمید اصغر نجید چٹان میں شریک ادارہ رہ چکے تھے اور اس وقت، نہایت اخلاص و جرأت سے ڈٹے ہوئے تھے۔ اسی دن حالت اتنی خراب ہوگئی کہ چھ بجے شام مجھے کوما ہوگیا، اتفاق سے اس دن جیل کا میڈیکل آفیسر چھٹی پر تھا اس کی غیر حاضری میں ایک بنگالی اے ایم او ڈیوٹی پر تھا لیکن وہ کوما پر قابو پانے سے قاصر رہا، میری حالت اور خراب ہوتی گئی۔ وہ بلوچ نمبردار قیدی جو مجھ پر متعین تھے ڈاکٹر کی بے بسی دیکھ کر کوئی دس بجے ڈیوڑھی گئے، دربان کو اطلاع کی پندرہ منٹ کے اندر اندر سپرنٹنڈنٹ آگیا، اس نے ڈاکٹر کو ڈانٹ ڈپٹ کی کہ اپنی حماقت میں وقت ضائع کیا ہے مجھے کیوں خبر نہیں کی؟ سپرنٹنڈنٹ نے فوراً سول ہسپتال فون کیا وہاں سے ڈاکٹر چودھری نذیر احمد (اسسٹنٹ پروفیسر، میڈیکل کالج) آگئے انہوں نے کئی انجکشن کئے ہوش میں آیا دیکھا تو عجب نظارہ تھا، ایک طرف سپرنٹنڈنٹ بیٹھے تھے دوسری طرف ڈاکٹر صاحب، اِدھر اُدھر عملہ کھڑا تھا وہ بلوچ نمبردار اور

باورچی قیدی جو نژاد کشمیر سے تھا اشکبار تھے، ایک نمبردار تو قرآن پڑھ پڑھ کے پھونک رہا تھا میں نے غنودگی ہی میں سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔

چودھری صاحب میری آخری وصیت لکھ لیں وہ سخت پریشان تھے ہر شخص کے اندر کا انسان جاگ اٹھا تھا آخر دو گھنٹہ کی کشمکش کے بعد بیہوشی جاتی رہی، میں نے اس وقت ہسپتال منتقل ہونے سے انکار کر دیا۔

صبح سویرے سپرنٹنڈنٹ آگئے اور کہا۔

"سول ہسپتال میں سرجن رحیم سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا، وہاں چلے جاؤ کرنل نجیب اللہ اور پروفیسر افتخار احمد نگران ہوں گے ہمیں آسانی ہوگی۔"

میرے سامنے اب سول یا جناح ہسپتال کا سوال نہیں تھا، بھوک ہڑتال نے مجھے چت کر دیا تھا میرا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے صوبہ میں واپس بھیجو، میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا،

"میرا مسئلہ اب سول یا جناح ہسپتال کا نہیں میں نے موت سے بازی بدی ہے اب موت جیتے گی یا میں جیتوں گا۔"

کوئی دس گیارہ بجے پولیس گارد آگئی، میں تیار ہو کر ڈیوڑھی میں گیا تو وہی فریدی انسپکٹر اور اس کے کنسٹیبل کھڑے تھے انہیں دیکھتے ہی میرا خون کھول گیا، میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔

"پھر وہی ناٹک؟ پھر وہی تماشا؟ یہ کیوں آیا ہے؟ اس شخص کی شکل دیکھ کر میری بیماری بڑھ گئی ہے، محمود بخاری نے اسے بھیج کر پھر شرارت کی ہے وہ مجھے اس کے ہاتھ سے مروانا چاہتا ہے۔"

میں غصہ میں گرتا پڑتا احاطہ میں واپس آگیا۔ اور ہسپتال جانے سے انکار کر دیا،

بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ مجھے جیتے جی یہاں سے کوئی نہیں لے جا سکتا ہے، سپرنٹنڈنٹ نے حکام بالا کو مطلع کیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ کے اندر اندر نئی گارد آگئی، فریدی (انسپکٹر) بغلیں بجاتا لوٹ گیا۔

نئی گارد میں ایک سب انسپکٹر چارسدہ کا پٹھان تھا، دوسرا دہلی پارہ کا ایرا غیرا نتھو خیرا، اس دوسرے کے متعلق معلوم ہوا کہ مسٹر محمود بخاری کا بھتیجا ہے میں نے بلا کر اسے کہا۔

"میاں! ایک تو آپ باہر بیٹھے رہیئے، اندر نہ آیئے گا، دوسرے مسٹر محمود بخاری کو پیغام بھیج دیں کہ وہ یہاں تشریف لانے کی کوشش نہ کریں آپ کے انچارج ہیں ہمارے نہیں"۔

گورنر ان دنوں روس کے دورے پر تھا وہاں سے طہران جانا تھا، اس کے بغیر کسی میں حوصلہ نہ تھا کہ صدر سے بات کرے، اپنے طور پر ہمیں اطلاع ملی تھی کہ مسٹر ایس آئی حق ایکٹنگ گورنر (اصلاً چیف سیکرٹری) نے میرے متعلق صدر ایوب سے بات کرنی چاہی تو صدر نے جھاڑ دیا کہ یہ میری دردسری نہیں، گورنر موسیٰ کا کام ہے ——— وہ میرا نام سننے کو تیار نہ تھے، گورنر موسیٰ کی مشکل یہ تھی کہ وہ ان معاملات میں صدر ایوب کے بغیر سانس نہیں لیتے تھے اصل حکم صدر ہی کا ہوتا تھا، ادھر دوستوں کی طرف سے برابر خطوط آرہے تھے کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دو، میرا واحد جواب تھا کہ جو چیز آپ کے مشورہ سے شروع نہیں کی وہ آپ کے مشورہ سے چھوڑنا ممکن نہیں۔

پندرھویں روز ۲۰ ستمبر کو مفتی زین العابدین، مولانا تاج محمود کے ہمراہ کراچی پہنچ گئے اور وہاں سے سیدھا سول ہسپتال پہنچے۔ میں اسی وی آئی پی روم نمبر ۲ میں تھا جس کے متعلق گورنر نے محکمہ سے جواب طلبی کی تھی کہ مجھے یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟

میری اس وقت جو حالت تھی اس کا تذکرہ مولانا تاج محمود نے "پھر دس روز کراچی میں" کے زیر عنوان ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۸ء کے لولاک میں کیا ہے۔

دائیں ہاتھ میں رعشہ، آواز میں لرزہ، بائیں ٹانگ اکڑی ہوئی، بینائی کمزور، میری چیخیں نکل گئیں، مفتی زین العابدین آبدیدہ ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے،

لولاک ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۸ء

صفحہ ۵ کالم ۳

مفتی زین العابدین اور مولانا تاج محمود نے جو کچھ فرمایا وہ سب اس سفرنامہ میں درج ہے، مختصراً ان دونو بزرگوں کو ہوم سیکرٹری نے اس غرض سے بہ اصرار بھجوایا تھا کہ بھوک ہڑتال سے باز رکھیں لیکن اب پانی سر سے گذر چکا تھا، دونو میرے معاملہ میں انتہائی مخلص اور سگوں سے زیادہ عزیز تھے انہیں میری جان عزیز تھی ہوم سیکرٹری مولانا تاج محمود سے بار بار یہی کہتے کہ وہ کراچی جائیں اور مجھے راضی کریں، ان سے پہلے ۲۲ ستمبر کو خواجہ صادق کاشمیری میرے پاس خواجہ محمد صفدر (اپوزیشن لیڈر صوبائی اسمبلی) کا نامہ گرامی لائے تھے وہ خط یہ تھا۔

محترمی آغا صاحب،

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کی بھوک ہڑتال آپ کے ہر بہی خواہ کے لئے حد درجہ پریشانی کا باعث ہے، محترم نواب زادہ نصر اللہ خاں اور دوسرے دوستوں نے تار کے ذریعہ آپ سے بھوک ہڑتال ختم کرنے کی اپیل کی ہے، ان میں مَیں بھی شریک تھا میں دوبارہ عرض کروں گا آپ ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشیں۔

میں ذمہ دار حکام سے ملا ہوں آپ کے دونو مطالبات انشاء اللہ جلد

قبول ہو جائیں گے۔ مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد قوی اُمید ہے کہ آپ پنجاب کی کسی جیل میں منتقل کر دیئے جائیں گے اور آپ کے ملاقاتیوں کی فہرست بھی قبول کر لی جائے گی۔

برادرم خواجہ صاحب سے میں نے تفصیلی بات کی ہے وہ آپ سے زبانی عرض کریں گے۔

خیر اندیش

محمد صفدر

خواجہ صاحب کے اخلاص میں کوئی شبہ نہ تھا وہ ہوم سیکرٹری سے ملے اور انہی کی طرف سے یقین دہانی کرا رہے تھے لیکن مجھے حکومت کا بہت تلخ تجربہ ہو چکا تھا مجھے معلوم تھا کہ مسٹر مسعود نبی نور ہوم سیکرٹری شریف انسان ہیں اور مجھ سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن حکومت کی کہہ مکرنیوں سے وہ بھی ناخوش تھے اور میں تیسری دفعہ کے بعد چوتھی دفعہ بھوک ہڑتال کا تجربہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

خواجہ صاحب اور حزب اختلاف کے دوسرے لیڈر میری جان بچانا چاہتے تھے اور یہ ان کی جائز خواہش تھی لیکن میں حکومت کی ناجائز کارروائیوں سے اتنا تنگ آ چکا تھا کہ میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا۔

میں نے خواجہ صادق کاشمیری کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ جب تک حکومت فیصلہ نہیں کر دیتی اور مجھے تحریری یقین نہیں دلایا جاتا میرے لئے بھوک ہڑتال چھوڑنا ممکن نہیں وہ سارا دن اسی کشمکش میں رہے، سی آئی ڈی کا انسپکٹر موجود تھا، سپرنٹنڈنٹ جیل نے ہوم سیکرٹری سے رابطہ قائم رکھا، اور انہیں کہتے رہے کہ شورش قطعی وعدہ چاہتا ہے، ہوم سیکرٹری بلا وعدہ یقین دلاتے رہے، لیکن گورنر کی عدم موجودگی میں حتمی وعدہ کرنے سے قاصر تھے نتیجۃً خواجہ صادق کاشمیری انکار لے کر واپس چلے

گئے۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ وہ آئندہ اس قسم کی کسی کوشش میں حصہ نہ لیں۔ میں بھوک ہڑتال ترک نہیں کروں گا۔

۲۷ کو مولانا تاج محمود پہنچے، ۲۸ کو میری اہلیہ اور بیٹی صوفیہ بھی آگئیں وہ میری حالت دیکھ کر رونے لگیں، میں نے ڈانٹ دیا، رونا دھوتا ہے تو واپس چلے جاؤ غیرہ وہ اپنے جذبات کیونکر روک سکتی تھیں۔

ہسپتال منتقل ہونے سے پہلے ڈپٹی کمشنر سید خالد محمود یہی کہنے آئے تھے کہ بھوک ہڑتال میں کوئی فائدہ نہیں بیمار ہو صحت برباد ہو جائے گی۔

میں نے انہیں بھی یہی جواب دیا کہ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک ظلم ہے بھوک ہڑتال اب اس لئے ہے کہ میں ان لوگوں میں نہیں رہنا چاہتا جو ظلم کرتے اور ظلم سہتے ہیں، خالد محمود شریف نوجوان تھے، کم گو اپنی بات کہہ کر اور میری بات سن کر چلے گئے ——— جوں جوں حالت بگڑتی گئی توں توں افسروں کی آمد و رفت بڑھتی گئی، ایک روز میرے گیارہ بچوں کی تصویر سامنے رکھ دی، ان پر ترس کھاؤ لیکن میرے لئے حتمی وعدہ لئے بغیر بھوک ہڑتال چھوڑنا مشکل تھا۔

کراچی ریجن میں جیل خانوں کے ڈائریکٹر مسٹر کیڈرد اینگلو پاکستانی تھے، وہ نیک نفس، سچے عیسائی اور غایت درجہ بھلے انسان تھے، سپرنٹنڈنٹ کے ہمراہ تشریف لائے اُن کا لہجہ کیا تھا ایک ایک حرف میں شرافت گھلی ہوئی تھی، پادریوں کی طرح ہاتھ اُٹھا کر فرمایا۔

"او! بہادر انسان، خدا تمہارے ساتھ ہو، جان خدا کی دی ہوئی ہے انسان کی نہیں، خدارا ضائع نہ کرو۔"

گھنٹہ بھر کھڑے رہے اور یہی چاہتے تھے کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دوں، لیکن میں انتہائی ضعف کے باوجود مسکراتا رہا اور ٹالتا رہا۔

کیڈر و مشنری اسپرٹ کے آدمی تھے اُن کا سراپا شرافت میں ڈھلا ہوا تھا میں نے ان سے شام تک کوئی فیصلہ کرنے کا وعدہ کیا وہ چلے گئے۔ لیکن پانچ بجے شام وارڈر کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ آپ کی محبت کا شکریہ، میرے لئے حکومت سے پکا وعدہ لئے بغیر بھوک ہڑتال چھوڑنا مشکل ہے، وہ اس کے باوجود چھ یا ساڑھے چھ بجے دوبارہ تشریف لائے لیکن میں اُس وقت سو رہا تھا یا مجھ پر غشہ طاری تھا۔

اخبارات ایوب شاہی کے خوف سے بدستور چُپ تھے لیکن پنجاب میں ہنگامہ برپا تھا، سرکاری گماشتوں کے سوا ملک کے ہر لیڈر نے میرے حق میں بیان دیا تھا اور کسی طرح بھی یہ سیلاب رُک نہیں رہا تھا۔ حکومتیں اپنی غلطیوں پر غور کرنے کی توفیق نہیں رکھتیں اگر حکومت نے مسٹر مسعود نبی نور ہوم سیکرٹری کے اس نوٹ کا دوبارہ مطالعہ کیا ہوتا جس میں انہوں نے میری گرفتاری کی مخالفت کی اور صاف صاف لکھا تھا کہ حکومت کے لئے عوام میں مشکلات پیدا ہوں گی تو وہ توبہ تلا کرتی اور اس اکڑ میں نہ رہتی جو اس کے سفینہ کو غرقاب کر رہی تھی۔

حکومت کے ساتھ کسی کی ہمدردی نہیں تھی ایک آدھ کے سوا میری نگران گارد کے تمام افراد بھی اس کے مخالف ہو گئے تھے، فی الجملہ ان کے دلوں میں حکومت کا کوئی احترام نہ تھا۔

مولانا تاج محمود نے مقامی علماء سے رابطہ پیدا کیا اور ان پر زور دیا کہ وہ جمعہ کے خطبات میں حکومت کو توجہ دلائیں لیکن وہ تخلیہ میں دُعا پر زور دیتے منبر پر کچھ کہنے کو تیار نہ تھے، بعض "انقلابی مُلا" شرعی نماز دے کے بیٹھے تھے۔ مولانا تاج محمود نے بعض پرانے رفقا کو تلاش کیا، مولوی منظور احمد عباسی اور حافظ عبدالرحمان نے کراچی میں ہلچل شروع کی اور اس طرح وہ سناٹا ٹوٹنے لگا جو اب تک کراچی پر مسلط تھا لیکن اس سناٹے میں جس شخص نے سب سے پہلے حکومت کو

آڑے ہاتھوں لیا وہ آرام باغ کی مسجد کے خطیب مولانا محمد انور تھے۔ وہ کوئی معروف سیاسی عالم نہ تھے انہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ وہ کبھی مجھے ملے تھے، انہوں نے للہی اخلاص سے آواز اٹھائی، اور دو تین خطبے اسی میں صرف کیے، انہی دنوں مولانا غلام اللہ راولپنڈی سے کراچی آئے مولانا تاج محمود نے سب انسپکٹر کو راضی کر لیا چنانچہ مولانا غلام اللہ مجھے ملنے آئے، میں اس وقت بیہوش سا تھا اور حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی، مولانا کی چیخیں نکل گئیں۔ میرے ہاتھ کو جو اس وقت رعشے سے لاچار تھا سینہ سے لگایا ماتھے کو بوسہ دیا اور چھ سو روپیہ میرے سرہانے رکھ کر اُلٹے پاؤں واپس چلے گئے اس رات انہوں نے جلسہ عام میں زبردست تقریر کی یہاں تک کہہ دیا کہ شورش مر گیا تو اس کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔ ایسی سخت باتیں کیں کہ حکومت کے کان ہو گئے، اگلے روز انہیں کراچی بدر کر دیا گیا۔ لیکن وہ مسئلہ جو کراچی میں نہیں تھا پیدا کر گئے، اسی کا نتیجہ تھا کہ لوگ ہسپتال آنے لگے لیکن میں کمرے میں پڑا تھا وہ گارڈ کو دیکھ کر چلے جاتے، نرسیں اور ڈاکٹر سب میرے ساتھ تھے ایک دن سر جن رحیم آ گئے بہت دیر تک بیٹھے زور دیتے رہے کہ ضد چھوڑ دو میں نے ان سے کہا یہ ضد نہیں ظلم کے خلاف احتجاج ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کا دل بھی کچھ پسیجا ہوا ہے۔ انور عارف کو یقین ہو گیا کہ اپنا مطالبہ تسلیم کرائے بغیر میں بھوک ہڑتال نہیں چھوڑوں گا۔ میرے علم و مشورہ کے بغیر اس نے اہل قلم سے رجوع کیا وہ مختلف ادیبوں، شاعروں اور ایڈیٹروں کی فہرست بنا کر ان کے ہاں مارا مارا پھرا، ایک "ترقی پسند اُستاد و نقاد" اور ایک بہت بڑے اقبالی کے سوا ہر شخص نے صدر کے نام اس اپیل پر دستخط کر دیئے کہ شورش کاشمیری کی جان بچائی جائے۔

انور عارف نے مجھے دستخط شدہ اپیل دکھائی تو میں نے روک لی ان سے کہا کہ غبی آمریت سے اہل قلم کا اپیل کرنا ان کے علم کی توہین ہے، بس یہی کافی ہے

کہ انہوں نے دستخط کر دیئے ہیں، انور عارف نے دستخط کنندگان کے جذبے کو سراہتے ہوئے بعض دوستوں کے متعلق بتایا کہ

پیر علی محمد راشدی نے کہا ہے کہ حکومت سے کوئی درخواست کرنا شورش کی توہین ہے لیکن دستخط کر دیئے۔

جمیل الدین عالی نے پہلے دستخط کیے پھر کہا — ملک میں ایسے کتنے لوگ ہیں، ہمارے تو وہ خلاف ہی رہے ہیں لیکن ان کا دم غنیمت ہے۔

فیض احمد فیض نے کہا — ہمارے ساتھ تو ان کی کٹا چھنی رہی ہے لیکن بہر حال — اور دستخط کر دیئے۔

مسٹر ممتاز حسن (سابق سیکرٹری فنانس) کے علم و فکر پر چٹان نے اکثر تنقید کی ہے، انور عارف ان کے ہاں بھی دستخط لینے چلے گئے، انہوں نے فوراً دستخط کر دیئے اور کہا — "شورش سے کہو کن ظالموں سے ٹکر لی ہے، میں انہیں جانتا ہوں سنگدل لوگ ہیں اپنے بچوں کے لئے جیو۔"

۲۸ ستمبر کو میری حالت دگرگوں ہوگئی، کرنل نجیب اللہ آئے انہوں نے معائنہ کرنے کے بعد مجھ سے کہا،

"پہلے تمہاری صحت خطرہ میں تھی اب تمہاری جان خطرہ میں ہے،
بھوک ہڑتال چھوڑ دو۔"

میں ان کا بے حد احترام کرتا تھا عرض کیا۔ جان ہی کی بازی لگائی ہے۔ انہوں نے جا کر رپورٹ لکھی کہ نظر بند بھوک ہڑتال کی وجہ سے خطرے میں داخل ہوگیا ہے، شام کو پروفیسر افتخار احمد آئے انہوں نے یہی رپورٹ لکھی، حکومت نے ایک بورڈ مقرر کیا اس نے بھی تصدیق کی۔ اس کے باوجود حکومت ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی اُس کو احساس نہیں رہا تھا کہ — ع

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں

مسٹر ایس اے حق قائم مقام گورنر صدر ایوب سے دو دفعہ متمردانہ جواب لے چکے تھے انہیں ڈانٹا گیا، صدر ایوب نے کہا مرنے دو۔ ایس اے حق اس کے نتائج کو سمجھتے تھے لیکن طاقت کے کان بہرے ہو گئے تھے، انہوں نے اس دوران میں گورنر سے طہران میں رابطہ پیدا کرنا چاہا لیکن دو دفعہ ناکام رہے۔

مولانا تاج محمود کو میری جان عزیز تھی وہ بھوک ہڑتال چھڑانے پر مصر تھے حکومت سے انہیں مایوسی ہو چکی تھی وہ دوڑے دوڑے مولانا احتشام الحق کے پاس گئے اور ان سے ایک خط لیا اس خط میں مولانا نے محبت بھرے لہجہ میں خواہش کی تھی کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دوں، ان کے خیال میں اسلام کو ابھی میری ضرورت تھی میں اس وقت فی الواقعہ موت سے لڑ رہا تھا۔ مولانا احتشام الحق کا خط میری بیوی اور میری بیٹی صوفیہ کی موجودگی میں مولانا تاج محمود نے پڑھ کے سنایا، وہ خط بلاشبہ درد سے لبریز تھا، میری اہلیہ اور بیٹی نے ہاتھ جوڑ دیئے کہ ظالموں سے ہم نپٹ لیں گے تم بھوک ہڑتال چھوڑ دو، میں نے کورا جواب دیا، اُن سے کہا کہ وہ لاہور چلے جائیں۔ میں اب جینا نہیں چاہتا، میرا خون رائیگاں نہیں جائے گا حکومت کو ہر قطرہ خون کا حساب دینا ہوگا۔

مفتی زین العابدین نے یکایک، میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا،

"بھائی شورش میں تمہارا ساتھی اور عالم دین ہوں، میں نے تمہارا ہاتھ اس طرح پکڑا ہے جس طرح خالد بن ولید نے عکرمہ کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی — اور ان سے کہا تھا کہ میں اسلام کے سپاہی کو ضائع نہیں ہونے دوں گا۔

میری بات مان لو اور اس طرح جان نہ دو۔"

میں نے اپنے رعشہ دار ہاتھ کو مفتی صاحب کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور عرض کی،
"حضرت آپ کو تاریخ اسلام میں خالدبن ولید اور عکرمہ ہی کا واقعہ یاد رہا، امام حسینؓ اور عبد اللہ بن عمر کا واقعہ بھی تو ہے عبد اللہ بن عمر نے بھی امام حسینؓ کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی تھی لیکن امام حسینؓ نے رکنے سے انکار کر دیا تھا، وہی اسوۂ میرے سامنے ہے اور میرے نزدیک احسن و افضل ہے۔"

مفتی صاحب کو افریقہ جانا تھا اور چلے گئے مولانا تاج محمود اکیلے رہ گئے۔

۳ اکتوبر کو صحت کا پورا کارخانہ چوپٹ ہو گیا ایک طویل کوما سے میری بیوی گھبرا گئی اس نے یہ حالت دیکھتے ہی چیخنا چلانا شروع کر دیا وہ پیئنگ وارڈ سے نیچے صحن میں چلی گئی وہاں لوگوں کا ایک ہجوم ہو گیا اس نے صدر ایوب اور گورنر موسیٰ کا سیاپا شروع کیا، میری بیٹی صوفیہ کمرے ہی میں غش کھا کے گر پڑی، ہنگامہ ہو گیا۔ قاسم بھٹی اپنی گارد کے ساتھ نیچے ٹہل رہا تھا اس نے دیکھا تو جذباتی ہو گیا حکومت کو چلا چلا کے بُرا بھلا کہا، اس کی گارد گھبرا گئی اور اس کو فوراً اس کے کمرے میں لے گئی، تاروں کا ایک سلسلہ بندھا ہوا تھا، پنجاب میں خصوصیت سے جلسے، جلوس اور ہڑتالیں جاری تھیں میرے بچوں نے لاہور میں حکومت کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔

ہمارے ایک پرانے دوست حافظ عزیز الرحمٰن مولانا تاج محمود کو لے کر قاضی فضل اللہ وزیر داخلہ سے ملنے گئے اُن دنوں وہ کراچی ہی میں تھے، قاضی صاحب نے ان سے کہا "ایوب ہو یا موسیٰ دونو بے رحم ہیں، شورش سے کہو بھوک ہڑتال ختم کر کے اپنی جان بچائیے ورنہ مطالبات مان لینے کی کوئی سی صورت نہیں ہے، صدر ایوب آج ہی ڈھاکہ سے کراچی پہنچے ہیں، چیف سیکرٹری نے ایئر پورٹ پر علیحدگی میں شورش کے متعلق ان سے ذکر کیا تھا نتیجہ مثبت ہوتا تو ہم سے ضرور بیان کرتے لیکن ایوب خان

تیوری چڑھا کر چلے گئے"۔

اسی دن لاہور سے فون آیا کہ مس قاری بار ایٹ لاء نے اپنی منہ بولی بیٹیوں کی شادی کے لئے ہمارے مکان کا صحن لیا تھا، مہمانوں میں احمد سعید کرمانی بھی اپنے حواری موالی کے ساتھ شامل تھا، جانے کس نے میرے بچوں سے کہہ دیا کہ کرمانی میرے خلاف محفل لگا کے بیٹھا ہے، بچوں نے کان لگا کے سنا، کہہ رہا تھا شورش تو اب مرہی کے نکلے گا اس پہ بچوں کو تاؤ آگیا، انہوں نے اس بری طرح لتاڑا جیسے اس پہ کوئی بجلی گری ہو، کرمانی نوک دم بھاگ گیا بچوں نے تالیاں پیٹیں، اور وہ تمام نعرے لگائے جو اس کے حسب حال تھے، میری اہلیہ اس وقت کراچی میں تھیں اس نے مس قاری سے گلا کیا کہ جو شخص ہماری جان کا دشمن ہے ہمارے ہاں آیا کیوں ؟ مس قاری نے افسوس کیا کہ انہیں اس چیز کا اندازہ نہ تھا۔

ایک سہ پہر میری بیوی مجھے کہنے لگیں اس وقت کوئی نہیں میں انار کا جوس نکالتی ہوں ایک گلاس پی لو ـــــ حلق خشک ہو گیا ہے کھل جائے گا میں نے اس سے کہا جو اپنے نفس کو دھوکا دے سکتا ہے وہ سب کو دھوکا دے سکتا ہے میں یہ خیانت کرنے کے لئے تیار نہیں خدا دیکھ رہا ہے ـــــ اس نے کہا بے چینی ٹل جائے گی، میں نے کہا تم موت سے ڈرتی ہو تمہارے پاس کیا دلیل ہے کہ یہ گلاس پینے کے بعد نہیں مروں گا اور پیئے بغیر مر جاؤں گا، وہ مطمئن ہو گئی۔

جو شخص میری موت کا انتظار کر رہا تھا وہ صرف کرمانی تھا، یا پھر الطاف گوہر، اور اس کا انہیں حق پہنچتا تھا، الطاف گوہر کا حق اعزازی تھا کرمانی کا طبعی، سوال یہ تھا کہ کرمانی واقعی بے داغ ہے یا اس نے میرے خلاف حکومت کے اقدام کی مخاصمانہ تحریک کی ہے، حکومت کو بہت سی چٹھیاں لکھیں لیکن کرمانی کے ذکر سے قلم آلودہ نہ کیا محض لطف لینے کے لئے کوئی شرارت ضرور ہو جاتی مثلاً جن دنوں شائستہ سہروردی کی

بیٹی شہزادی ثروت کی شادی شرق اُردن کے ولی عہد سے ہو رہی تھی اُن دنوں کراچی بڑی رونق پر تھا، کئی وزیر اور افسر دعوت نامہ تلاش کرنے کی فکر میں تھے کرمانی بھی کچھ دن پہلے آکر ٹک گیا۔ تقریب کے آغاز تک بیٹھا رہا لیکن کسی نے گھاس نہ ڈالا، آخر مایوس ہو کر لاہور چلا گیا۔ ہوا کیا؟ اصل حقیقت تو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں البتہ کچھ لوگوں نے ہفتہ پہلے شائستہ اکرام اللہ سہروردی کو جیل سے ایک خط لکھا کہ ایک بڑے باپ اور ایک بڑی ماں کی بیٹی کو اس کی تقریب عروسی پر ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں لیکن ہماری خواہش ہے کہ ـــــ شادی کے مدعوین میں مغربی پاکستان کے وزیر خزانہ احمد سعید کرمانی کو نہ بلوایا جائے، وہ اس شادی کے مدعوین سے کمتر درجہ کا آدمی ہے، اور ہم اس کے واقف حال دُعاگو ہیں، جانے یہ خط شائستہ سہروردی کو ملا یا نہیں؟ لیکن ہمیں خوشی ہوئی کہ احمد سعید کرمانی حسرت لے کر واپس ہو گیا، کرمانی ایسے ہی ادنیٰ مذاق کا مستحق تھا۔

۲۹ اکتوبر کو حکومت کی خواہش پر پروفیسر مشتاق حسن، پروفیسر افتخار احمد اور پروفیسر لطیف منہاس پر مشتمل ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے معائنہ کیا اور حکومت کو لکھ دیا کہ مرض ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے کسی وقت کوئی سانحہ ہو سکتا ہے، فوراً تدارک نہ کیا تو نظر بند کی زندگی بچانا مشکل ہوگا۔

چیف سیکرٹری نے یہ رپورٹ گورنر موسیٰ کو طہران میں فون پر سنائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ صوبہ کے حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں، خدا جانے اور کیا گفتگو ہوئی، بہر حال گورنر موسیٰ نے طہران سے فون پر چیف سیکرٹری سے کہہ دیا کہ دونو مطالبات تسلیم کر لو۔ قاضی فضل اللہ ایک دن پہلے حافظ عزیز الرحمٰن سے کہہ چکے تھے شورش سے کہو اپنی جان بچائے، موسیٰ اور ایوب بے رحم ہیں مطالبات نہیں مانے جائیں گے، انہی قاضی فضل اللہ نے حافظ صاحب کو دوسرے روز بلا کر مطلع

کیا کہ گورنر نے مطالبات تسلیم کر لئے ہیں، انہوں نے قائم مقام کمشنر سید خالد محمود کو ہدایت کی کہ ابھی ہسپتال جا کر نظر بند سے کہہ دو کہ

۱۔ تبادلہ پنجاب میں کر دیا جائے گا۔

۲۔ ملاقاتیوں کی فہرست من وعن تسلیم کر لی گئی ہے۔

بھوک ہڑتال کے شروع میں ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھ سے پوچھا تھا کہ ابھی تبادلہ چاہتے ہو یا ہائی کورٹ میں سماعت کے بعد، میں نے انہیں جواب دیا تھا ہائی کورٹ نے مجھے یہاں بھیجا ہے جب تک ہائی کورٹ رکھنا چاہے یہاں رہوں گا، لیکن مقدمہ ختم ہو جائے تو ایک دن بھی یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ اگر میں کہتا کہ ابھی بھیج دو تو حکومت ممکن ہے ہائی کورٹ سے کہتی کہ نظر بند اس کے احکام بھی تسلیم نہیں کرتا اور توہین کا مرتکب ہوا ہے۔

سید خالد محمود (قائمقام کمشنر) چودھری نذیر اختر سپرنٹنڈنٹ جیل کے ہمراہ مغرب وعشا کے درمیان ہسپتال آئے، حکومت کا پیغام دیا کہ اس نے دونوں مطالبات مان لئے ہیں، میں نے دودھ کے تین گھونٹ پیئے اور اس طرح ۲۲ دن کی بھوک ہڑتال بفضل تعالیٰ کامیاب ہو گئی۔

یہ کیا تھا صرف اللہ کا انعام، جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں اللہ انہیں کبھی شکست نہیں دیتا ہے

۱۲ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد ۲۲ دن کی اس بھوک ہڑتال نے جو ہفتہ بھر کے وقفہ سے شروع ہوئی میری تمام ہمت سلب کر لی میں کانٹے کی طرح ہو گیا۔ البتہ لوگوں کے ملنے جلنے پر جو پابندیاں تھیں وہ نرم پڑ گئیں میں جس سے ملنا چاہتا کسی روک ٹوک کے بغیر مل سکتا تھا، اکتوبر کا پورا مہینہ چارپائی پر گذارنا پڑا۔ نومبر کے شروع میں کمرے سے باہر نکل کر کاروڈور میں آرام کرسی پر بیٹھنے لگا، ہاتھوں میں رعشہ تھا مریضوں کے تیمار دار محبت ودعا کے ملے جلے جذبات سے دیکھتے، اگئی رات تک۔

دوستوں کی بھیڑ لگی رہتی وہ سب انسپکٹر جواب مامور کئے گئے شریف لوگ تھے، ان میں ایک سب انسپکٹر کمرے میں داخل ہوا تو انتہائی جذبات کے ساتھ سلوٹ کیا، لگا ہے گا ہے سی آئی ڈی والے بھی اجازت لے کر چلے آتے، میں اس حد تک لاچار تھا کہ بہت کم بولتا، عموماً نیند کا غلبہ رہتا، پروفیسر افتخار احمد اور کرنل نجیب اللہ نے صحت واپس لانے کے لیئے اتنی محنت کی کہ میرے دل سے ہمیشہ ان کے لیئے دُعا نکلتی رہے گی، یہ دو ڈاکٹر نہ ہوتے تو میرا بچنا محال تھا گو زندگی و موت اللہ کے اختیار میں ہے لیکن اس مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے میرے لیئے انہیں اپنی رحمت بنا دیا تھا۔

پاس ہی ایک کمرے میں کوئی رئیس داخل تھا اس کے تیمارداروں میں ایک صاحب حاجی تاج محمد بلوچ تھے وہ میری ثابت قدمی سے بے حد متاثر ہوئے پولیس سے خواہش کر کے مجھے دیکھنے آئے پھر اُن کا معمول ہو گیا کہ ہر روز مجھے ـــــ کوئی من بھر پھل بھیجتے اس کے علاوہ جو چیز بھیجتے سیروں بھیجتے۔ میں نے ہر چند انہیں روکنا چاہا لیکن وہ کسی طرح بھی اپنی محبت میں کمی کرنے کو تیار نہ ہوئے ان کا یہ سلسلہ میری رہائی تک جاری رہا ظاہر ہے کہ میں کھا پی نہیں سکتا تھا انہیں اصرار تھا کھاؤ نہ کھاؤ، مریضوں میں بانٹ دو سٹاف میں تقسیم کر دو لیکن وہ تاثر جو تمہاری جرأت نے پیدا کیا ہے اس کا اقتضا ہے کہ جب تک کراچی میں رہو گے یہی ہو گا، میری رہائی سے روانگی تک۔ تقریباً ڈھائی مہینے پھل آتا رہا، میں ضرورت مندوں میں بانٹ دیتا وہ میرے لیئے دعائیں کرتے۔

خط و کتابت بھی کھل گئی، میں ہر روز مختلف دوستوں کو دس پندرہ خط لکھتا یا لکھواتا، ان کی طرف سے بھی اتنی ہی ڈاک آتی، ـــــ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا ایک رجسٹرڈ خط جو ۲۵ ستمبر کو لکھا تھا مجھے نومبر کے پہلے ہفتہ میں سینسر کے مراحل طے

کرتا ہوا ملا وہ خط یہ تھا۔

70. CLIFTON,
KARACHI-6

(Registered) **25th Sept., 1968.**

My dear Shorish,

Government does not permit me to meet you ; writing a letter has its obvious disadvantages. Nevertheless, I must inform you that you are all the time in our minds and we shall continue to work and pray for you and your success. Please remember that you have many good friends and I known that you will count me as one of them. Whatever service I can render in our common cause will always be done willingly.

With best wishes.

Yours sincerely,
Sd/
(Zulfikar Ali Bhutto)
H.Pk.

Agha Abdul Karim Shorish Kashmiri,
Central Jail, Karachi.

اردو ترجمہ

(رجسٹرڈ)

۷۰۔ کلفٹن
کراچی۔ ۶
۲۵ ستمبر ۱۹۶۸ء

مائی ڈیر شورش،

حکومت مجھے آپ سے ملنے کی اجازت نہیں دیتی، خط لکھوں تو ظاہر ہے

اس میں کچھ دشواریاں حائل ہیں، بہرحال میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ ہمیشہ ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں اور ہم آپ کے لیے اور آپ کی کامیابی کے لئے مسلسل کام بھی کریں گے اور دعا بھی، اتنی بات یاد رکھئے کہ آپ کے بہت سے اچھے دوست ہیں اور میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے بھی انہی میں شمار کریں گے۔ مشترکہ مقصد کے لئے میرے لائق جو بھی خدمت ہو لبسر و چشم بجالاؤں گا۔

بہترین تمناؤں کے ساتھ

آغا عبدالکریم شورش کاشمیری — آپ کا مخلص

سنٹرل جیل۔ کراچی — ذوالفقار علی بھٹو ہلالِ پاکستان

اب اس خط میں کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ ڈیڑھ مہینہ سرکاری حراست میں رہتا لیکن حکومت تھی کہ ایسی حرکتوں کے بغیر اس کا مزہ کرکرا ہو جاتا، قید کرنے والوں نے قید ہونے والوں کے درد کا اندازہ ہی نہیں کیا اگر انہیں کبھی اُس درد کا احساس ہو جو حکومتوں کے تمرد سے کسی بے گناہ قیدی کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو وہ شاید اپنی رعونت سے توبہ کرلیں وہ لوگ جو ملک و قوم کے لئے صعوبتیں برداشت کرتے اور موت کے آغوش میں چلے جاتے ہیں اُنہیں ایک اعلیٰ نصب العین کا عشق یا عاقبت میں بارگاہ ایزدی سے اجر کا ولولہ ہی مضبوط رکھتا ہے، ورنہ جس معاشرہ میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں اس معاشرہ نے ہمیشہ ملمع وریا اور جبر و استبلا کا ساتھ دیا ہے۔ ایثار پیشہ شخصیتوں کو ہمیشہ ان کی موت کے بہت دنوں بعد یاد کیا اور سراہا گیا ہے، حیرت ان لوگوں پر ہے جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور یوم جزا و سزا سے انکاری ہیں لیکن ملک پر قربان ہو جاتے ہیں۔

نومبر کے وسط میں میری اہلیہ نے گورنر کو ذیل کا خط لکھا۔

بخدمت گرامی گورنر مغربی پاکستان لاہور

جناب مکرم

گزارش ہے کہ

۱ - میرے شوہر آغا شورش کاشمیری کو ختم نبوت کے مسئلہ میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کا غلط استعمال کر کے بلا معیاد نظر بند کیا گیا ہے - جن لوگوں کی ملی بھگت سے یہ فیصلہ ہوا ہے وہ قیامت کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دیں گے؟

۲ - ہماری آمدنی کے تمام دروازے بند کئے گئے ہفت وار چٹان کی شہ رگ پر چھری رکھ دی گئی حتیٰ کہ حکومت نے ہائی کورٹ کے اس فیصلے کا احترام بھی نہیں کیا جس کی رو سے چٹان کا ڈیکلریشن بحال ہو گیا تھا لیکن منتقانہ ذہنیت نے صرف اختیارات کے زعم میں ہائی کورٹ کے فیصلہ کی عزت کو بھی مجروح کیا ہے۔

۳ - ہمارا پریس ضبط کر لیا گیا چھ ماہ ہوتے ہیں حکومت کے اپنے ہی ٹربیونل نے ابتدائی سماعت بھی نہیں کی ہے۔

۴ - حکومت نے میرے شوہر کی نظر بندی کو طول دینے کے لئے ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک کئی پینترے بدلے ہیں۔

۵ - میرے شوہر کو اس سارے عرصہ میں کئی صعوبتوں سے گزرنا پڑا چھ مئی کو انہیں گرفتار کر کے ڈیرہ اسمٰعیل (کالا پانی) بھیجا گیا، سی کلاس دی گئی حالانکہ وہ ہر لحاظ سے اے کلاس کے مستحق تھے - نو دن کی بھوک ہڑتال کے بعد حکومت نے اپنے غلط فیصلے کی تصحیح کی۔

۶ - پھر انہیں کوئی ایک ماہ بعد ملک کی آخری سرحد کراچی بھیجا گیا۔ وہاں انہیں

ذہنی تنہائیوں کی صعوبتوں میں سے گزرنا پڑا۔ آپ کے قواعد نظر بندی کے تحت انہوں نے اپنے معالج نامزد کئے لیکن ادھوری شنوائی ہوئی، بارہ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد جناح ہسپتال منتقل کیا گیا لیکن جونہی سپریم کورٹ میں سماعت ختم ہوئی انہیں واپس جیل بھیج دیا گیا۔

۷ - حکومت کو بڑی دیر بعد ہماری آمدنی غصب کرنے کا احساس ہوا کوئی چھ ماہ بعد تین سو روپے ماہانہ الاؤنس مقرر تھا جو ہمارے زخموں پر نمک پاشی کے مترادف تھا، ہم نے اس شاہانہ فیاضی کو مسترد کر دیا کہ ہم اپنے زخموں کی نمائش کرنا نہیں چاہتے، حاکم الحاکمین صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

۸ - آخر مسلسل بدسلوکیوں کے انبار سے تنگ آکر میرے شوہر نے ۱۳ ستمبر سے بھوک ہڑتال کر دی جو ۲۲ روز تک جاری رہی، حکومت نے ان کے مطالبہ کی صحت کا احساس کیا اور تسلیم کر لیا کہ انہیں پنجاب میں رکھا جائے گا لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب وہ دائم المرض ہو گئے۔

۹ - ظاہر ہے کہ وہ ذیابیطس کی وجہ سے کئی امراض کا مجموعہ ہو چکے ہیں اور ہسپتال میں ہیں انہیں منتقلی کے بعد لازماً ہسپتال ہی میں رکھا جائے گا جہاں میڈیکل سہولتیں بکمال و تمام ہوں گی اور مرض کے کسی وقت بے قابو ہونے کی وجہ سے پروفیسر اور اسپیشلسٹ موجود ہوں گے۔

۱۰ - اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمرانی سونپی ہے غور کریں ــــــ آپ کی حکومت نے ہمارے رزق کی ہر راہ بند کر دی ہے، حالانکہ ہمارا رزق صرف اللہ کا دیا ہوا ہے۔ حکومت نے آج تک ہمیں کچھ نہیں دیا نہ ہم کبھی طلب گار ہوئے اور نہ بفضل تعالیٰ ہم اپنا دست غیرت کسی انسان طاقت کے سامنے دراز کر سکتے ہیں۔

۱۱ - میرے شوہر کی نظر بندی کو بلاوجہ طول دیا جا رہا ہے وہ اس عرصہ میں مجموعاً

دو ماہ تک ہسپتال میں رہ چکے اور اب بھی ہسپتال میں ہیں انہوں نے اب تک ۴۳ دن بھوک ہڑتال کی ہے۔ ان کی صحت بالکل گرتی ہوئی دیوار ہو گئی ہے۔

۱۲۔ حکومت کی اس روش سے میں کیا نتیجہ اخذ کروں ۔؟ میرے دماغ میں دو ہی صورتیں آتی ہیں۔

۱۔ حکومت اپنے اقدام پر نظر ثانی کرے اور انہیں فوراً رہا کر دے تاکہ کسی کے دامن پہ اُن کے لہو کا دھبہ نہ رہے۔

۲۔ یا پھر مجھے اور میرے گیارہ بچوں کو بھی جیل بھیج دیا جائے کیونکہ موجودہ صورتحال ہمارے لئے تباہ کن ہے، میری اولاد کا مستقبل تباہ کیا جا رہا ہے۔

۳۔ واضح رہے کہ ہم ہر لحظ ختم نبوت پر جان دینے کو تیار ہیں، اندریں حالات ہم خود ختم نبوت کے تحفظ میں رضاکارانہ طور پر گرفتار ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہمارے لئے اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں اور نہ اس سے بڑا آخرت کا کوئی توشہ ہے ہم رسول اللہ پر قربان ہونے کا قطعی فیصلہ کر چکے ہیں۔

خیر اندیش

(خورشیدہ بیگم شورش کاشمیری)

دسمبر کے پہلے ہفتہ میں تندرستی عود کر آئی اور میں بھوک ہڑتال کے ضعف سے چھُوٹ کے بحال ہو گیا۔

ملک کے گوشہ گوشہ سے اتنے خطوط آنے لگے کہ ہر روز باضابطہ اور بے ضابطہ خطوط سے تھیلہ بھر گیا۔ اطمینان یہ تھا کہ میرے لئے ملک کے ہر حصہ میں اہل اللہ دعائیں کر رہے تھے۔

مولانا عبدالہادی دین پوری کے فقر و استغنا سے متعلق میرا تاثر کچھ زیادہ ہی گہرا تھا، میں نے دُعا کے لئے کئی بزرگوں کو خط لکھے تو انہیں بھی ایک عریضہ

ارسال کیا، انہوں نے جواب مرحمت فرمایا ان کا جواب اس لئے نقل کر رہا ہوں کہ ان کے متعلق میرا اب بھی وہی تاثر ہے میں انہیں اہل اللہ میں سے سمجھتا ہوں لیکن غلام غوث ہزاروی کی جمعیتہ نے ان کی سلفہ بگوشی کے باوجود اپریل ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء کی اس تیسری سہ ماہی تک جو کچھ میرے خلاف کہا اور لکھا ہے وہ لوگوں کے حافظے اور ترجمان اسلام دسبحان اللہ، کی فائلوں میں محفوظ ہے، حضرت رائے پوری نے اپنے اس خط میں لکھا تھا کہ "ہمارے نامہ ہائے اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوتے رہتے ہیں" چنانچہ میں بھی اپنا استغاثہ حضورؐ کے ہاں داخل کر چکا ہوں مجھے یقین ہے اس کی سماعت ہو گی اور حشر کے دن فیصلہ ہو گا کہ میری معصیتیں شفاعت کی حقدار ہیں یا ان کی عبادتیں۔

حضرت دین پوری کا محولہ خط میری نظر بندی کے دوران ۲۷ستمبر ۱۹۶۹ء کے ہفتہ وار "لولاک" لائل پور میں چھپ چکا ہے درج ذیل ہے۔

محبی،

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مکتوب ملا، فقیر نے نہ صرف آپ کے لکھنے پر آپ کے حق میں دعا کی ہے بلکہ پہلے بھی اکثر اوقات خاص میں آپ نیک دعاؤں میں یاد رہتے ہیں، آپ کی بیماری اور ابتلا کے واقعات وقتاً فوقتاً معلوم ہوتے رہتے ہیں جنہیں سُن کر اپنے ہاں کے حالات پر پریشانی ہوتی ہے۔

محترم! ہمارے بزرگوں نے یا ہم نے آزادی سے قبل جو خواب دیکھے تھے وہ آزادی کے بعد جس طرح پریشان ہوتے ہیں ان کا تصور ہی ایک صحیح الدماغ انسان کو پاگل کر دینے کے لئے کافی ہے، مگر مصلحت خداوندی ہے یہ تمام کھیل دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں افسوس اس بات کا ہے کہ دور حاضر میں اسلام اور

عوام جس قدر مظلوم ہیں کوئی دین یا گروہ خستہ حال نہیں ہے مگر کروڑوں میں سے کوئی فرد بھی تو حسین ابن علیؓ، ابو حنیفہؒ یا احمد بن حنبلؒ کی سنت کو تازہ کر دینے والا موجود نہیں ہے۔ بہت دور کی بات لکھ دی ہے خود اپنی ان گنہگار آنکھوں سے شیخ الہند، مدنی، سندھی، دین پوری، لاہوری اور بخاری ایسے خلوص اور عزیمت کے قد آور پیکر دیکھے ہیں کہ جن کی شخصیات کے سامنے ہمالہ کی بلندیاں پست معلوم ہوتی ہیں، قدرت کی وہ فیاضی تھی کہ ایک وقت میں اتنے باکمال پیدا کر دیئے تھے یا یہ حالت ہے کہ دُور دُور تک خلا ہی خلا ہے، قحط الرجال کے اس دور میں پھر بھی آپ، ایسے لوگوں کا دم غنیمت ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو خلوص و استقامت عطا فرمائے (آمین)

آپ کی نظر بندی صرف ایک فرد کا معاملہ نہیں ہے تمام حق پسندوں کے خلاف ایک کھلی سازش ہے سب اہل اپنے دل و دماغ میں آتش کدہ آباد کئے ہوئے اور ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں۔

محترم! زندان کی تکالیف عارضی چیزیں ہیں ختم ہو جائیں گی خوشی ہے کہ آپ نے صحیح مقصد پا لیا وہ رضائے الٰہی اور اس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی ہے ہمارے نامہ اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوتے رہتے ہیں، انشا اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی آپ کے حق میں دعا فرماتے ہوں گے۔ فقط والسلام

مورخہ ۱۵ جمادی الاول فقیر عبد الہادی عفا اللہ عنہ

صدر ایوب اور گورنر موسیٰ میرے متعلق جہاں تہاں جن کلمات کا اظہار کرتے وہ سب کچھ مجھ تک پہنچ جاتا، میرے متعلق وہ براہ راست کچھ نہیں جانتے تھے۔ انہیں بعض سیاسی اور حکومتی عناصر نے اپنی عقربی فطرت کے اقتضا پر

مشتغل کر رکھا تھا۔ پارسال ایک صاحب چودھری حبیب احمد نے اسلام آباد میں ایوب خان سے ملاقات کی تو میرے متعلق ان سے کوئی سوال کیا، ایوب خان نے نوائے وقت کی رپورٹ کے مطابق میرے متعلق کلمۂ استحسان کہا، اور یہ بھی کہاکہ شورش کاشمیری کے متعلق کرمانی نے انہیں گمراہ کیا تھا۔" ایک کرمانی ہی نہیں کچھ اور "پردہ نشین" بھی تھے ـــــ الطاف گوہر بھی اس "ثواب دارین" میں شریک تھا۔

انہی دنوں میں نے ایک خط صدر ایوب کو لکھا اس کی نقل محفوظ ہے، تاریخ درج نہیں بہر حال یہ خط میری اہلیہ نے اپنے ایک مختصر خط کے ساتھ ان کے ملٹری سیکرٹری جنرل محمد رفیع کے نام رجسٹرڈ پوسٹ کیا کہ میرے شوہر نے یہ خط صدر کے نام لکھا ہے براہ کرم اُن تک پہنچا دیں ـــــ افسوس کہ اس وقت تک ہم جنرل محمد رفیع سے کاملاً آگاہ نہ تھے بلکہ حسن ظن کا شکار تھے، یہ تو اب رفیع صاحب ہی جانتے ہیں انہوں نے یہ خط صدر کے حوالہ کیا یا نہیں ؟ یا اور بہت سی چیزوں کی طرح گول ہوگیا۔

وہ خط حسب ذیل ہے اس میں دو چار فقرے اور دو چار نام اس لئے کاٹ دیئے ہیں کہ وہ لوگ نہیں رہے اور نہ اس مرحلہ میں اندراج مناسب ہے۔

گرامی منزلت،

سلام مسنون، اس سے پہلے کہ آپ کی حکومت میرے خون ناحق کو اپنے دامن پر لے میں چاہتا ہوں چند معروضات پیش کر دوں۔ ابتداً یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ میں کسی ایسی خواہش یا طلب کے تحت جو اپنے متعلق ہو آپ کو یہ خط نہیں لکھ رہا۔ آپ عمر اور صحت کی رُو سے اب ایک ایسی منزل میں ہیں جو انسان کو عاقبت کی فکر سے قریب کرتی ہے، میں چاہتا ہوں آپ ان لوگوں کے چہرے بھی پہچان لیں جو آپ کے گرد و پیش رہ کر تصویر کا ایک رُخ ہی آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اور جن کی سیرت

اُن درباریوں سے مختلف نہیں جنہوں نے مغلوں کے آخری دور میں بہادر شاہ ظفر کو محصور کر رکھا تھا۔ اِدھر دہلی کے کوچہ و بازار میں قتلِ عام ہو رہا تھا اُدھر اُن لوگوں نے بادشاہ کو خوبصورت الفاظ کے شیشے میں اُتار رکھا تھا — بادشاہ نے پوچھا۔

"قلعہ دہلی سے باہر شور و غل کیسا ہے؟"

مصاحبوں نے جواب دیا "جہاں پناہ! رعایا پروری پر وابستگانِ دامن بہجت و مسرت کا اظہار کر رہے ہیں"۔

۲۔ میں اس وقت ہسپتال میں ہوں گھر سے دور اولاد سے اوجھل، بیماری سے عاجز لیکن اللہ کی رضا پر شاکر۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ میرے جسم و جان پر کیا گزر چکی ہے اور کیا گزرے گی انسانوں کی رضا سے زیادہ مجھے اللہ کی رضا عزیز ہے تاہم میرا فرض ہے (آواز حقیر سہی) کہ اتمام حجت کر لوں۔ آپ مجھے تختہ دار پر بھی کھینچوا سکتے ہیں لیکن ہر انسان فانی ہے۔ جیل کا داروغہ اور قانون کا قیدی سب کے لئے موت ہے۔

۳۔ آپ نے بظاہر مجھے جس پاداش میں قید کیا وہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر آخرت کا انحصار ہے۔ اس مسئلہ کی نزاکت آپ کو الطاف گوہر، فضل الرحمٰن اور بعض دوسرے دانشور نہیں سمجھا سکتے۔ علمائے حق سے رجوع کریں یا علامہ اقبالؒ کی تحریروں پر نظر ڈالیں تو اس مسئلہ کے شرعی و عمرانی مضمرات سمجھ میں آسکتے ہیں۔

۴۔ میری گرفتاری ظاہر ہے کہ آپ کی رضا کے بغیر نہیں ہوئی۔ جو لوگ تاریخ کے ہیرو ہوتے ہیں وہ ہاتھ ملا کر دغا نہیں کرتے آپ نے ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء کو میرے ساتھ یہی سلوک کیا۔ اب ۸ مئی ۱۹۶۸ء کو یہ کرم فرمایا کہ میرے

رزق حلال کو سلب کر لیا اور مجھے جیل میں ڈال دیا۔ آپ سے میں نے کبھی کچھ حاصل نہیں کیا، آپ نے میرے اس رزق پر قبضہ کیا ہے جو میرے اللہ نے مجھے دیا تھا۔ میرا رزق الطاف گوہر اور احمد سعید کرمانی وغیرہم کے رزق سے کہیں اجلا رزق ہے کہ میرے خون کی اس میں آمیزش ہے۔

۵۔ ایک شخص کی توقیر عموماً اس کے دوستوں سے پوچھی جاتی ہے یا ان لوگوں سے جو اس کے حاسد رقیب یا حریف نہیں ہوتے ___ جن کا ظرف وسیع ہوتا اور دل چشمہ میرے معاملہ میں آپ نے جن لوگوں کی معرفت رائے بنائی اور انہوں نے اپنے مصالح و اغراض کی بنا پر جو کچھ آپ کے کان میں ڈالا اس کا بڑا حصہ فرضی ہے اپنے حسب منشا خط و خال بنانے میں ان لوگوں نے بیسیوں مو قلم لگائے ہیں۔

۶۔ میرے معاملہ میں کچھ لوگ غیر جانبدار بھی ہو سکتے ہیں مثلاً قدرت اللہ شہاب این اے رضوی یا آپ کے سابق سیکورٹی آفیسر چودھری عبدالحمید باجوہ لیکن آپ نے میرے متعلق ان لوگوں کو مقرر کیا جن کے ہر نوعی گناہوں کی بے تردید کہانیاں میرے علم میں ہیں اور وہ اس کے احتساب سے ڈرتے ہیں۔ اسی لئے وہ آپ کے خنجر کو میری شہ رگ پر رکھ کر اپنے احتساب سے بچنا چاہتے ہیں۔

۷۔ الطاف گوہر آپ سے جتنے مخلص ہیں وہ میں جانتا ہوں مجھے آج اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے کہ میں نے وہ اشکال آپ کے سامنے کیوں نہ رکھیں جو اس "چُلبلے آفیسر" کی سیرت کا صحیح عکس تھیں؟ بہر حال ایک دن آپ کو معلوم ہو گیا یا آپ کی اولاد اس سے آشنا ہو گی کہ اس گوہر یکدانہ کے خط و خال کیا تھے؟ میں بہر حال اس کے فریب میں آ گیا اور وہ میرے لئے دانہ و دام تیار کرتا رہا۔

احمد سعید کرمانی گھات میں تھا ان دو کھلنڈروں کی لگائی بجھائی آپ کے "گوش حق نیوش" تک پہنچی، اور تب میری اسیری کا پروانہ بنا۔

۸۔ ماتحت افسروں سے حسب منشا رپورٹیں تیار کروانا چنداں مشکل نہیں لیکن وقت بُرا ہو تو یہی افیسر دغا دے جاتے ہیں، ملک امیر محمد خان گورنر تھے تو ان کا اشارۂ ابرو فرمان خسروی تھا، امیر محمد خان گورنر نہ رہے تو ان کی میت بیٹوں کے دوش سے محروم رہ گئی۔ جو آفیسران سے کانپا کرتے تھے ان کی میت پر ہنس رہے تھے۔

۹۔ بہرحال میرے سامنے معاملہ کا یہ رُخ نہیں۔ میرا قصہ یہ ہے کہ آپ قادیانی فتنہ سے آگاہ ہوں بے شک آپ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں لیکن آپ، ان لوگوں کے نرغہ میں ہیں جو اسلام سے گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں۔

۱۰۔ اس وقت آپ کے گردو پیش (چند استثنائی صورتوں کے سوا) وہ لوگ ہیں جن میں ایک جماعت ذہنی کمیونسٹوں کی ہے، یہ لوگ ملک کو سیاسی جمود میں لاکر کمیونزم کا راستہ صاف کر رہے ہیں۔ دوسری جماعت میرزائیوں کی ہے یا پھر اُن کا ہمزلف ایک دوسرا فرقہ ہے۔ میرزائی آپ کی شخصی خدمت میں رہ کر اپنی جوت جگا رہے ہیں اور آپ غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مختصر جماعت چونکہ مسلمانوں کے سواد اعظم کی معتوب ہے اس لئے آپ کے لئے کسی مرحلہ میں کسی خطرے کا باعث نہیں ہو گی۔

۱۱۔ یہ بات واضح ہے کہ میں کسی میدان میں آپ کا ہم پایہ نہیں۔ نہ مجھے آپ سے کوئی نسبت ہے اور نہ کسی گوشے میں آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہوں تاہم میں نے جو کچھ کہا پاکستان کے فائدہ میں کہا اور اگر یقین کریں تو آپ کے فائدہ میں کہا۔

۱۲۔ اس وقت بہ وجوہ عالمی طاقتیں ہمارے معاملہ میں اتنی مخلص نہیں جتنا ہندوستان کے معاملہ میں اس کے ساتھ ہیں۔ میں اسباب و علل کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن اسباب و علل سے ناواقف بھی نہیں۔ ہر حکومت کے دو دانت ہوتے ہیں ایک کھانے کے ایک دکھانے کے ،

۱۳۔ مجھے بلا واسطہ معلومات کی بنا پر یقین ہو چکا ہے کہ سی آئی اے کو پاکستان میں اپنی مرضی کی مملکت اور اپنے ڈھب کی حکومت قائم کرنے کے لئے جن ذو معنی مہروں کی تلاش ہے وہ اس نے تلاش کر لئے ہیں، قادیانی جماعت مذہب نہیں سیاسی تنظیم ہے۔ بیرون پاکستان چودھری ظفر اللہ خان اور اندرون پاکستان ایم ایم احمد بلا شبہ اس تنظیم کے نہاں خانہ دماغ کی شطرنج کے مہرے ہیں۔

(۱) میرزائی ــــــ فوج میں اپنی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں۔ "الفضل" بھرتی کے اشتہارات اکثر و بیشتر خبر کے طور پر چھاپتا ہے۔ نتیجۃً جہاں جہاں سلیکشن بورڈ میں میرزائی ہوتے ہیں وہاں میرزائی ہی بار پاتے ہیں۔ ان کی اصلی تعداد ربوہ کے خفیہ کاغذات پر قبضہ کر کے معلوم کی جا سکتی ہے۔ ملک سے باہر اس کی ایک نقل (Code Words) میں چودھری ظفر اللہ خان کے پاس موجود ہے۔

(ب) آپ کے علم میں ہوگا کہ ایئر فورس میں (محذوف) ٹیکنیکل ٹریننگ کا انچارج تھا تو اس نے جتنے نوجوان ٹریننگ کے لئے امریکہ بھیجے تھے تقریباً سب قادیانی تھے۔ ایئر مارشل اصغر خان کی علیحدگی کا باعث خواہ کچھ ہو لیکن ان کے خلاف میرزائی اُمت نے فضا پیدا کی جو مختلف روایتوں کی شکل میں آپ تک پہنچی اور ان کی سبکدوشی کا سبب بنی۔ میرزائی اُمت نے ان سے بالواسطہ انتقام لیا کیونکہ بر روایت انہوں نے اپنے ذاتی عملے کو ہدایت کی تھی کہ اس عنصر کی سفارش و ترقی روک لی جائے اور اس غرض سے ان کے سامنے کاغذات پیش

نہ کیے جائیں۔

(ج) میرزائیوں کا پلان ہی یہ ہے کہ فنانس اور فوج دونوں میں اقتدار و رسوخ حاصل کیا جائے تاکہ ملک میں ان کی اقلیت کو وہی مقام حاصل ہو جائے جو امریکہ و برطانیہ کی اقتصادی و عمرانی زندگی میں یہودیوں کو حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے تجزیہ میں لکھا ہے کہ

"میرزائی تحریک فطرتاً یہود کی طرف راجع ہے"۔

(د) مظفر احمد اندرون ملک اور ظفر اللہ خان بیرون ملک ان مقاصد کی پشتیبانی کر رہے ہیں۔

۱۴۔ میرزائی اُمت بقول اقبالؒ محمد عربیؐ کی اُمت میں سے ایک نئی اُمت اُٹھائی گئی ہے قادیانیوں کے نزدیک عقیدتاً سب مسلمان کافر ہیں۔ میرزائیوں کو دنیائے اسلام سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں نے اس بارے میں اپنے پیرؤوں کو الہامی سند مہیا کی ہے۔

۱۵۔ میرزائی اُمت کے بارے میں سی آئی اے کا تجزیہ یہ ہے کہ اس کا دنیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی پرانی تاریخ برطانیہ سے غیر متزلزل وفاداری کی ہے دنیائے اسلام کرسے پاکستان کو الگ رکھنے اور اپنے مقاصد کی خاطر پاکستان کو ڈھب پر لانے کے لئے اس اُمت سے کما حقہٗ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

۱۶۔ میرزائی "مدینہ" کے وفادار نہیں۔ قادیان کے وفادار ہیں۔ جب ان کے پیغمبر کی قبر ہندوستان میں ہے تو امریکہ و روس، پاکستان و ہندوستان کے درمیان جس شکل میں اتحاد چاہتے ہیں قادیانی اُمت اس اتحاد کیلئے نہ صرف ہر لحظہ آمادہ ہو سکتی ہے بلکہ بعض واضح بنیادوں پر (upto any extent) جا سکتی

ہے۔ انہیں پاکستان کا کوئی شہر عزیز نہیں جتنا قادیان اور قادیان کے لئے وہ پاکستان کو ہندوستان میں ضم کرنے کے لئے ہر لحظہ تیار ہو سکتے ہیں۔

۱۷۔ مشرقی پنجاب میں کسی بھی مسلمان کا رہنا محال ہے لیکن قادیانی رہ رہے ہیں۔ آپ باور کر سکتے ہیں کہ پاکستان کی سرحد پر انہیں بطور مسلمان رہنے کی اجازت دی گئی ہے تو ان کا تعلق ہندوستان کے انٹیلی جینس بیورو سے نہیں ہوگا؟ اپنے "پیغمبر" کی آخری آرام گاہ کے لئے قادیانی پاکستان سے مذہباً دغا کر رہے ہیں اور دغا کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا تعلق ہندوستان کے ساتھ ہے اور ہندوستان، پاکستان کے مسلمانوں میں ان سیاسی مسلمانوں ہی سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

۱۸۔ میں ایک زمانے میں ہندوستان گیا تھا وہاں میرے ایک دوست آزاد ہند فوج کے جنرل شاہنواز ڈپٹی منسٹر تھے میں نے ان کی گفتگو سے اخذ کیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں کبھی دوستانہ علاقہ یا گمشدہ اتحاد کی راہ کھلی تو پاکستان میں میرزائی اقتدار کی معرفت ہی اس کا ذریعہ ہوگی۔

۱۹۔ میرزائی مشرقی پاکستان کی متوقع علیحدگی کو حالات کا قدرتی ردِ عمل سمجھتے اور اس کے لئے کوشاں ہیں ان کے ذمہ دار لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ مغربی پاکستان کے دو یا تین ٹکڑے آئندہ جنگ عظیم سے پہلے ہو جائیں گے۔ اِنّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون۔ اس صورت میں آپ غور کریں کہ ان کا ذہنی نقشہ کیا ہوگا؟ ان کا خیال ہے کہ وہ پنجاب کے مسلمانوں کو سمیٹ کر اور سکھوں سے مل کر ایک علیحدہ ریاست قائم کر سکیں گے۔

۲۰۔ پاکستان اب ایک تاریخی ذمہ داری کا نام ہے۔ آپ نے اس ذمہ داری کی عنان سنبھالی ہے تو یہ کیجئے کہ

(ا) مذہب کی گرفت کو کمزور نہ ہونے دیجئے اور سواد اعظم کے مذہب سے ربط ابط رکھئے، ان کے حقیقی علما کی توقیر کیجئے علما کبھی حکومت نہیں چاہتے صرف شعائر اسلام کا احترام چاہتے ہیں۔ لادین عنصر نے آپ کے گرد اپنی غرضوں کا حلقہ باندھ کر انہیں آپ سے دور اور آپ کو ان سے دور کر دیا ہے۔

(ب) علاقائی عصبیتوں کو پہلے شخصی محبت پھر عوامی طاقت سے ہموار کیجئے ورنہ پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

(ج) لوگوں پر اعتماد کیجئے، گندے عنصر کو جھٹک ڈالئے، پرانے سیاستدانوں سے حتی الامکان صلح فرمائیے، فرد واحد کا اقتدار رحمت بھی ہو تو نتیجۃً زحمت ہو جاتا ہے خوشامدیوں سے بچئے ہر دور میں ان کا مذہب خوشامد رہا ہے۔

(د) آپ کی پراپاگنڈا مشینری آپ کو دھوکہ دے رہی ہے۔ مثلاً کراچی میں ملوں کے مزدوروں کو ایئر پورٹ پر جمع کرنا، فرمائشی نعرے لگوانا اور چھٹا استقبال رچانا خود فریبی سے زیادہ نہیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ عمال و حکام کے افکار و اعمال کا ہدف بھی آپ کی ذات بنی ہوئی ہے۔ کہتے وہ ہیں چھکاتے آپ ہیں۔

۲۱۔ اپنے گرد و پیش کی دنیا بدلتے رہئیے مثلاً الطاف گوہر کے بغیر آپ کے کون سے کام بند ہو جاتے ہیں؟ احمد سعید کرمانی آپ کے لئے کونسی سیاسی طاقت لا سکتا ہے کئی لوگ آپ کے لئے شرعی بوجھ ہیں۔ نتیجۃً آپ سے شرعی حلقے بگڑے ہوتے ہیں۔

۲۲۔ رہا جھوٹی رپورٹوں کا قصہ جیسا کہ میرے معاملہ میں ہوا تو سید فدا حسن سے پوچھئے میرے نزدیک وہ ایک کھرے اور سچے آدمی ہیں۔ انہیں یاد ہوگا

ون یونٹ بن رہا تھا تو ایک دفعہ انہوں نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا اور کہا سی آئی ڈی نے رپورٹ کی ہے کہ آپ ون یونٹ کی مخالفت کر رہے ہیں گورنر نے مجھے کہا ہے آپ سے بات کروں۔ میں ششدر رہ گیا ـــ میں نے کہا، شاہ صاحب، اگر سی آئی ڈی یہی ہے تو پھر اس ملک کا خدا حافظ ہے، سید صاحب اصل حقیقت سے آگاہ ہوئے تو حیران رہ گئے۔ انہوں نے سی آئی ڈی کی رپورٹ کے متعلق جو تبصرہ کیا میں لکھنا نہیں چاہتا شاید انہیں یاد ہو۔ مطلب ہے کہ سی آئی ڈی کے بعض عنصر شروع ہی سے میرے متعلق پھلجڑیاں چھوڑنے کے عادی ہیں۔

میں نے جو کچھ لکھا اخلاص سے لکھا احترام سے لکھا اور علالت کے بستر سے لکھا ہے باقی میرا اور آپ کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اگر میرے دل میں پاکستان کی سالمیت اور قوم کی وحدت کے خلاف کوئی ہلکی سی لہر بھی ہے تو خدا مجھے تباہ کر دے۔ میں خدا سے یہی دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دیں۔ آمین

بشرف نظر	المخلص
فیلڈ مارشل محمد ایوب خان	شورش کاشمیری نظر بند سنٹرل جیل کراچی
صدر مملکت پاکستان،	حال وارد سول ہسپتال،
راولپنڈی	کراچی

آخری بھوک ہڑتال ۱۸ دسمبر سے ۲۵ دسمبر تک کل آٹھ روز جاری رہی، تفصیلات آخری باب میں آئیں گی لیکن یہی بھوک ہڑتال تھی جس نے حکومت کو چاروں شانے چت کیا۔ اس کے لئے اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ سپر انداز ہو جاتے یا میرا خون اپنے دامن پہ لے، تیسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

○

ہائی کورٹ کی توہین

غلام ہندوستان اور آزاد پاکستان کی عدالتی تاریخ میں ایسا کوئی سیاسی مقدمہ نہیں جس میں حکومت نے کسی سیاسی نظر بند کے معاملہ میں ایسا ناٹک رچایا ہو یا اتنی منتقم ہوئی ہو یا دفاعی قوانین کا ایسا غلط استعمال کیا ہو جیسا میرے مقدمہ میں ہو رہا تھا۔ سپریم کورٹ میں شکست کھانے کے باوجود صوبائی حکومت اس گھات میں لگی رہی کہ مقدمہ کو وہ کس قدر طول دے سکتی ہے یا وہ کونسا حربہ ہو سکتا ہے کہ سماعت کنندہ بنچ دستبردار ہو جائے۔ اور اس کی جگہ ایک ایسا بنچ بن جائے جو قانون کی اس تعبیر کو تسلیم کرے جس سے نظر بندی کی توثیق ہو۔

مجھے لاہور سے لحظہ بہ لحظہ اطلاع مل رہی تھیں کہ حکومت کے بزرجمہر سپریم کورٹ میں اپنے نقطہ نگاہ کی آئینی شکست کو یقینی سمجھتے ہیں ان کی دو خواہشیں تھیں۔

اولاً: سپریم کورٹ کا فیصلہ جلد نہ ہو۔

ثانیاً: فیصلہ خلاف ہو تو پھر نیا شگوفہ کیا ہو۔

میں چاہتا تھا سپریم کورٹ کا فیصلہ جلد سے جلد ہو۔ میرے حق میں ہو تو ہائی کورٹ فوراً سماعت کرے، خلاف ہو تو آئندہ اقدام سوچوں۔ فیصلہ میں خاصی تاخیر ہو گئی، ۲ نومبر کو میں نے سپریم کورٹ کے نام انگریزی میں مندرجہ ذیل درخواست گزاری۔ ظاہر ہے کہ میں وکیل نہیں تھا اور نہ قانون کی زبان جانتا تھا لیکن میں نے غایت درجہ ادب و احترام سے لکھا۔

IN THE SUPREME COURT OF PAKISTAN, LAHORE

Civil Writ Petition No. CRA-48/68/SC, 1968.

Government of West Pakistan,
Through its Home Secretary, Lahore. ....Appellant

versus

Agha Abdul Karim Shorish Kashmiri, Lahore
now detained in the Central Prison, Karachi. ....Respondent

The Respondent humbly sheweth, in continuation of his petition dated 16.9.68, and in continuation of five telegrams addressed individually to the Honourable Judges from his wife :

1. That this Honourable Court heard this case finally on 13.9.1968 at Karachi, and reserved it for the announcement of its judgement, without giving a definite date.

2. That, day in and day out, the petitioner has been anxiously and earnestly looking forward to hear as to when the judgement would be announced.

3. That any delay will only please the Executive as they seem to feel jubilant over torturing the petitioner. They are getting good time to scheme against him, possibly for fabrication of some new Legislation.

4. That only after the announcement of the judgement can the petitioner be shifted to a jail in the Punjab. The petitioner's continuance in the Karachi Jail is a cause of great inconvenience to him and his family members.

5. That any delay contravenes the well recognized principle of natural justice that : "**Justice Delayed Is Justice Denied**". With these practices of our highest judicature, our hopes to have a fair deal threaten to remain a big question mark.

6. That this Honourable Court, the highest judicature of our land, is naturally associated with our highest aspirations, to give the noblest definitions of justice, to be the holiest citadel of our civil liberties, without which our human life would not be human or worth living.

7. That the petitioner prays for an earliest priority to be vouchsafed to his case, as on it, depends not only the existence of the petitioner, but the case of several other citizens' fate also, who, like the petitioner, are rotting in Jail cells.

8. That whatever powers may have appointed my Lords of this Honourable Court, and whatever powers may continue my Lords in this present august station, the ultimate source of power rests with the mute millions' of this country, and whose voice, must at long

last; burst out in triumph. That has been the verdict of history. And let history record in words of red blood rather than in words of rotten gold, that in the year 1968 the Christian era, there lived such judges in Pakistan whose conduct was regulated only by God above and conscience within.

An earliest decision is solicited in the interest of justice.

Petitioner.

Sd/-

(Agha Abdul Karim Shorish Kashmiri)
Detained in Central Jail, Karachi.

Verification.

I, Agha Abdul Karim Shorish Kashmiri, state, on solemn affirmation, today the 2nd November, 1968, at the Central Jail, Karachi, that whatever has been stated in this petition is true to the best of my knowledge and belief.

Petitioner

Sd/-

(Agha Abdul Karim Shorish Kashmiri)
Detenu, Central Prison, Karachi.

سپریم کورٹ آف پاکستان لاہور

سول رٹ پٹیشن نمبر سی آر ۱۷۔ ۴۸۔ ۶۸۔ ایس سی ۱۹۶۸ء

حکومت مغربی پاکستان

بوساطت ہوم سیکرٹری،

لاہور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اپیلانٹ

بنام

آغا عبدالکریم شورش کاشمیری، لاہور

حال نظر بند سنٹرل جیل

کراچی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رسپانڈنٹ

اپنی عرضداشت مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۶۸ء اور آنریبل ججوں کے نام میری اہلیہ کے انفرادی طور پر پانچ تاروں کے سلسلہ میں رسپانڈنٹ عجز و انکسار کے ساتھ ملتمس ہے کہ

۱۔ اس آنریبل کورٹ نے اس مقدمے کی آخری سماعت ۱۳ ستمبر کو کراچی میں مکمل کر لی تھی اور بغیر کوئی تاریخ دیئے فیصلہ محفوظ رکھا تھا۔

۲۔ اس وقت سے اب تک رسپانڈنٹ یہ سننے کے لئے مضطرب اور چشم براہ ہے کہ فیصلہ کب سنایا جائے گا۔

۳۔ تاخیر سے صرف انتظامیہ خوش ہو گی کیونکہ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ عرضداشت پیش کرنے والے کو وہ اذیت دینے میں مسرت محسوس کرتی ہے۔ اسے وقت مل رہا ہے کہ احقر کے خلاف کوئی منصوبہ بندی کرے ممکن ہے کہ کوئی نیا قانون بنانا مقصود ہو۔

۴۔ صرف فیصلے کے اعلان کے بعد ہی درخواست کنندہ پنجاب کی کسی جیل میں منتقل

کیا جا سکتا ہے۔ کراچی جیل میں درخواست کنندہ کی مسلسل موجودگی اس کے اور اہل خانہ کے لئے عظیم تکلیف کا موجب ہے۔

۵۔ فیصلے کے اعلان میں تاخیر قدرتی انصاف کے اس مسلمہ اصول کی خلاف ورزی ہے کہ "انصاف میں تاخیر انصاف سے محرومی کے مترادف ہے" اعلیٰ ترین نظام عدالت کے اس عمل سے ہماری اُمیدیں منصفانہ برتاؤ کے لئے ایک عظیم سوالیہ نشان کا اندیشہ پیدا کرتی ہیں۔

۶۔ آنریبل کورٹ ہماری سرزمین کے بلند ترین نظام عدالت کا درجہ رکھتی ہے قدرتی طور پر ہماری یہ عظیم آرزو اُس سے وابستہ ہے کہ وہ انصاف کی نیک ترین تعریفات مہیا کرے گی۔ ہماری شہری آزادیوں کا مقدس ترین قلعہ بنے گی ایسی شہری آزادیاں جن کے بغیر ہماری انسانی زندگی نہ انسانی رہے گی نہ زندہ رہنے کے قابل۔

۷۔ درخواست کنندہ التجا کرتا ہے کہ اس کے مقدمے کو اولین فوقیت دی جائے۔ کیونکہ اس پر نہ صرف درخواست کنندہ کے وجود کا انحصار ہے بلکہ ان بہت سے شہریوں کی قسمت کا بھی دار و مدار ہے جو درخواست کنندہ کی طرح جیلوں کی کوٹھڑیوں میں سڑ رہے ہیں۔

۸۔ مائی لارڈز! اس آنریبل کورٹ کو کسی بھی ہیئت اقتدار نے مقرر کیا ہو اور کوئی سی ہیئت اقتدار اس صورت حال میں فائز المرام ہو اقتدار کا آخری سرچشمہ بہرحال اس ملک کے کروڑوں بے زبان عوام ہیں۔ جن کی آواز کبھی نہ کبھی کامرانی سے ضرور ہمکنار ہوگی تاریخ کا فیصلہ یہی رہا ہے۔ تاریخ کو موقعہ دیجئے۔ کہ وہ سونے کے سڑے بسے الفاظ میں نہیں سرخ خون کے الفاظ میں یہ حقیقت قلمبند کرے کہ ۱۹۶۸ء عیسوی میں بھی پاکستان میں ایسے جج موجود تھے جو خدا اور ضمیر کی آواز کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔

انصاف کے ضمن میں جلداز جلد فیصلے کی درخواست ہے۔

درخواست کنندہ

آغا عبدالکریم شورش کاشمیری

نظر بند سنٹرل جیل۔ کراچی

تصدیق

میں آغا عبدالکریم شورش کاشمیری آج ۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو سنٹرل جیل کراچی میں باضابطہ توثیق کرتا ہوں کہ اس عرضداشت میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ میرے بہترین علم اور عقیدے کے مطابق صحیح ہے۔

درخواست کنندہ

آغا عبدالکریم شورش کاشمیری

نظر بند سنٹرل جیل۔ کراچی

میں دراصل کراچی میں بے بس تھا۔ میں نے اب تک کبھی سندھ یا کراچی کا سیاسی سفر نہیں کیا تھا۔ یہاں کے وکلاء ذاتی تعلقات کے لحاظ سے میرے لئے اور میں ان کے لئے اجنبی تھا۔ میں نے ایک مرحلہ میں سپریم کورٹ کے نام ایک تار دینا چاہا کہ حکومت میرے مقدمہ کو انصاف سے محروم رکھنے کے لئے اوچھے ہتھیاروں پر اُتری ہوئی ہے براہ کرم حصول انصاف کو سہل کیا جائے اور حکومت کو اس کی جارحیت پر قانون و انصاف کی منشا کے مطابق روکا جائے تار میں نے انگریزی میں لکھا لیکن اپنی انگریزی پر مجھے اعتماد نہ تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ اس تار میں کوئی ایسا لفظ آ جائے جو ہمارے ملک کی اس سب سے بڑی آبرو کے خلاف ہو جیل میں ہوتا تو دوستوں سے مشورہ کر لیتا سول ہسپتال میں کس سے مشورہ کرتا ؟ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر میں نے بعض وکلا کو ہاؤس فزیشن کے کمرے سے فون کئے لیکن سب طرح دے گئے۔ آخر میں نے

مسٹر اے کے بروہی کو فون کیا ان کے پی اے یا اسسٹنٹ نے فون اٹھایا پوچھا کون بات کرے گا؟ میں نے کہا لاہور سے خواجہ عبدالرحیم بار ایٹ لا۔ ؟ بروہی صاحب نے ہیلو کہا میں نے اپنا نام لیا، تو وہ ششدر رہ گئے کہنے لگے کہاں سے بول رہے ہو، عرض کیا سول ہسپتال سے اور چوری چھپے، مدعا بیان کیا کہ صبح ۹ بجے حکومت کی ایک درخواست پر سپریم کورٹ غور کر رہی ہے اندیشہ ہے کہ مقدمہ کو طول دینے کے لئے حکومت کوئی شوشہ چھوڑے گی، میں نے سپریم کورٹ کے نام ایک تار لکھا ہے اور چاہتا ہوں کہ آپ چند الفاظ کے اس مسودہ پر نگاہ ڈال لیں تاکہ کوئی لفظ ایسا نہ ہو جو قانونی ادب و احترام سے خالی ہو، یا آپ اسی مفہوم کا تار املا کرا دیں۔

کہنے لگے فون پر تو مشکل ہے کوئی آدمی پاس ہو تو بھجوا دو۔

میں نے کہا ابھی آپ کے بنگلہ پر میرا ایک عزیز آتا ہے۔

فرمایا۔ ابھی بھیج دو۔

چنانچہ انور عارف ان کے بنگلہ پر گئے انہیں تار دکھایا کوئی پون گھنٹہ میری خیریت پوچھتے رہے، شام ہو گئی تو ان سے کہا،

کل اسی وقت آ کر لے جائیے۔

عارف نے کہا صبح نو بجے تو سپریم کورٹ سماعت کر رہا ہے۔

انور عارف کی روایت کے مطابق بروہی صاحب ایکا ایکی کھڑے ہو گئے اور ڈگ بھرتے ہوئے باہر نکل گئے فرمایا کہ نماز مغرب کا وقت ہو گیا ہے میں اس وقت مسجد کو جا رہا ہوں انور عارف اپنا سا منہ لے کر آ گئے۔

یہ روداد سنی تو مجھے سخت افسوس ہوا بہر حال میرا ان پر کوئی زور نہ تھا اور نہ کوئی حق تھا؛ میں غلط فہمی میں تھا افسوس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے ہمیشہ خوشدلی اور تپاک سے ملے ــــ میں انہیں ملک کے چند دانشمند دین داروں میں سمجھتا تھا اور

وہ فی الواقعہ ایک سکالر شخصیت ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ایوب خان سے اپنے تعلقات بگاڑنے کے حق میں نہیں، اور یہ وہ زمانہ تھا کہ عمر بھر کے بعض دوستوں نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ بروہی نے سچا مسلمان ہونے کے باوجود "جدید سیاست کے نورتن" کی ضبطی پر اس کے مصنف مسٹر جی ایم سیّد کی وکالت کی اور سندھ بنچ کے روبرو اپنے پیشے کا فرض ادا کیا تھا۔ اس کتاب میں اور چیزوں کے علاوہ گاندھی جی کا تقابل مختلف مذاہب کے پیغمبروں سے کیا گیا۔ مسٹر جسٹس جے بی خمسانی اور مسٹر جسٹس عبد القادر شیخ پر مشتمل بنچ نے مسٹر بروہی کے استدلال کا شرح و بسط سے جائزہ لے کر مسٹر سیّد کا مرافعہ خارج کر دیا۔ میں نے یہ فیصلہ ۳ جون کے ڈان میں پڑھا تو مذکورہ کتاب کے مندرجات پر حیرت ہوئی۔

فاضل ججوں نے لکھا تھا کہ مرافعہ گزار کے فاضل وکیل مسٹر بروہی نے اس عبارت کی توثیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو کچھ لکھا گیا وہ بالکل صحیح ہے کیونکہ پیغمبرانِ عالم کو ان کی زندگی میں اتنے پیروکار نہیں ملے جتنے مسٹر گاندھی کو ان کی زندگی میں پیروکار ملے تھے۔

ایک ایسی کتاب کے لئے مسٹر بروہی کا پیش ہونا محض ان کے پیشہ کا اقتضا تھا ــــــ ہم دونو مرکزیہ مجلس اقبال کے پلیٹ فارم پر ہمیشہ ایک ہی نقطہ نگاہ کے مبلغ رہے ہیں لیکن یہاں وہ ایک چھوٹے سے تار کی تصحیح میں ہاتھ نہ بٹا سکے سپریم کورٹ کا مقدمہ ختم ہونے کے ہفتہ عشرہ بعد یعنی ۲۰ نومبر کو میں نے انہیں ذیل کا خط لکھا جس میں کسی قدر ے طبیعت کا ملال شامل تھا۔

Dear Mr. Brohi,

I am at a loss to know how to address you: whether as a politician, or a scholar or an advocate.

You have been waxing eloquent on the higher values of our beloved religion—Islam, and making speeches before several audiences. You have been fighting on behalf of important personalities in the Courts of Law. You have become one of the most influential citizens of Pakistan.

My case in the Supreme Court is over now, but I feel some burden on my heart, which I wish to throw off by these lines addressed to you.

With due respect to you, I am disillusioned by the realities of life and venture to quote some words throbbing within me :

1. "The laws grind the poor, and the rich men rule the laws".

    (Goldsmith)

2. "I was told that the privileged and the poor are two nations".

    (Disraeli)

3. "Man's history is waiting in patience for the triumph of the insulted man".

    (Tagore)

If any religion worth the reverence of man has any message, it is the message of conduct blended with the philosophy of clear thinking and serving man, particularly the man under oppression. That is how I understand Islam and try to practise it in my own humble way.

It grieves me to note that when I was out, you had been lavishing splendid thoughts on me all along, but now I am left in prison without deserving so much notice as a straw in the wind. I hope I shall, nevertheless, come out successful in my sacred mission to serve my countrymen.

Sd/-

(Agha Shorish Kashmiri)
Detenu

Central Jail, Karachi
24.9.1968

Mr. A. K. Brohi,
Advocate,
Muslimabad Colony,
Karachi.

اُردو ترجمہ

ڈیر مسٹر بروہی،

میں سوچتا ہوں آپ کی کون سی حیثیت کو سامنے رکھ کے خطاب کروں۔ ایک سیاست دان کی حیثیت، ایک عالم کی حیثیت یا ایک وکیل کی حیثیت؟

آپ ہمارے محبوب دین اسلام پر مختلف النوع جلسوں سے خطاب فرماتے ہیں تو اس کی اعلیٰ قدروں پر فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ آپ عدالتوں کے سامنے اہم شخصیتوں کا دفاع پیش کرتے رہے ہیں۔ آپ پاکستان کے نہایت سرگرم شہریوں میں شمار ہوتے ہیں۔

سپریم کورٹ میں میرا مقدمہ ختم ہو چکا ہے لیکن میرے دل پر ایک بوجھ سا ہے جسے اُتارنے کے لئے یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

معاف کیجئے زندگی کے حقائق نے میرے ذہن سے کچھ پردے اُٹھا دیئے ہیں آپ کی خدمت میں چند ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں جو میرے رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔

۱۔ غریب قوانین کی چکی میں پس جاتے ہیں لیکن امیر قانون پر حکومت کرتے ہیں۔ (گولڈ سمتھ)

۲۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ دارا و نادار دو الگ الگ قومیں ہیں (ڈیزائیلی)

۳۔ نوع انسان کی تاریخ صبر و شکیب کے اس انتظار میں ہے کہ وہ انسان کامران ہو جس کی خودی مجروح ہو چکی ہے۔ (ٹیگور)

جو مذہب انسان کے احترام کا مستحق ہے اس کا پیغام یہی ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسا کردار ادا کریں جس میں ایک طرف واضح سوچ اور دوسری طرف انسانی خدمت کا جذبہ ہو۔ بالخصوص اس انسان کی خدمت جو ظلم کے بوجھ تلے دبا ہو، میں نے اسلام کو اسی رنگ میں سمجھا ہے اور میری کوشش یہی رہی ہے کہ میں اپنے عاجزانہ انداز

میں اس پر عمل پیرا رہوں۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جب میں جیل سے باہر تھا تو آپ تحسین و ستائش کے الفاظ سے نوازتے رہے لیکن اب پس دیوار زنداں بیٹھا ہوں تو آپ کے نزدیک پرکاہ کے برابر بھی قابل توجہ نہیں رہا۔ بہرحال مجھے امید ہے کہ میں اپنے ہم وطنوں کی خدمت کے مقدس مشن میں کامیاب نکلوں گا۔

سنٹرل جیل۔ کراچی　　　　　　آپ کا مخلص

۲۰ ستمبر ۱۹۶۸ء　　　　　　(آغا شورش کاشمیری)

نظر بند

بخدمت مسٹر اے کے بروہی ایڈووکیٹ

مسلم آباد کالونی۔ کراچی۔

بروہی صاحب کا جواب سولہ دن بعد ملا تاہم یہ ان کا کرم تھا۔ اصل خط اور اُس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

A. K. Brohi.
76, Muslimabad.
Karachi-5

Karachi dated the
6th October. 1968.

My dear Agha Shorish,

I was out of station and it was upon my return therefrom last night that I saw your kind letter. I do not think I can write a long letter to you upon the question you raised concerning the professional services that I could have rendered to you in your present hour of need. The truth of the matter is that no one approached me to do your case in the Supreme Court. It is professionally improper for people like us to attempt to engage ourselves in other people's affairs without being specially requested to do so by our clients. The only time I was contacted was at Lahore in the early days of your detention. This was done by Mr. Saeed Akhtar. He brought to me the draft of the petition which he had intended to file in order to challenge the cancellation of declaration that had been ordered by the West Pakistan Government. I redrafted some parts of that petition, and at his reqeust agreed to appear for you but then no body contacted me thereafter. Mr. Majeed Nizami told me that some interested persons were trying to exploit your detention for the purpose of building up their political future and he was unhapy about the way in which your cases were being handled. Of course, for my part. I know nothing directly about all this.

The only other time I was approached was when your case was about to come up in the Supreme Court. This was done by Mr. Jilani. I was coming out of the Intercontinental Hotel when he met me by chance in the lobby of the hotel and said that I should address the court alongwith 4/5 other lawyers in your case. I told him that the question of 4/5 persons addressing the Court was something which to a lawyer appeared as out of place as on behalf of the petitioner only one lawyer can address the court. I also said that if the aim of the exercise was that some public speeches should be made in the Supreme Court, I was certainly, not the person who was to be thought of on that accasion.

I was told by Mr. Jilani that Mr. Mahmood Ali Qasuri, Mr. Bhutto, Mr. Hasan Ali A. Rehman and others were prepared to appear in your case in the Supreme Court. I said that this would create a confusion in the Court and that at least I could not be a party to that programme.

No one else directly or indirectly has approached me to do your case here at Karachi. I do not think, if approached, I could have declined to appear. When in the first days your case was to be instituted, if you had directly contacted me through your wife or someone else, I would have been glad to help. But as you can see that there is too much of politics involved in the way of your defence being organized and in these circumstances, only your so called friends are to be blamed for not having contacted me earlier.

It seemed in the early phases of your case that some fellows were busy going about organizing your defence but that was around the time when Karachi Courts were on holidays and I was not available as I had some professional commitments at Dacca. Thereafter, of course, I have explained, as no one approached me to appear for you, it has not been found possible to help you.

As to the rest of the things you say in your letter, if life affords me the opportunity of meeting you, many thoughts can be exchanged. For reasons you can understand, I cannot possibly write more to you in this letter.

Your sincerely,

Sd/-

(A. K. Brohi)

اُردو ترجمہ

اے کے بروہی
۷۶۔ مسلم آباد۔ کراچی ۵

کراچی
۶ راکتوبر ۱۹۶۸ء

مائی ڈیر آغا شورش

میں کراچی سے باہر تھا اس لئے رات واپسی پر آپ کا نوازش نامہ ملا۔ آپ کے اس جواب میں طویل مکتوب لکھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کی ضرورت کے اس مرحلے پر میں کچھ پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دے سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی طرف سے مجھے کسی شخص نے یہ نہیں کہا کہ سپریم کورٹ میں آپ کے مقدمے کی پیروی کروں۔ ہم لوگوں کے لئے یہ بات پیشہ ورانہ اعتبار سے نامناسب ہے کہ اپنے موکلوں کی طرف سے کسی فرمائش کے بغیر ان کے معاملات میں دخل اندازی کی کوشش کریں۔ آپ کی نظر بندی کے ابتدائی ایام میں مسٹر سعید اختر ملے تھے۔ انہوں نے مجھے اس عرضداشت کا مسودہ دکھایا جو وہ ڈیکلریشن کی تنسیخ کے اس حکم کو چیلنج کرنے کے لئے پیش کرنا چاہتے تھے جو حکومت مغربی پاکستان نے جاری کیا تھا۔ میں نے عرضداشت کے بعض حصوں کو دوبارہ لکھا اور مسٹر سعید اختر کی یہ درخواست قبول کر لی کہ اس کی پیروی میں کروں۔ لیکن اس کے بعد کسی نے مجھ سے رابطہ پیدا نہ کیا۔ مسٹر مجید نظامی نے مجھے بتایا کہ کچھ مفاد پرست لوگ اپنا سیاسی مستقبل بنانے کے لئے آپ کی نظر بندی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ موصوف اس طریق کار پر ناخوش تھے جو آپ کے مقدمات کے سلسلے میں اختیار کیا جا رہا تھا۔ بہرحال جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے ان تمام باتوں کا براہ راست کوئی علم نہیں۔ اس کے بعد مجھ سے اس وقت رابطہ پیدا کیا گیا جب آپ کا مقدمہ سپریم کورٹ میں آنے والا تھا یہ رابطہ مسٹر

غلام جیلانی نے پیدا کیا، میں انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل سے باہر آ رہا تھا کہ وہ اچانک لابی میں ملے اور کہنے لگے کہ میں آپ کے مقدمے کے سلسلے میں چار پانچ اور وکلاء کے ساتھ عدالت سے خطاب کروں۔ میں نے انہیں بتایا کہ عدالت سے چار پانچ وکلا کا خطاب ایک ایسی چیز ہے جو وکیل کے لئے خارج از بحث ہے۔ کیونکہ درخواست دہندہ کی طرف سے صرف ایک وکیل عدالت سے خطاب کا مجاز ہے میں نے یہ بھی کہا کہ اگر مقصد یہ ہے کہ سپریم کورٹ میں کچھ پبلک تقریریں کی جائیں تو میں یقیناً ایسا شخص نہیں جسے اس موقع پر بلایا جائے۔

مجھے مسٹر جیلانی نے بتایا کہ مسٹر محمود علی قصوری، مسٹر بھٹو، مسٹر حسن علی اے رحمٰن اور بعض وکلا تیار ہیں کہ آپ کے مقدمہ کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے سامنے پیش ہوں۔ میں نے کہا اس سے عدالت میں انتشار پیدا ہوگا اور کم از کم میں اس پروگرام میں فریق بننے سے قاصر ہوں۔

اس کے علاوہ مجھ سے کسی نے کراچی میں بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطہ پیدا نہیں کیا اگر مجھ سے کہا جاتا تو میں نہیں سمجھتا کہ انکار کر دیتا۔ مقدمہ پیش ہونے کے ابتدائی دنوں میں اگر آپ براہ راست اپنی اہلیہ یا کسی اور شخص کی معرفت مجھ سے رابطہ پیدا کرتے تو میں بڑی خوشی سے مدد کرتا۔ لیکن جیسا کہ آپ خود جانتے ہیں جس طریقہ پر آپ کا دفاع منظم ہو رہا ہے اس میں سیاست کا کچھ زیادہ ہی دخل ہے، اندریں حالات ابتدائی دنوں میں مجھ سے رابطہ نہ پیدا کرنے کے لئے صرف آپ کے نام نہاد دوست ہی قصوروار ہیں۔

آپ کے مقدمے کے ابتدائی مرحلوں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ آپ کا دفاع منظم کرنے میں مصروف ہیں لیکن یہ وہ وقت تھا جب کراچی کی عدالتوں میں چھٹیاں تھیں اور میں کراچی میں موجود نہیں تھا کیونکہ مجھے بعض پیشہ ورانہ ذمہ داریوں

کے سلسلے میں ڈھاکہ جانا پڑا تھا۔

رہی آپ کے خط میں لکھی ہوئی دوسری باتیں تو اگر زندگی نے آپ سے ملاقات کی مہلت دی تو بہت سے خیالات کا تبادلہ ہو سکے گا۔ بعض وجوہ کی بنا پر جو آپ کو معلوم ہیں میرے لئے اس خط میں کچھ اور لکھنا ممکن نہیں۔

آپ کا مخلص

اللہ بخش بروھی

(اے۔ کے۔ بروھی)

بروہی صاحب نے جو کچھ لکھا لازماً صحیح ہوگا لیکن جو تجربہ مجھے ہسپتال میں ہوا اس سے میرے شیشۂ دل میں ضرور بال آگیا، یہ صحیح ہے کہ مقدمہ میری خواہش پر نہیں بلکہ بعض دوستوں کی خواہش پر لڑا جا رہا تھا اور دوستوں کے اس طائفہ کی صدرنشینی کا شرف ڈاکٹر مبشر حسن کو حاصل تھا۔ وہ مجھے اپنے ۸ جون کے خط میں کچھ ایسی باتیں لکھ چکے تھے کہ اب ان کا ذکر بیکار ہے، اور نہ اب وہ ہمارے دوست رہے ہیں لیکن جن وکلا نے مقدمہ لڑا میں ان کے اخلاص کا عمر بھر شکر گزار رہوں گا، جو پیچھے ہٹ گئے ان کے اخلاص سے بھی مجھے انکار نہیں، میں نے پہلے بھی ایک باب میں لکھا ہے کہ اپنی گرفتاری کے بعد میں کسی وکالتی مشورہ میں شریک نہ تھا۔ مجھے اتنی دور پھینک دیا گیا تھا کہ ہر چیز اخبارات سے معلوم ہوتی۔ میری اہلیہ کے سوا کوئی شخص اس دوران میں نہ مجھے ملا اور نہ اس سے زیادہ وہ باخبر تھی کہ مقدمات کے بعض کاغذات پر اس سے دستخط لئے جاتے تھے۔

سپریم کورٹ نے ۹ ستمبر کی تاریخ مقرر کی تو بے سروسامانی نمایاں ہوئی میں نے ۲۲ اگست کو مولانا تاج محمود کے نام ایک خط لکھا جو انہوں نے ۲۸ اگست کے لولاک میں شائع کیا ——— وہ خط یہ تھا۔

کراچی سنٹرل جیل

۲۲ راگست ۱۹۶۸ء

برادرم مکرم مولانا تاج محمود صاحب

سلام مسنون۔ کئی دنوں سے نامۂ گرامی نہیں ملا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ خواجہ صادق کاشمیری نے مجھے خط لکھا تھا کہ وکلا یہاں آنے میں تذبذب کر رہے ہیں بات ان کی ٹھیک ہے، ہر چیز فی سبیل اللہ نہیں ہوتی۔ قانونی نقطہ ہے اس کا صحیح صحیح جواب آگیا تو آئندہ اور لوگوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ صحیح حل نہ ہوا تو اور خرابیوں کی طرح ایک عظیم خرابی یہ بھی سہی۔ پہلے ہی لوگ کہاں آزاد ہیں کہ اب کسی آزادی کے گم ہونے کا ماتم کیا جائے۔ میں تو اس مقدمہ بازی کے خلاف تھا آپ لوگوں نے شروع کی تو اب اس بات سے نہیں چوکنا چاہیئے کہ میرزائی اپنے بارے میں مسلمان ہونے کا فتویٰ حاصل کرلیں اور ہم چپ رہیں۔

عدالت سے بہر حال صحیح فیصلہ حاصل کرنا چاہیئے، بحمد اللہ عدالتیں زندہ ہیں، سیاسی نٹ کھٹ ان کو نیچے اوپر کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انصاف بہر حال انصاف ہے، جج کسی مسئلہ کی تعبیر میں چوک سکتے ہیں لیکن ان کا فریضہ بہر حال ایک عبادت ہے۔ آپ عدالت سے رجوع کرتے رہیں، میرے دفتر کی مالی حالت متحمل نہ ہو جیسا کہ سرکار نے زبردست نقصان پہنچا کر خلل پیدا کر دیا ہے۔ تو بے شک میری بچیوں کا زیور بیچ کر اس مسئلہ کو عدالت میں جاری رکھیں کسی کا شرمندۂ احسان ہونے کی ضرورت نہیں، زیور پھر بن سکتا ہے لیکن ختم المرسلینی کا مسئلہ حکومت کی مداخلت فی الدین سے خراب ہو گیا تو اسلام کے لئے بڑی مشکلیں پیدا ہو جائیں گی۔ جو لوگ ہمارے مخالف ہیں ایک دفعہ چھوڑ کر سو دفعہ مخالفت رہیں انہیں پرکاہ وقعت نہ دیں۔ ہمارا اللہ ہمارے ساتھ ہے، میری سب سے بڑی دولت یہ ہے کہ اہل اللہ میرے جیسے

فقیر و عاصی کے لئے دعائیں کر رہے ہیں، مجھے دنیا داری کی ضرورت نہیں، حضرت دین پوری مدظلہ کا خط آیا ہے، فرماتے ہیں تمہارے لئے حضور فداہ ابی و امی، بھی اللہ کے ہاں دعا کرتے ہوں گے میں نے پڑھا تو کانپنے لگا۔ اب اس کے بعد مجھے کس چیز کی ضرورت رہ جاتی ہے؟ طارق سلمہ، بشیر سلمہ، نذیر سلمہ کو سلام بچوں کو دعا،

شورش کاشمیری

۸ نومبر کو سپریم کورٹ نے حکومت کی اپیل مسترد کی، ۲۹ نومبر کو مسٹر جسٹس بشیر الدین اور مسٹر جسٹس شوکت علی نے پانچ مختلف درخواستوں کی سماعت کی، ان میں دو حکومت اور تین بیگم شورش نے دائر کی تھیں۔

۱۔ حکومت کی ایک درخواست تو یہ تھی کہ شورش کاشمیری کے مقدمہ کی سماعت لاہور کے بجائے کراچی میں ہو، فاضل ججوں نے منظور کر لی۔

۲۔ دوسری درخواست وکیل صفائی کی فیس اور دیگر اخراجات پر نظر ثانی کے لئے تھی جس میں ایڈووکیٹ جنرل نے ڈیفنس کونسل کی فیس وغیرہ کم کرنے کے لئے کہا تھا، فاضل ججوں نے اس کا فیصلہ کرتے ہوئے لکھا کہ آغا شورش کاشمیری نہ تو ملزم ہیں اور نہ انہوں نے خود درخواست کی تھی کہ ان کے لئے وکیل صفائی کا انتظام کیا جائے بلکہ حکومت نے لاہور کے بجائے کراچی میں سماعت کی خواہش کی اور خود رضاکارانہ طور پر پیش کش کی کہ اس صورت میں وہ وکیل صفائی کی فیس کے علاوہ دیگر اخراجات بھی برداشت کرے گی۔ حکومت کی اس یقین دہانی پر مقدمہ کراچی منتقل کیا گیا۔ فاضل ججوں نے مزید لکھا کہ سپریم کورٹ میں حکومت کی طرف سے مسٹر اے آر چنگیز پیش ہوئے تو انہیں دس ہزار فیس کے علاوہ دو ہزار روپیہ یومیہ دیئے گئے۔ ہم نے مسٹر رضوی سے پوچھا انہیں مسٹر چنگیز کے برابر فیس دی جائے تو وہ قبول کر لیں گے؟ انہوں نے وہ فیس قبول کر لی بلکہ یقین دلایا کہ وہ

۲۲ ہزار سے زائد فیس نہیں لیں گے۔ البتہ اعلیٰ درجہ کے ہوٹل میں ان کے قیام اور دوسرے اخراجات کی رقم حکومت ادا کرے گی۔

۳۔ فاضل ججوں نے بیگم شورش کی یہ درخواست منظور کر لی کہ رٹ کی باقاعدہ سماعت ۱۶ دسمبر سے ۱۹ دسمبر تک اس کے بعد ۱۳ جنوری ۱۹۶۹ء سے تا اختتام مقدمہ ہو۔ حکومت نے صفائی کے وکیل کی فیس اور گواہوں کے اخراجات کا تخمینہ ساٹھ ہزار روپیہ عدالت عالیہ میں جمع کرا دیا لیکن ایڈووکیٹ جنرل کی معرفت درخواست گزاری کہ ان اخراجات پر نظر ثانی کی جائے کیونکہ پنجاب فنانشل رولز کے مطابق ملزم کے وکیل صفائی کی فیس زیادہ سے زیادہ پچاس روپے ہے، دیوانی میں دو سو روپیہ خاص مقدمہ میں ایک ہزار روپیہ۔ بنچ نے حکومت کا یہ موقف تسلیم نہ کیا۔ حکومت کا فرض تھا وہ بتاتی کہ ایڈووکیٹ جنرل کے علاوہ دوسرے سرکاری وکلاء اور ان کے یاجوج ماجوج کو کیا دیا گیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی آنکھ کا پانی مر چکا تھا۔

حکومت کے دانشوروں نے تین چار دن پہلے تعویق و التوا کا ایک اور ہتھکنڈا استعمال کیا، مسٹر جسٹس فضل اکبر، چیف جسٹس ریٹائر ہو چکے تھے، جسٹس حمود الرحمٰن، جسٹس سجاد احمد جان اور جسٹس عبد الستار نے اس ہتھکنڈے کو خارج کر دیا، درخواست یہ تھی کہ اخراجات اور گواہوں پر نظر ثانی کی جائے۔ یعنی وکیل صفائی کے اخراجات کم کئے جائیں۔ اور گواہوں کی فہرست مسترد کر کے صرف ان کے حلفی بیان لئے جائیں۔ اب قانون و انصاف کی سب سے بڑی ملکی عدالت میں استرداد کے بعد حکومت کسی اور داؤں کی تلاش میں تھی اور یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا تھا کہ بعض سخنہائے ناگفتنی بھی عدالت کے ریکارڈ پہ آنے کا اندیشہ تھا، اسے فکر تھی کہ اس کے نگار خانے کی بھولی بھالی صورتوں کے مصنوعی حسن کا غازہ دھل جائے گا۔

آخر، ۷ ماہ اور ۱۰ دن کے التوا، انتظار اور تعاقب کے بعد سندھ ہائی کورٹ

کی بالائی منزل کے پرشکوہ چیمبر میں سماعت شروع ہوئی، ۱۶ دسمبر صبح ساڑھے آٹھ بجے مسلح پولیس کی ایک بہت بڑی جمعیت مجھے سول ہسپتال سے ہائی کورٹ لے گئی۔

ہائی کورٹ میں احباب کا ایک بڑا مجمع تھا بہت سے دوست پنجاب سے آئے تھے ان سے کوئی سات ساڑھے سات ماہ بعد ملاقات ہوئی، چیمبر کھچا کھچ بھر گیا۔ میں انہی میں مل جل کے بیٹھ گیا۔

دونو باوقار جج چیمبر میں داخل ہوئے تو سب لوگ احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کاروائی شروع ہوئی — حکومت کی ٹیم شریف الدین پیرزادہ اور ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر کے جلو میں موجود تھی۔ راجہ صاحب کبھی حسین شہید سہروردی اور راجہ حسن اختر کی وجہ سے اپوزیشن میں حصہ لیتے رہے اور اس وجہ سے کچھ تعارف بھی تھا۔ لیکن اب جیسے جان نہ پہچان۔ وہ ہر چیز بھول کر نوکری کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ دو اور صورتیں دیکھ کر تعجب ہوا لیکن ان کا جواب صرف خندۂ استہزا تھا سیاسی کردار اور شخصی سیرت بڑی مدت میں پیدا ہوتی ہے اور وہ بھی ہر شخص میں نہیں۔ خال خال لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس مسٹر ولادر محمود بار ایٹ لار (اب ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل پنجاب) پر تھا ہمارے حلقہ احباب میں انقلابی خیالات کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے لیکن اب اس سرکاری ڈرامہ میں حصہ لینے چلے آئے اور آنکھ ملاتے ہوئے شرماتے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی تھے شورش کاشمیری خوش تھا کہ اس نے ان کے لئے سرکاری خزانہ سے آب و دانہ مہیا کیا ہے۔

مسٹر مسعود نبی نور ہوم سیکرٹری کی شہادت شروع ہوئی، انہوں نے میری نظربندی سے متعلق دفتری کاروائی اور گرفتاری تک کے واقعات بیان کئے اور بتایا کہ گورنر نے کن حالات میں نظربندی کے احکام جاری کئے تھے۔

راجہ سید اکبر اڑچن ڈالنے کی فکر میں تھے ہمارے ہر سوال پر کوئی مہمل یا غیر مہمل نکتہ اٹھاتے۔ ارادہ ان کا یہ تھا سماعت رک جاتے اور وہ کسی رولنگ کی آڑ لے کر پھر سپریم کورٹ میں جائیں۔

راجہ صاحب کے اعتراضات سے محسوس ہوتا تھا کہ حکومت کا صرف رد پیہ دو چیزوں پر اٹھ رہا ہے اولاً احمد سعید کرمانی، ثانیاً قادیانیت، ان دونوں چیزوں کا ذکر آتے ہی راجہ صاحب کھڑے ہو جاتے اور نکتہ داغتے ــــــ میں نے ان سے آنکھیں چار کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ آنکھیں چرا کے بیٹھے تھے۔

میں نے احمد سعید کرمانی کے ناگوار موضوع کو محسوس کرتے ہوئے عدالت سے استدعا کی مائی لارڈز! راجہ صاحب ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش کرتے ہیں، احمد سعید کرمانی کو عدالت میں طلب کر لیا جائے اگر وہ آجائیں اور مجھ سے آنکھیں ملا کر میرے سوالات کا جواب دیں تو میں سب گواہ چھوڑ دوں گا تب عدالت جو فیصلہ بھی دے گی مجھے قبول ہوگا۔ میری خواہش ہے کہ راجہ صاحب مان جائیں"۔

راجہ صاحب نے تسلیم کیا کہ بغرض شہادت عدالت میں طلبی پر کسی وزیر کو دستوری تحفظ نہیں لیکن اٹارنی جنرل فوراً کھڑے ہو گئے انہوں نے استدعا کی کہ وہ دستور کی دفعہ ۱۷ کے بارے میں دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کی کاروائی میں وزیر کو طلب کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں دو دن کی مہلت دی جائے، عدالت نے منظور کر لی۔

اگلے روز ۷ دسمبر کو بھی راجہ صاحب نے اپنا معمول جاری رکھا اور کچھ تیز ہو گئے، اجلاس شروع ہوتے ہی درخواست گزاری کہ مسٹر جمیل حسین رضوی ہائی کورٹ کے جج رہ چکے ہیں وہ پیش نہیں ہوں گے۔ عدالت نے اعتراض بعد از وقت قرار دیا اور درخواست مسترد کر دی۔

اسی طرح ڈیلی نیوز (۶۸-۲-۱۶) سے متعلق توہینِ عدالت کے الزام میں درخواست گزاری کہ اس میں گزشتہ روز کی عدالتی کاروائی کے محذوف حصے چھاپے گئے ہیں عدالت نے اس موقف سے اتفاق نہ کیا لیکن ایڈووکیٹ جنرل کے اصرار پر مزید غور کرنے کے لئے اگلے دن کی تاریخ ڈال دی۔ میرزائیت کے متعلق کئی ایک باتیں زیرِ بحث آئیں۔ راجہ صاحب نے اس عذر پر اشاعت رکوا دی کہ اس سے فرقہ ورانہ احساسات مجروح ہونے کا اندیشہ ہے۔

میں نے عدالت میں تین کتابیں پیش کیں ایک

اقبال کے افکار وخیالات **(Thoughts and Reflections of Iqbal)**

مرتبہ سید عبدالواحد معینی۔

دوسری۔ انوارِ اقبال ـــــ مرتبہ بشیر احمد ڈار

ان دونوں کتابوں میں علامہ اقبال کے میرزائیت کے بارے میں واضح افکار موجود تھے کہ قادیانی محمد عربیؐ کی امت سے ایک الگ امت ہیں۔

تیسری کتاب کے مترجم ومرتب چودھری محمد ظفر اللہ خان تھے جس میں انہوں نے مسلمانوں سے الگ ملت ہونے کا اعتراف کیا اور انہیں اہل کتاب کے زمرہ میں رکھا تھا۔

راجہ صاحب اقبال کے حوالوں پر اعتراض کرتے کھڑے ہوئے تو فرمایا۔

میرزائی مسلمانوں میں سے ہیں۔

جسٹس بشیرالدین نے پوچھا کون کہتا ہے؟

راجہ صاحب نے کہا۔

"ہائی کورٹ کا فیصلہ ہے"

"کس ہائی کورٹ کا؟"

"اسی ہائی کورٹ کا، چٹان کے ڈیکلریشن کی اپیل میں"

ہم اس فیصلہ کے پابند نہیں ہیں جسٹس بشیرالدین نے جواب دیا۔

اور راجہ صاحب بیٹھ گئے لیکن وہ جان گئے کہ ان کی بیل منڈھے نہیں چڑھے گی کیونکہ وہ قانون، انصاف اور عقائد کے مسلمات پر کلوخ اندازی کر رہے ہیں۔

ہوم سیکرٹری نے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ تقریر کا مسودہ سپیشل برانچ نے انہیں ۷ مئی کو ایک بج کر ۳۵ منٹ پر بھجوایا، اسی دن کاغذات لاء ڈیپارٹمنٹ کو بھیجے گئے اور لاء سیکرٹری کی رائے حاصل کی گئی اس پر میں نے اپنا نوٹ لکھا، پھر وہ کاغذات چیف سیکرٹری کے پاس گئے، صوبائی وزیر داخلہ اور گورنر کو اسی شام پیش کئے گئے۔

چھ بجے شام فائل چیف سیکرٹری کے گھر میں گئی، انہوں نے ہوم منسٹر کو بھجوائی اور میں خود لے کر گیا وہاں بیس منٹ ٹھہرا، گورنر کے ہاں پہنچا۔ گورنر نے ساڑھے آٹھ بجے سے نو بجے شب کے درمیان نظر بندی کے احکام جاری کئے۔ گورنر ہاؤس ہی سے میں نے اپنے ڈپٹی سیکرٹری مسٹر عثمانی کو فون کیا کہ وہ دفتر پہنچیں۔ میں دفتر پہنچا اور انہیں ضروری ہدایات کیں اسی رات نظر بند کو پکڑ لیا گیا۔"

شریف الدین پیرزادہ سے میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا اسی دن ملا، ان کا بیان تھا کہ وہ دو روز کی مہلت لے کر میری رہائی کے لئے حکومت پر زور دے رہے اور اس طرح حکومت کو رسوائی سے بچانا چاہتے ہیں۔ احمد سعید کرمانی

ا۔ واضح رہے صوبائی سیکرٹریٹ پونے دو بجے بند ہو جاتا ہے ذرا انصاف پسندوں کی عجلت کاریاں ملاحظہ ہوں۔

بھی اسی طرح محفوظ ہو سکتا تھا لیکن دو دن کا "وقفہ" ایک نئے ڈرامہ کا منتظر تھا۔

۱۸ دسمبر کو لوگ کچھ زیادہ ہی بھتے میں کمرہ عدالت کی طرف جا رہا تھا تو مشہور ورکنگ جرنلسٹ مسٹر حبیب الرحمٰن[1] نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ آج کچھ نہیں ہوگا بس ایک ڈرامہ ہوگا اور وہ بھی جیند منٹ کا آخری سین، میں جانتا تھا حبیب الرحمٰن باخبر آدمی ہے اور وہ اس قسم کی باتیں ڈھونڈھ لیتا ہے، سرکاری وکلا میں کوئی ایسا نہ تھا جو خود کوئی فیصلہ کرتا، لاہور سے ہدایات لی جائیں اور جو گورنر کہتا وہی ہوتا۔

میرے پاس حکومت کے بھیدی عموماً آتے اور بہت کچھ بتا جاتے، گذشتہ رات گیارہ بجے ایک ذمہ دار افسر مجھے بتا گئے تھے کہ آج سماعت کے بعد بنچ کو اتھل پتھل کرنے کی کوشش ہوتی رہی، یہ چاہا گیا کہ شیخ شوکت علی خود ہی الگ ہو جائیں لیکن حکومت کامیاب نہ ہو سکی، شیخ شوکت علی ڈٹے رہے وہ اس انتظار میں تھے کہ حکومت کیا وار کرتی ہے؟

دونوں جج کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے تو بہت زیادہ سنجیدہ تھے، شریف الدین پیرزادہ کو بحث کرنی تھی لیکن وہ بحث کے سروسامان سے خالی آئے تھے۔ راجہ سید اکبر بھی سید اکبر کے انداز میں بیٹھے تھے۔

جسٹس شوکت علی نے ۱۶ اور ۱۷ دسمبر کے احکام پڑھ کے سنائے جس کے متعلق ایڈووکیٹ جنرل نے کہا تھا کہ وہ ابھی تک اس کے علم میں نہیں ہیں جسٹس شوکت علی نے ۱۶ دسمبر کو ۱۲ بجے دن مقدمہ کے ریکارڈ میں لکھوایا کہ

گیارہ بج کر ۱۰ منٹ پر میں اور جسٹس بشیر الدین چیمبر سے کورٹ روم میں

---

[1] آج کل دارالحکومت میں کراچی کے ایک ہفتہ وار کے مکتوب نگار ہیں۔

جا رہے تھے کہ مسٹر دلاور محمود اور شرف فریدی مجھ سے ملے اور کہا کہ ایڈووکیٹ جنرل اور وہ دونوں روزہ سے نہیں ہیں انہیں چائے پینی ہے لہذا مقدمہ ساڑھے گیارہ بجے سنا جائے۔ ذرا پہلے جسٹس بشیر الدین غسل خانے میں گئے تھے میں نے دونوں وکلاء سے کہا کہ وہ یہ استدعا جسٹس بشیر الدین سے بھی کریں وہ اس بینچ کے سنیئر جج ہیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہم دونوں رضا مند ہو گئے۔ کاروائی شروع ہوئی تو ایڈووکیٹ جنرل نے دو درخواستیں پیش کیں۔

ایک درخواست یہ تھی کہ نظر بند کے وکلا مسٹر جمیل حسین رضوی اور مسٹر یوسف علی خان کے بیانات قلمبند کئے جائیں درخواست میں چیف جسٹس پاکستان سے منسوب ایک بیان کا ذکر تھا ہم نے ان کے بیانات درخواست کی پشت پر لکھ لئے، دوسری درخواست میں جسٹس شوکت علی کے متعلق کہا گیا کہ فاضل جج نے بعض حقائق کے بارے میں ایڈووکیٹ جنرل کو غلط بیانی کا مرتکب قرار دیا اور کہا ہے کہ مسٹر جسٹس جمیل حسین رضوی کی فیس سے متعلق سپریم کورٹ میں اس نے جھوٹ بولا ہے اس کو اندیشہ ہے کہ ہم اپنے فائنل احکام میں اس کا ذکر کریں گے معلوم ہوتا ہے کہ میسرز دلاور محمود اور شرف فریدی نے آدھ گھنٹہ کی جو مہلت لی تھی یہ درخواستیں اسی دوران میں تیار کی گئیں۔ ایڈووکیٹ جنرل نے درخواست میں بعض غلط بیانیاں کی تھیں انہیں درستی کے لئے کہا گیا انہوں نے کچھ درست کر دیں۔ لیکن ان کا رویہ تمام تر نازیبا تھا۔

میں نے ان سے بالصراحت کہہ دیا کہ وہ ٹھیک ٹھیک بیان کریں کہ انہوں نے آج عدالت میں تسلیم نہیں کیا کہ آئین، عدالت میں بطور گواہ حاضری سے وزراء کو استثنیٰ کا تحفظ نہیں دیتا لیکن ایڈووکیٹ جنرل کا رویہ شایان شان نہ تھا۔ ایڈووکیٹ جنرل نے مزید کہا کہ انہوں نے سپریم کورٹ میں ایسی کوئی بات نہیں

کی جو ۱۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کے فیصلہ میں شامل کی گئی ہے، اٹارنی جنرل نے اس مرحلہ میں استدعا کی کہ کل تک مقدمہ ملتوی کر دیا جائے تاکہ وہ اس بارے میں پڑتال کر سکیں۔

دوسرا نوٹ بھی جسٹس شوکت علی نے ۱۷ دسمبر ہی کو لکھوایا۔

آج جب ہوم سیکرٹری پر جرح جاری تھی اس وقت اٹارنی جنرل، ایڈووکیٹ جنرل اور ان کے نائبین موجود تھے، فاضل ایڈووکیٹ جنرل نے اعتراض کیا کہ مسٹر جمیل حسین رضوی ہائی کورٹ کا سابق جج ہونے کی وجہ سے اس کورٹ میں پیش نہیں ہو سکتے، بنچ نے اعتراض مسترد کر دیا۔ پھر ایڈووکیٹ جنرل نے متعدد بار نظر بند کی طرف سے سوالات پر اعتراض کیا اور ہر دفعہ کورٹ کا رولنگ چاہا یہ ایڈووکیٹ جنرل کے رویہ کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ مقدمہ کی کاروائی میں اڑچن ڈالنا چاہتے تھے۔ بدنیتی (Mala Fides) کے بارے میں انہوں نے ایک طویل تقریر کی، مسٹر پیرزادہ نے بھی اپنے دلائل دینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اور استدعا کی کہ اجلاس کل پر ملتوی کر دیا جائے جو منظور کر لی گئی۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ مقدمہ کی کاروائی میں ایڈووکیٹ جنرل کا رویہ عدالت سے شائستہ نہیں تھا اور نہ ماحول خوشگوار تھا۔ افسوس کہ اس ضمن میں ایڈووکیٹ جنرل کے متعلق میرا کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوا ہے"۔

یہ دونوں نوٹ سُن کر راجہ سید اکبر نے جسٹس بشیر الدین سے پوچھا کہ آپ بھی ان احکام سے متفق ہیں، جسٹس بشیر الدین نے اثبات میں جواب دیا ——— راجہ صاحب بلا جھجھک بول اُٹھے کہ کورٹ کا رویہ مخالفانہ (BiASED) ہے، جسٹس بشیر الدین نے پوچھا آپ کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں، راجہ صاحب نے ہلے ہوئے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"دونوں کے"

عدالت میں ایک سناٹا چھا گیا، تمام لوگ حیران رہ گئے کہ عدالت عالیہ کی توہین۔ ایڈووکیٹ جنرل کے ہاتھوں، میرا خیال تھا آنریبل کورٹ راجہ صاحب کو توہین عدالت کے جرم میں وہیں سزا دے گی اور وہ شاید آج کی رات سنٹرل جیل کراچی میں گزاریں گے لیکن فاضل ججوں نے اس جسارت پر بھی اپنے کوہ وقار ہونے کا اعلان کیا۔

جسٹس بشیر الدین نے اسی وقت فیصلہ کے پیرا دو میں لکھوایا۔

پچھلے دو دن کے احوال و کوائف اور ایڈووکیٹ جنرل کے اس اظہار سے کہ یہ بنچ ان کے خلاف (biased) ہے۔ بنچ اس مقدمہ کی سماعت سے دستبردار ہوتا ہے۔

بس ایک لحظہ کے لئے سرکاری ٹیم کا چہرہ کھل گیا لیکن سیکڑوں لوگوں پر پژمردگی چھا گئی میں نے عدالت میں کھڑے ہو کر دونو جج صاحبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مائی لارڈز! ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت عالیہ کی توہین کی ہے اس کو جیل بھیجا جائے میرا فیصلہ اب یہی بنچ کرے گا مجھے اس بنچ پر پورا پورا اعتماد ہے۔ اور اس کے ہاتھوں ہر سزا منظور ہے، میرے مقدمہ کو وکلاء کی سرکاری ٹیم آج تک حیلوں اور بہانوں سے خراب کرتی رہی ہے۔ اگر اس بنچ نے اس خوفناک جسارت سے اپنی عزت کو محفوظ رکھنے کے لئے میرے مقدمہ کی سماعت نہ کی تو میں تا موت بھوک ہڑتال کا اعلان کرتا ہوں۔ عدالت و انصاف کی آبرو کے لئے میں جان دے دوں گا۔"

دونو جج صاحبان کھڑے ہو چکے تھے ان کے چوبداروں نے قدم بڑھائے اور جج چیمبر سے نکل گئے۔ میں نے اس بری طرح سرکاری وکلاء کی خبر لی کہ ان کا

رنگ پیلا پڑ گیا چہرے لٹک گئے وہ چیمبر میں پناہ ڈھونڈھتے پھرتے تھے اور ہائی کورٹ کا چیمبر شاید پہلی دفعہ ایوب شاہی مردہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ پولیس حیران کھڑی تھی ایک انسپکٹر پولیس نے مجھ سے کہا آئیے اب چلتے ہیں، میں نے کہا اپنی مرضی سے جاؤں گا ـــ سینہ کھول دیا اور کہا ـــ گولی مارو۔

ہائی کورٹ مظاہرہ گاہ ہو گیا وہیں کسی نے بتایا کہ راجہ صاحب کوٹھے پر چڑھ کے چھپ گئے ہیں بہرحال وہ بلاغت و فصاحت کے انوار سمیٹ کر فقرہ ہو گئے تھے۔

مسٹر مسعود نبی نور، لاء اینڈ آرڈر کے سیکرٹری کی حیثیت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے انہوں نے مجید نظامی کو ڈھونڈنا شروع کیا لیکن مجید نظامی جا چکے تھے۔ روایت یہ بیان کی گئی کہ وہ ان کی معرفت اگلی صبح رہا کر دینے کا وعدہ کرنا چاہتے اور خواہاں تھے کہ بھوک ہڑتال نہ کروں۔ میں فیصلہ کر چکا تھا، مجید نظامی جا چکے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل فوراً ہی میرے پاس ہسپتال آ گئے اور بتایا کہ آپ کل تک رہا ہو جائیں گے۔ مجید نظامی کی تلاش جاری ہے میرا ذہن یہ بن چکا تھا کہ حکومت جھوٹ بولتی ہے وہ افسروں کو استعمال کرنے کی عادی ہے صبح تک جانے کہاں پہنچا دے، ڈیرہ اسمٰعیل خان یا مچھ یا کسی اور دور افتادہ جگہ مجھے یہی بتایا گیا۔

اور میں اس پر یقین رکھتا تھا مگر میری بھوک ہڑتال سے حکومت کا نقشہ بگڑ گیا اور اس نقشہ کی خرابی کو شام کے اخبارات نے پکا کر دیا۔

ڈیلی نیوز کی آٹھ کالمی افتتاحی سرخی تھی

(Hunger strike threat by Shorish. High Court Bench retires from hearing)

شورش کاشمیری کی طرف سے بھوک ہڑتال کی دھمکی۔

ہائی کورٹ کا بینچ سماعت سے سبکدوش ہو گیا۔

لیڈر کراچی کی ہشت کالمی افتتاحی سرخی تھی۔

(Stormy scenes at Shorish Trial. Advocate General's Interperate Remarks)

شورش کے مقدمہ کا شورش انگیز منظر
ایڈووکیٹ جنرل کے شدید ریمارکس

کراچی سے جتنے اخبار بھی شام کو نکلتے تھے ان میں اس خبر کی اشاعت نے حکومت کے وقار کو تہہ و بالا کر دیا۔ صبح کے اخبارات سے پورا ملک گونج اٹھا۔ غیر ملکی وقائع نگاروں نے حکومت کے ہاتھوں توہین عدالت کی اس خبر کو اپنے ہاں فوراً بھجوا دیا۔ یہ اخبارات پر اس کنٹرول کے خلاف پہلا جھرنا پھوٹا تھا جس بے لگام اشہب کی باگ ڈور انفرمیشن ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھ میں تھی۔

روزنامہ جنگ کراچی، ملک کے اخباروں میں حکومت کی ناراضی مول لینے کا عادی نہیں لیکن اس نے بھی ۱۲ دسمبر کے شمارے میں بڑے رکھ رکھاؤ سے ذیل کا اداریہ لکھا۔

حیرت انگیز واقعہ

اس ملک کی یہ سب سے بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہاں کی عدلیہ انتہائی ایماندار دیانتدار با اصول اور قانون کے مزاج کا پورا اور گہرا احترام کرتی ہے اور قانون کی روح کے اتباع کے بارے میں اس معیار کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے جس پر یہ ملک بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ عدلیہ کے اس عظیم کردار کے پیش نظر پاکستان کا وقار اور احترام ساری دنیا میں قائم ہو گیا ہے۔ اور ادھر ملک کا ہر طبقہ عدلیہ کی طرف پورے اعتماد کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ اعتماد جو عدلیہ نے حاصل کیا ہے اس ملک کے لئے ایک سرمایہ ہے جس پر اس ملک کا ہر شخص اپنا سر

فخر سے بلند کر سکتا ہے۔ عدلیہ کے اس کردار کی تازہ ترمثال مغربی پاکستان ہائی کورٹ کی اسپیشل بنچ کا وہ فیصلہ ہے جو اس نے آغا شورش کاشمیری کے مقدمے کی سماعت کے بارے میں دیا ہے۔ جونہی سرکاری وکیل نے اسپیشل بنچ کے روبرو یہ خیال ظاہر کیا کہ اسپیشل بنچ ایڈووکیٹ جنرل سے تعصب برت رہی ہے عدالت نے اعلان کر دیا کہ وہ اس مقدمے کی سماعت سے دست بردار ہوتی ہے۔ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ جب عدالت میں اس نوع کے خیال کا اظہار کر دیا جائے تو پھر جج صاحبان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ مقدمے کا فیصلہ دینے سے اجتناب برتیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مقدمے کی سماعت سے دست بردار ہو گئے۔ اس طرح اسپیشل بنچ کے محترم اور فاضل ارکان نے اپنی دیانت داری اور احترام قانون کی وہ مثال پیش کر دی جس پر عدلیہ کے تمام ارکان فخر کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن اس واقعہ میں جو پاکستان کی تاریخ میں اپنے قسم کا سب سے عجیب اور انوکھا واقعہ ہے یہ بات محض ناقابل تصور ہے کہ اس کا رونما ہونا کیونکر ممکن ہو سکا۔ اس واقعے کے جس کے نتیجے میں فاضل عدالت نے مقدمہ کی سماعت سے دست برداری کا اعلان کیا دو پہلو ہیں۔ پہلا پہلو اسپیشل بنچ کے فاضل ججوں کی اس دیانت اور قانونی احترام سے تعلق رکھتا ہے جس کا اظہار انہوں نے جانبداری کا الزام لگتے ہی کیا کہ مقدمے کی سماعت سے دست برداری کا فیصلہ دے دیا اور دوسرا پہلو وکیل سرکار کے طرز عمل سے متعلق ہے۔ جس پر عدالت نے مذکورہ فیصلہ کیا۔ سوال یہ ہے کہ وکیل سرکار نے کوئی ایسا رویہ کیوں کر اختیار کیا جس کی بنا پر عدالت کو یہ قدم اٹھانا پڑا۔ پھر رویہ بھی ایسا جس کی بابت فاضل عدالت کو اپنے فیصلے میں یہ کہنا پڑا کہ "یہ کہا جا سکتا ہے کہ کارروائی کے دوران ایڈووکیٹ جنرل کا عدالت کے بارے میں طرز عمل مودبانہ نہیں تھا اور عدالت کا ماحول خوشگوار نہیں تھا۔" فاضل جج نے اپنے فیصلے میں مزید

لکھا ہے کہ "اس تمام کارروائی میں ایڈووکیٹ جنرل کے طرزِ عمل کے متعلق میں نے بُرا تاثر قائم کیا ہے"۔ گویا فاضل عدالت نے مذکورہ مقدمہ نہ سننے سے متعلق جو فیصلہ کیا ہے وہ ایڈووکیٹ جنرل کے طرزِ عمل کی بنا پر کیا ہے۔ کوئی شبہ نہیں فاضل عدالت کا اس مقدمے کو نہ سننا صحیح تھا جب کہ جانبداری کا الزام لگ گیا تھا لیکن ایڈووکیٹ جنرل کی طرف سے جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا اور جس کی شکایت محترم عدالت نے کی وہ انتہائی سنگین واقعہ ہے۔ اور اپنی قسم کا بالکل غیر معمولی۔ حیرت ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل نے ایک ایسی بات کیوں کی جو اس ملک کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے اور جسے آسانی سے نظر انداز کر دیا گیا تو اس کے بڑے سنگین نتیجے برآمد ہوں گے۔ عدالت عالیہ میں مؤدبانہ طرزِ عمل اختیار نہ کرنا بجائے خود ایک جرم ہے اور اس جرم کا ارتکاب ایڈووکیٹ جنرل سے سرزد ہو۔ یہ بات محض ناقابل تصور ہے اس تمام قضیے میں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل نے جو رویہ اختیار کیا اور جسے عدالت نے غیر مودبانہ خیال کیا اصولاً اس پر ایڈووکیٹ جنرل کو معافی مانگنی چاہیئے تھی لیکن اس کے برعکس انہوں نے عدالت پر جانبداری کا الزام لگایا۔ عدالت نے تو جانبداری کے الزام پر قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے مقدمے کی سماعت سے دست برداری اختیار کر لی مگر ایڈووکیٹ جنرل نے کیوں اس وقت معافی مانگنے کے بجائے جانبداری کا الزام لگانا مناسب خیال کیا یا ایسا الزام لگانے کی جسارت کی اس طرح یہ واقعہ اپنے قسم کی ایک محض عجیب اور ناقابل فہم صورت حال ہے اور اس لئے یہ ضروری ہے کہ وزارت قانون اس بھاری ذمہ داری کو فوراً محسوس کرے جو اس قضیئے کی وجہ سے اس پر عائد ہو گئی ہے اور اس بارے میں موثر کردار انجام دینے میں بالکل تاخیر نہ کرے۔ ہم وزارت قانون کو پرزور مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس سنگین تر معاملے میں اپنی ذمہ داریاں انجام دینے میں تساہل نہ برتے ورنہ

اگر اس جیسے مسئلے کو خاطر خواہ اہمیت نہ دی گئی تو عدالت کی تاریخ میں ایک ایسی سنگین کوتاہی کا جرم اس قوم سے سرزد ہو جائے گا جس پر ہم سب کے سر شرم وندامت سے جھک جائیں گے۔ ہمیں پختہ یقین ہے جلد ہی وزارت قانون اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی اور جو سنگین ترین واقعہ عدلیہ کی پوری تاریخ میں پہلی بار رونما ہوا ہے اس کے انسداد کے لیے مؤثر اقدامات کرے گی۔ وزارت قانون پر اس باب میں بہت بڑی ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں جن سے ہمیں اُمید ہے وہ عہدہ برا ہو گی اور اس سانحے کو خاطر خواہ اہمیت دینے میں تساہل نہ برتے گی"۔

——میں نے بنچ کی سبکدوشی کے فوراً بعد ہسپتال پہنچ کر چیف جسٹس کے نام تار دیا کہ ایڈووکیٹ جنرل نے ہائی کورٹ کی توہین کی ہے اس کے خلاف کارروائی ہونی چاہیئے میرا مقدمہ یہی بنچ جاری رکھے بصورت دیگر میں نے عدالت کی آبرو کے لئے جان کی بازی لگا دی ہے۔

جسٹس وحیدالدین احمد چیف جسٹس نے اسی شام جسٹس انوارالحق اور جسٹس عبدالقادر شیخ پر مشتمل ایک نیا بنچ مقرر کر دیا اور ساتھ ہی ۹ جنوری ۱۹۶۹ء کی تاریخ مقرر کر دی —— گویا اور ۱۲ روز

مجھے اسی رات نئے بنچ کی اطلاع دی گئی میں نے سرکاری قاصد سے کہا، اب تیر کمان سے نکل چکا ہے، ایڈووکیٹ جنرل بالارادہ توہین عدالت کرے حکومت اس کی پشت پناہ ہو اور میں انصاف سے محروم ہو جاؤں یہ جرم تو بڑے سے بڑے سیاسی مقدمہ میں انگریزوں نے بھی نہیں کیا تھا —— اب حکومت جھکے گی یا میں ختم ہو جاؤں گا ؎

یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

○

موت سے واپسی

۱۸ دسمبر کی صبح کو دن کے دس بجے توہین عدالت کا سانحہ اور بنچ کی دستبرداری کا واقعہ
ہو گیا میں نے اُسی وقت بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اگلی صبح حکومت کی طرف سے پیغام
ملا کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دو رہا ہو جاؤ گے، میں نے جواب دیا مجھے حکومت پر کوئی اعتبار
نہیں وہ مجھے مارنے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے اور میں نے جان دینے کی ٹھان لی
ہے۔ حکام میری ضد سے واقف نہ تھے، وہ تنگ آکر میری موت وحیات سے بے نیاز
ہو گئے معاملہ صدر یا گورنر کے ہاتھ میں تھا۔ سرحد سے لے کر سندھ تک مطالبہ شروع
ہو گیا کہ شورش کاشمیری کو رہا کرو، ادھر اپوزیشن کا شعلہ بھڑک کر جوالہ ہوا چاہتا تھا اُدھر
پشاور کے جلسہ میں بھی ہاشم نامی نوجوان نے صدر پر گولی چلا کر حکومت کو لرزا دیا تھا۔
ایک طالب علم راولپنڈی میں پولیس فائرنگ سے شہید ہو چکا تھا، مسٹر ذوالفقار علی
بھٹو اور ان کے بعض ساتھی پکڑے جا چکے تھے، اپوزیشن کی تمام جماعتوں نے متحد
ہو کر طبل جنگ بجا دیا، دن رات ایوب خان کے خلاف مظاہرے اور مجاہرے ہونے
لگے، میرا معاملہ حکومت کے لئے نظر انداز کرنے یا محلسرا میں بیٹھ کر پچا لینے کی چیز نہ تھا،
پنجاب میں اپوزیشن کے جلسے عوام کی طرف سے شورش کاشمیری کی رہائی کا مطالبہ بن
گئے تھے۔ ۱۹ کی شام کو ہسپتال میں جسٹس خمسانی (شاید نام بھول رہا ہوں) نے فون
کیا اور فرمایا کہ لاہور سے چیف جسٹس نے فون کیا ہے کہ میں آپ سے کہوں بھوک ہڑتال

چھوڑ دیں، ہائی کورٹ کا نیا بینچ بن گیا ہے، میں نے عرض کیا آپ ساری روداد سے واقف ہیں کہ ۹ مئی سے حکومت کیا کر رہی ہے، ابھی تک راجہ سید اکبر کو توہین عدالت میں ماخوذ نہیں کیا، میری بھوک ہڑتال حکومت کے خلاف عدالت کی آبرو کے لئے ہے۔ اب میرے لئے اس کا ترک کرنا مشکل ہے"۔

میری حالت یہ تھی کہ دو دنوں ہی میں صحت جواب ——————

دے گئی میں اس طرح گھلنے لگا جس طرح پانی میں نمک گھلتا ہے، ڈاکٹروں سے لیکر پولیس تک کسی کو حکومت سے کوئی ہمدردی نہ رہی، ملک کے ہر حصہ سے تار پہ تار آ رہے تھے کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دوں۔ دن میں سو ڈیڑھ سو تار ضرور آتے۔

میں نے پہلے ہی دن علاج روک دیا تھا، علاج کے اس مکمل بائیکاٹ سے ڈاکٹر اور نرسیں آزردہ ہو گئے اب دو یا تین گلاس پانی پہ جی رہا تھا، جیل اور پولیس کے اہلکار کسی لحظہ شدنی سننے کے لیے تیار تھے ادھر سی آئی ڈی کا سٹاف افسروں کو ہر لمحہ اطلاع دے رہا تھا وہ لوگ میری حالت اور ہمت سے بظاہر اس قدر متاثر تھے کہ جو رپورٹیں لاہور جا رہی تھیں اُن کا لب لباب بتا دیتے لیکن جو لوگ ملنے آتے ان سے بہ لطائف الحیل آتا پتا پوچھتے، کئی ملاقاتی انہیں جھکمہ دے جاتے، پتہ بتاتے تو غلط ہوتا لیکن یہ ایک مذاق تھا مجھے یقین ہو چکا تھا کہ موت بگٹٹ چلی آ رہی ہے بس دو چار دن یا زیادہ سے زیادہ ہفتہ عشرہ اور ہیں۔

مقامی اخبارات نے میری حالت کی خبریں اس دلیری سے دینی شروع کیں کہ کمشنر کراچی نے خطرہ کا الارم دے دیا۔ انہوں نے حکومت کو لکھا کہ جس تحریک کا کراچی میں نشان تک نہ تھا وہ پورے شہر میں موضوع بنی ہوئی ہے اور مذہبی لوگوں میں سخت ہیجان پھیل گیا ہے، ۲۲ کو عید تھی مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا محمد یوسف بنوری نے عید کی نماز میں میرے لئے دعا کرائی مولانا محمد انور میرے لئے ہر جمعہ میں آواز

اُٹھاتے تھے کئی دوست عید ملنے آئے تو رونے لگے۔ بچے لاہور میں تھے سرسان
کہاں تھا کہ یہاں آتے حکومت کا منشا بھی یہی تھا ـــــ کسی طرح بچوں کو معلوم ہو گیا
کہ چیف سیکرٹری نے تجویز کی ہے صوبہ کے موجودہ اور متوقع حالات کی خرابی کے پیش نظر
مجھے رہا کر دیا جائے۔ لیکن گورنر نے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے۔ روایت یہ تھی کہ مسٹر
ایس آئی حق چیف سیکرٹری نے گورنر کو لکھا ہے کہ صوبہ کے حالات بگڑتے جا رہے
ہیں۔ شورش کی حالت خراب ہو گئی ہے اور ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق کسی وقت
اس کے مرجانے کا اندیشہ ہے، ایسا ہوا تو لاء اینڈ آرڈر کا بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے
گا اور نتائج خراب سے خراب ہوں گے، لہذا شورش کو رہا کر دینا ہی بہتر ہے،
گورنر نے چیف سیکرٹری کے نوٹ پر الفاظ ذیل لکھ کر فائل واپس کر دیا

Let Bastured Die حرام زادے کو مرنے دو۔ موسیٰ کا تکیہ کلام کچھ ایسا ہی
تھا۔ کہا جاتا ہے مسٹر ایس آئی حق نے ۳۱۳ افسروں کی معطلی کے زمرہ میں اپنے متعلق
چارج شیٹ کے جواب میں لکھا ہے کہ میرے خلاف گورنر کی ناراضی کا نقطہ آغاز
یہی نوٹ تھا۔ میں نے شورش کے معاملہ میں گورنر سے اکثر اختلاف کیا اور وہ اس
سے ناراض ہو گئے تھے۔

میری بیٹیوں نے خاندان کی عورتوں کا جتھہ بنا کر گورنر ہاؤس پر صبح سویرے
چڑھائی کر دی اور مال روڈ کے صدر دروازہ پر زبردست مظاہرہ کیا۔ وہ مطالبہ کر رہی
تھیں گورنر موسیٰ کہاں ہیں، نکالو وہ کیسے بچوں کے ساتھ عید منا رہے ہیں۔ جب ہمارا
باپ ان کے غضب کی بدولت قید و بند میں بھوک ہڑتال سے مر رہا ہے وہ
کس طرح چین سے بیٹھے ہیں:

• پولیس کا رویہ ان سے انتہائی شریفانہ تھا، یہ مسعود نبی نور کا تدبر تھا کہ وہ بچوں
کو سمجھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور خان محمد اصغر خان ڈی ایس پی سول لائنز انہیں

پک اَپ میں بٹھا کر گھر چھوڑ گئے۔ وہ بچوں کو شرافت سے رام نہ کرتے تو بچے گرفتار ہو کر ٹلتے کہ وہ گرفتار ہونے ہی کے لئے گئے تھے۔

عید کے دن ہسپتال میں ایک تانتا لگا رہا، میں تھا کہ آواز گلے میں اٹک گئی، دائیں ہاتھ میں رعشہ تیز ہو گیا، غنودگی بڑھنے لگی، ہوش آتا تو دس پندرہ منٹ بعد پھر وہی بے ہوشی پنجے ڈالتی۔ ڈاکٹر دوائی دینے اور انجکشن لگانے کی کوشش کرتے لیکن میری مزاحمت کو میرے لئے خطرناک سمجھتے اور رک جاتے، عید سے اگلے روز ۲۳ دسمبر کو کراچی میں شام کے اخباروں نے پہلی شہ سرخی کے ساتھ خبر چھاپ دی کہ شورش کی نبضیں ڈوب رہی ہیں یہ خبر اس خفیہ رپورٹ سے اڑائی گئی جو اسی دن پروفیسر افتخار احمد نے حکومت کو لکھی اور ماتحت عملہ نے اخباروں کو بتا دی، مثلاً لیڈر کی شہ سرخی تھی۔

(Shorish's condition grave.
May Collapse any moment)

"شورش کی حالت نازک ہو گئی کسی ایک وقت ختم ہو سکتے ہیں"

چونکہ عید کی چھٹی کے باعث اگلی صبح کوئی اخبار نہیں نکلا تھا لہٰذا شام کے اخبارات میں یہ خبر چھپتے ہی جنگل کی آگ ہو گئی۔ دن کے اخبارات نے اس خبر کو طوفان بنا دیا۔

پروفیسر افتخار احمد نے اسی صبح ایک اور رپورٹ کی کہ بچنے کی امیدیں ختم ہوتی جا رہی ہیں آئندہ ۲۴ گھنٹے میں بھوک ہڑتال ختم نہ ہوئی تو پھر بچنا محال ہوگا۔ اگر ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر بھوک ہڑتال ختم ہو جائے تو بچنے کی امید کی جا سکتی ہے۔

ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ کی زیر صدارت لاہور کے جلسہ عام میں مقرروں نے حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ایسی سخت باتیں کیں کہ آمریت کا وقار خاک میں مل گیا۔ خبر سے برہم ہو کر بیگم سلیمان اختر دختر حسین شہید سہروردی، سول ہسپتال

آگئیں۔ انہوں نے شور مچا دیا کہ ہمارے بابا کے دوست کو قتل کرنا چاہتے ہو، ڈاکٹروں نے ان سے کہا کہ شورش اس وقت بے ہوش ہے اس کی حالت سخت نازک ہے آپ کمشنر کے پاس جائیں اسی دن (۲۸ دسمبر) کو صدر ایوب کسی کام سے کراچی پہنچ گئے گورنر بھی آگئے۔ وہ سید دربار علی شاہ کمشنر کراچی کو ایئرپورٹ ہی سے اپنے ساتھ لے گئے۔ ان سے صورت حال پوچھی۔

کمشنر نے کہا۔

۱۔ قادیانی مسئلہ کراچی میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔

۲۔ شورش کو پنجاب منتقل کر دیں جو چیز ہونے والی ہے وہاں ہو۔

۳۔ اگر شورش یہاں مرگیا تو اس سے تین خطرے ہیں۔

(ا) کراچی سے لے کر پنجاب تک طوفان برپا ہوگا۔

(ب) لاش یہاں دفنا دی گئی تو پورے شہر میں آگ لگ جائے گی اور فسادات ہونگے۔

(ج) لاش ورثار کے حوالے کی گئی اور وہ اس کو لاہور لے گئے تو سارا راستہ ہنگامے ہوں گے۔

گورنر نے پروفیسر افتخار احمد کو بلوایا انہوں نے بتایا کہ حالت غایت درجہ نازک ہو چکی ہے —— پوچھا وہ بھوک ہڑتال چھوڑ نہیں سکتا۔ پروفیسر نے جواب دیا "میں نے بہت کوشش کی ہے لیکن اس کے دماغ میں پتھر نہیں فولاد رکھا ہوا ہے وہ انتہائی ضدی آدمی ہے، اور آج تو اس نے پانی بھی چھوڑ دیا ہے۔

گورنر نے سید خالد محمود ڈپٹی کمشنر کو بلوایا، ڈاکٹروں کے ایک بورڈ کی تشکیل کا حکم دیا اور کہا "صبح سویرے رپورٹ کرو کہ اس کی حالت کس مرحلہ میں ہے"۔

وہ دوست جو دن رات وہاں رہ رہے تھے ان میں مولانا تاج محمود، حافظ عزیز الرحمٰن، مسٹر انور عارف، مسٹر محبوب احمد، مسٹر سعید احمد، مسٹر فرید احمد، اور کچھ

مقامی اعزہ تھے، تاروں پہ تار چلے آرہے تھے کوئی ایک ہزار تار مغربی پاکستان کے طول و عرض سے آچکے تھے، رات بارہ بجے تحریک جمہوریت کے تمام راہنماؤں کا ایک مشترکہ تار ملا کہ آپ قوم کا سرمایہ ہیں ہم صمیم قلب سے اپیل کرتے ہیں بھوک ہڑتال چھوڑ دو"
میں زندگی سے بیزار ہو چکا تھا۔ اور میرے لئے ایک طرح کا عالم نزع تھا۔

دوست میری نبض پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے تھے میرے لئے بولنا نہ بولنے کے برابر تھا صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے کوئی ساڑھے تین بجے حافظ عزیز الرحمٰن میرے پاس آئے اور کہا کہ انہیں ابھی ابھی لاہور سے حضرت دین پوری حضرت درخواستی اور دوسرے رفقاء نے فون کیا ہے کہ میں ان کی طرف سے پیغام دوں کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دو ہمارا حکم ہے۔

مجھ میں آواز ہی نہ تھی، وہ ابھی کہہ رہے تھے کہ بے ہوشی طاری ہوگئی۔ اذانِ فجر کے ساتھ آنکھ کھلی تو خواب دیکھ رہا تھا کہ حضرت پیر مہر علی شاہ علامہ انور شاہ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ کھڑے ہیں۔ ایک نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔
"شورش ڈٹے رہو آخری فتح تمہاری ہوگی"

صبح آٹھ یا نو بجے سید خالد محمود ڈپٹی کمشنر چودھری نذیر احمد سپرنٹنڈنٹ جیل اور پروفیسر افتخار احمد آگئے۔ ان سے کچھ دیر پہلے خان بہادر حاجی حبیب اللہ، جن سے کبھی کوئی رسم و راہ ہی نہ تھی تشریف لا چکے اور موجود تھے۔ چودھری نذیر احمد یا پروفیسر افتخار احمد نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا لیکن میں کچھ بے ہوشی اور رغنودگی کے عالم میں تھا۔

میں نے ہاتھ اُٹھا کہ انہیں سلام کرنا چاہا لیکن نہ کر سکا وہ دیر تک ساکت کھڑے رہے آخر ڈپٹی کمشنر نے پروفیسر سے کہا کہ سیال غذا منہ میں ڈالو، اب تو قوت مزاحمت نہیں ہے۔ نرسوں نے میرے جبڑے کھول دیئے اور کیپٹی لگا دی۔ پروفیسر نے گلوکوز دودھ اور انڈا ملا کر دینا چاہا لیکن گلے اور سینے کی حالت یہ تھی کہ باہر آگیا، میں اس

وقت جان بلب سا تھا، اور لاش کی طرح پڑا تھا۔ تینوں افیسر واپس چلے گئے، ڈی سی اور پروفیسر نے گورنر کو سارا ماجرا سنایا۔ گورنر نے پروفیسر سے کہا آپ فوراً اس کے پاس چلے جائیں میں صدر سے بات کر کے ابھی مطلع کرتا ہوں۔ گورنر نے موجود افسروں سے مشورہ کیا۔ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر نے رائے دی کہ اس حالت میں رہا کر دینا چاہیئے، الطاف گوہر نے بروایت کہا کہ جو ہوتا ہے ہو جائے حکومت کا وقار بھی تو کوئی چیز ہے۔

پروفیسر افتخار ابھی اپنے آفس میں پہنچے ہی تھے کہ ان کے اسسٹنٹ نے کہا۔ گورنر صاحب نے فوراً بلایا ہے۔

پروفیسر صاحب نے کہا" میں وہیں سے آ رہا ہوں"

" یہی کہا ہے کہ وہ ابھی گئے ہیں لیکن دوبارہ فوراً چلے آئیں" پروفیسر صاحب نے گورنر ہاؤس فون کیا تو جواب ملا فوراً آ ئیے۔ پروفیسر چلے گئے گورنر نے کہا شورش سے کہہ دو بھوک ہڑتال چھوڑ دے، حکومت نے غیر مشروط طور پر رہا کر دیا ہے، اس کو بچاؤ۔ ساتھ ہی پرائیویٹ سیکرٹری کو آرڈر کیا کہ سہ پہر کی خبروں میں نشر کرا دو اور اس کے بچوں کو لاہور فون پر اطلاع کر دو۔ پروفیسر افتخار احمد دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور مبارکباد دیتے ہوئے خبر سنائی ـــــ وہ چاہتے تھے کہ اب فوراً سیال غذا لوں۔ اور انہیں انجکشن وغیرہ لگانے سے نہ روکوں، لیکن میں نے ان سے رہائی کا پروانہ مانگا، کہنے لگے مذاق نہیں پولیس جا رہی ہے اب کوئی گارد نہیں رہی انہیں احکام مل گئے ہیں پروانہ حسب ضابطہ ہوم سیکرٹری کے دستخطوں سے شام تک پہنچ جائیگا۔ گورنر احکام جاری کرتا ہے پروانہ نہیں لیکن میں حکومت سے اتنا بدظن تھا کہ پروفیسر افتخار احمد جیسے انسان دوست اور خدا پرست سے بھی عذر کیا۔ کہ پہلے پروانہ دکھائیں پھر بھوک ہڑتال چھوڑوں گا۔ وہ سہ بارہ گورنر کے پاس گئے یا فون کیا، گورنر نے اپنے دستخطوں سے اس کاپی کی ایک نقل بھجوا دی جو ہوم سیکرٹری کو پی آئی سے بھیجی گئی تھی۔ پروفیسر

صاحب کے پاس اس کی نقل گورنر کا پیش کار لایا اور وہ پندرہ منٹ ہی میں آ گئے۔

کُل آٹھ دن ہی میں بھوک ہڑتال کا آخری دن کامیابی کے ساتھ بفضل تعالیٰ ختم ہو گیا۔ وہ سورج جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ اگلے سال ۹ جنوری کو اس کی پو پھٹے گی۔ ۲۵ دسمبر ہی کو طلوع ہو گیا۔

آناً فاناً پورے شہر میں خبر پھیل گئی سب سے پہلے چودھری محمد علی تشریف لائے میری آنکھیں کھلی تھیں اور کچھ نہ تھا آواز عنقا، رعشہ سخت، بدن لرزاں وہ کچھ دیر ٹھہرے پھر استقامت زندہ باد کہہ کر چلے گئے۔ آناً فاناً سڑک پر ایک بڑا ہجوم ہو گیا ہسپتال والوں کو مین گیٹ بند کرنا پڑا۔ میں غنودگی میں ڈوبا ہوا سن رہا تھا کئی آوازیں کانوں میں آ رہی تھیں کہ بس ختم ہو چکا ہے۔

۲۴ دسمبر کو لاہور سے میری بیوی، بیٹی شاہدہ اور بیٹا مسعود اختر نبضیں ڈوب رہی ہیں کا پڑھ کے گاڑی میں سوار ہو چکے تھے ــــــ وہ ۲۵ کو ساڑھے سات بجے شام ہسپتال پہنچ گئے۔ نرسوں نے میری اہلیہ کو گھیر لیا۔ مبارک باد دی کہ آغا صاحب رہا ہو گئے ہیں لیکن میں اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں تھا۔ پروفیسر افتخار احمد تب سے میری نبض پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھے اور انجیکشن پر انجیکشن دے رہے تھے۔ کوئی نو بجے شب میری حالت خطرے سے باہر ہو گئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو کوئی سی دھند نہ تھی، موت کی سرحد سے لوٹ آیا تھا۔

پروفیسر صاحب کو بارہ گھنٹے ہو گئے تھے اور وہ صبح سے اسی طرح تنگ و دو میں تھے انہوں نے میری بیوی سے کہا۔

"بہن، اللہ کا شکر ادا کرو۔ خطرہ ٹل گیا ہے"۔

ـــــ اور یہ تھا موت سے واپسی کا سرنامہ ـــــ



DOCUMENTS

&

Urdu Translation

Supplementary statement of Mr. Justice Shaukat Ali, Judge, High Court of West Pakistan, Lahore.

Mr. Justice M. Jamil Asghar, a Judge of this Court, lives at Tollinton Road, opposite to my house, in G.O.R. Estate, Lahore. Prior to his elevation to the Bench, he has been posted for sometime as District & Sessions Judge, Rawalpindi. He is a Golfer. From the talk that I had with him from time to time, I gathered that while posted as District & Sessions Judge, Rawalpindi, he came in contact with General Musa, the then Commander-in-Chief, and they used to play golf together at Rawalpindi. On one occasion, Mr. Justice M. Jamil Asghar took me to the Government House on Eid day and introduced me to the Governor, Mr. Muhammad Musa. Amongst other guests, we stayed there for about half an hour or so. On another occasion, Mr. Justice M. Jamil Asghar, who is also the President of the Golf Gymkhana invited the Governor at the annual function of the Gymkhana. I was also invited. There were a few guests when I, Mr. Justice M. Jamil Asghar and the Governor had a buffet dinner in the lawn of the Golf Gymkhana. I had a chat exclusively with the Governor there for about 30 to 35 minutes. I have also been meeting the Governor at other occasions. As mentioned in my earlier statement, the case of Begum Agha Abdul Karim Shorish Kashmiri was marked to the Bench comprising me and my learned brother Bashir-ud-Din Ahmad, J., after a week of my confirmation.

As for I recollect after the admission of the writ petition of Begum Agha Abdul Karim Shorish Kashmiri, Mr. Tariq Ismail Khan, now Joint Secretary (Home), Government of West Pakistan, came to me and told me that he was sent for by Sheikh Ikram-ul-Haque, Chief Secretary to Government of West Pakistan, who talked to him about the detention case of Shorish Kashmiri. The Chief Secretary told him that the Governor was unhappy with the conduct of the Bench hearing the case and that the Provincial Government was quite capable to handle the Judges. On being told that both the Judges, who were hearing the case, were permanent, he told him that the Provincial Government could resort to coercive measures and had various means to harass the Bench. He stated that the Chief Secretary was in rage and used harsh language for me in

particular. He stated that he thought that it was appropriate for him to convey this message to me as I might not suffer at the hands of the Governor. Later on, Mian Muhammad Akhtar, M.P.A., who is a close associate of Mr. Ahmad Saeed Kirmani and is also known to me, came to me with a message that the Governor had told Mr. Kirmani that it should be conveyed to me that he was shocked over my conduct in admitting the petition, particularly, when he (Governor) gave a very good chit in the matter of confirmation to me. I told him that the Governor was not conversant with the legal implications and that I and my brother Judge had acted according to law and being under the oath of office I had to administer justice.

The Bench heard arguments on the question as to whether after the amendment of S. 3 (2) clause (x) by Ordinance II of 1968, the Court had still the jurisdiction to question the legality of the order under Article 98 of the Constitution. The Bench took the view that the Court had the jurisdiction and held the Ordinance to be a subordinate legislation, which could not over-ride the provisions in the Constitution. This view of the Bench was affirmed by the Supreme Court. It is a well known fact and was talked openly throughout the country that Article 98 of the Constitution of Islamic Republic of Pakistan was being amended. So far as I know, a draft had been prepared. This information, however, leaked out and the President of Pakistan had to contradict in the press that there was no intention to amend the Article. It may be mentioned in this context that the Bar Council also passed a resolution that the power of the High Court under Article 98 should not be whittled down. On this matter, the former Law Minister may also be examined, who can throw much light as to what happened in his absence from the country regarding the amendment of Article 98 of the Constitution. It was also talked openly that the Government was not happy with the decisions of the Court.

In the year 1968, when I was on Summer Spell, Mr. Justice M. Jamil Asghar was sent for by the Governor Mr. Mohammad Musa. He met him and the case of Begum Agha Abdul Karim Shorish Kashmiri was the subject of discussion for about an hour. Mr. Justice M. Jamil Asghar came to me at my residence and told me that the Governor was not happy over the admission of the petition. He told me that the Governor had said that

the Government was quite strong and could harass the Judges. He stated that he was conveying this to me, as he was my friend and that it was proper for me to see that I should not suffer at the hands of the Governor, who was very keen in the case and wanted the dismissal of the petition. He told me as well that he had communicated this talk in its entirety to the Chief Justice of the High Court of West Pakistan. Later on, he affirmed this in my presence before Mr. Justice Bashir-ud-Din Ahmad in his Chambers. I also apprised the Chief Justice about it.

On 16th and 17th of December, 1968, the Chief Justice had a talk with me and my senior colleague on telephone. It could be gathered from his talk that some one at Lahore was contacting him on behalf of the Provincial Government. On one occasion, he desired that I should retire from the Bench. Mr. Justice Bashir-ud-Din Ahmad discussed the matter with me. Both of us were of the view that fault lay with the Advocate General and our retirement from the Bench would let down the judiciary in the country. In consequence, I addressed a letter, dated the 17th of December, 1968, to the Chief Justice and sent it by P.I.A. through the Additional Registrar, High Court Bench, Karachi, along with the interim orders passed by the Bench till that day. On December 18, 1968, in the morning, before we were to go to the Court to hear the case, another telephonic call came from the Chief Justice, which was for the senior member of the Bench, Mr. Justice Bashir-ud-Din Ahmad, who attended it and when he came back he was much depressed and said let both of us retire. I enquired the cause and he told me that the Chief Justice had asked him not to pass any controversial order and when he enquired as to what was meant by controversial order, he was told that the Minister concerned should not be summoned.

On return from Karachi, I and Bashir-ud-Din Ahmad, J., gathered from the Judges at Lahore that the Provincial Law Minister had been seeing the Chief Justice who had mentioned to them that the Law Minister had come to him and talked about the case. This confirmed the view that we had formed at Karachi that the Chief Justice was giving directions to the Bench at the instance of the Provincial Government.

At Eid reunion at the residence of the Chief Justice, where 10 to 12 Judges were present, the subject was broached

by Mr. Justice Bashir-ud-Din Ahmad, but there was consensus of opinion that the matter should better be discussed in the Judges meeting the next day. Accordingly, a meeting was held in the Chambers of the Chief Justice and lasted for about 1½ hours. The matter was discussed thread-bare and entire disclosure about the pressures which were brought to bear on the Bench were stated. The Chief Justice mentioned in the meeting that he was aware that the Provincial Government would provoke the Bench and he was told about it. It was disclosed by Mr. Justice Bashir-ud-Din Ahmad in the Judges meeting that the Chief Justice had spoken to him on telephone and had asked him not to pass any controversial order and when enquired as to what was meant by a controversial order, he was told by the Chief Justice that the Minister concerned should not be summoned. It was not contradicted by the Chief Justice.

In that meeting of the Judges, I and Mr. Justice Bashir-ud-Din Ahmad were asked to state whether we were prepared to disclose the name of the Judge concerned. Mr. Justice Bashir-ud-Din Ahmad was of the view that it should be disclosed. I was of the opinion that it should not be done, as that might bring conflict and create unpleasantness. Furthermore, it was announced by Mr. Justice Anwar-ul-Haq openly in the meeting that they would go and talk to the Chief Justice of Pakistan and ask him to accompany them to the President of Pakistan in order to bring this matter to his notice that the Judges were being intimidated. It was, therefore, that I throught that the name of the Judge should not be disclosed, to which Mr. Justice Bashir-ud-Din Ahmad agreed. However, the details about intimidation by the Governor through Mr. Justice M. Jamil Asghar were disclosed by me to Mr. S.M. Zafar, the then Central Law Minister, who later on, I gathered from the talk with the Chief Justice of West Pakistan, that he and Mr. S.M. Zafar had gone to the former President of Pakistan and had told him that harassment had been caused by the Provincial Governor to the Bench of the High Court. The details of the talk can be gathered from Mr. S.M. Zafar, the former President and the Chief Justice of the High Court of West Pakistan. Later on, the Chief Justice told me at his residence that the former President had told him that he had received my letter for interview, but he would call me when the things cooled down. This I mentioned to Mr. Justice Bashir-ud-Din Ahmad and Mr. Justice Fazl-i-Ghani.

I may state that at one stage, I gave a serious consideration to withdraw myself from the hearing of the case, but one thing which weighed with me was that I should not be cowed down by threats and decided to continue with the hearing of the case.

I may say that to the best of my memory that soon after when Sheikh Ikram-ul-Haque, took the oath as Acting Governor of West Pakistan,the Chief Justice of West Pakistan High Court sent for me. It was Saturday. He told me that the Provincial Governor was not happy with me and that I should see the President of Pakistan. The next day, I and Mr. Justice Fazl-i-Ghani were to go to Bahawalpur. We travelled in one car. On the way I told Mr. Justice Fazl-i-Ghani of the talk that had transpired between me and the Chief Justice.

I would like to add that in my view after the admission of the writ petition in question, the Provincial Government moved for the transfer of the case to Karachi or Peshawar. The intention behind the move was to get the case transferred from the Bench.

It was also rumoured that Bashir-ud-Din Ahmad,J., or myself are being appointed as the Chairman of the Appellate Industrial Tribunal, but the President of Pakistan did not approve of the suggestion of the Governor.

The intimidation to the Bench was a talk of the country and two of the dailies of Karachi, that is, Daily ? News and Jang, wrote editorials. Copies of the same will be transmitted in due course.

June 28, 1969. (Shaukat Ali)

Mr. Justice Shaukat Ali's letter to Mr. Justice Muhammad Gul, Law Secretary, Government of Pakistan

Lahore.
26th April, 1969.

My dear Judge,

Today you have recorded my statement in my Chambers in the High Court with regard to the petition under Article 128 (5) of the 1962 Constitution.

I purposely restricted myself to a mere narration of what happened in the Court in the interest of noble and high tradition of judiciary. I reserve the right of bringing to the notice of the concerned details which would bring the back-ground of lodging this complaint by the Provincial Government.

During the proceedings a lot of pressure was put on the Bench hearing Agha Shorish Kashmiri's case from the side of the Provincial Government, the details of which would be mentioned, if necessary.

Yours Sincerly,
(Shaukat Ali)

Mr. Justice Muhammad Gul,
Law Secretary,
Government of Pakistan,
Islamabad.

Mr. Justice Shaukat Ali's letter to the Chief Justice of West Pakistan

Lahore.
February 3, 1969.

My dear Chief Justice,

Never in the history of the Judiciary-not ever during Foreign Domination Judges were so shabbily treated as was done in the case of the Bench entrusted with the hearing of the writ petition challenging the detention of Agha Abdul Karim Sherish Kashmiri under the Defence of Pakistan Rules. There were visible attempts from the very outset of the hearing of the petition to influence the Bench. When the members of the Bench did not succumb to such influences then there were threats communicated to the effect that Judges could also be harassed. When these threats had gone unheeded investigation was held into the assets of the members of the Bench.

During the hearing of the petition at Karachi, when we decided to retire, the attitude adopted by the Law Officers of the Government, to say at least, was not only disrespectful but also calculated to annoy the Bench. This course was deliberately adopted so that in the case of a flare up Government might once again make an attempt to seek transfer of the proceedings to some other Bench as it had on a previous occasion, failed in a move in that direction. We finally decided to retire from the hearing when we got the message that we could proceed with the hearing but were told not to pass any order on my controversial matter particularly the summoning of the Provincial Minister for Finance, Information and Broad-casting as a witness. When we retired from the hearing we learnt in Lahore that the aforesaid Minister attributed a statement to the Head of the State saying that if any Judge had raised his little finger towards the Minister he would have been beheaded. Such an attitude on the part of Government towards the Judges of a superior court is unheard of. We were harassed, intimidated and

threatened. We narrated all this in the Judges meeting convened for considering the constitution of a Bench to hear the contempt matter against the Advocate-General. Thereafter we were told the Provincial Government had a reference made to the Supreme Judicial Council which we are now given to understand, has been rejected. We feel that had we succumbed to the tactics adopted to undermine the independence of the Judiciary we would not have been true to the oath of our office. We strongly feel that Government by these moves had made it difficult for the Bench to administer justice without fear or favour. We desire that the matter be considered in a meeting of all the Judges and the issue taken up with the Head of the State in consultation with the Chief Justice of Pakistan in the larger interest not only of this Court and the judiciary in the country but also in the larger interest of the litigant public who invariably seek redress whenever they feel that the Executive had behaved in a manner contrary to law.

Yours sincerely,

(Shaukat Ali)

An Extract from the Statement of Mr. S. I. Haque, C. S. P. Ex-chief Secretary, Government of West Pakistan

10. At this juncture, Mr. Kirmani who was feeling all powerful started to settle scores with his old adversaries; Mr. Shorish Kashmiri against whom he had a personal vendatta was made the first target. The trouble started at Iqbal Day meeting held on 21st April, 1968, in the University Hall. Mr. Kirmani tried to break up this meeting which was presided over by the Chief Justice of West Pakistan, through his hirelings. Mr. Shorish Kashmiri reacted strongly against this. Mr. Kirmani using his iufluence with the Governor had Mr. Shorish arrested, his Press confiscated and his weekly paper the "Chatan" closed down. This was a remarkable act of political shortsightedness. The reaction in the Punjab was very adverse. When I was told after the orders had been issued, I pointed out that the penalty was far too severe and that in the first instance a warning or a 'gag' order should have been issued. The rest is public knowledge. This developed into a major clash between the Government and the High Court. Twice Shorish Kashmiri went on prolonged hunger strikes, and on both occasions was saved from the jaws of death through my intervention. On the advice of Mr. Kirmani, Governor Musa held firmly to the view that Shorish Kashmiri should be allowed to die in detention. However, I persisted in my duty and kept on telling the Governor that we must not give up the established norms of Civilized Administration, that if he died in detention, Shorish Kashmiri would become a political Martyr, Government would get a bad name both internationally and internally and that in my case, the repercussions within the country would be serious indeed. It was only when Shorish Kashmiri had collapsed completely on both occasions and the doctor had said that death was likely to take place within a few hours, then the Governor relented.

(S. I. Haque)

دستاویز

زیرِ نظر کتاب مکمل ہو گئی اور طباعت کے مرحلے میں تھی کہ بعض دستاویز ہاتھ آگئیں۔
ظاہر ہے کہ انہیں متن میں شامل کرنا مشکل تھا۔

مسٹر ایس آئی حق سابق چیف سیکرٹری مغربی پاکستان جو کچھ دنوں صوبہ کے ایکٹنگ گورنر بھی رہے تھے جنرل یحییٰ کے زمانہ صدارت میں ۳۰۳ افسروں کے ساتھ الگ کئے گئے تو انہوں نے اپنے خلاف عائد کردہ الزامات کے جواب میں جو لکھا اُسی سے مندرجہ اقتباس ماخوذ ہے۔ مسٹر ایس آئی حق کے برخاست کئے جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے زمانہ میں ڈیفنس سیکرٹری بھی رہے تھے۔ ایوب خان نے اُن سے پوچھا کہ یحییٰ خان کو کمانڈر انچیف بنا دیا جائے تو کیا خیال ہے؟ مسٹر ایس آئی حق نے جواب دیا کہ شرابی کبابی آدمی ہے ملک کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ ایوب خان نے یحییٰ کو کمانڈر انچیف بنایا تو اسے یہ بات بھی بتادی۔ یحییٰ نے بہت دنوں بعد اُس کا انتقام اِس طرح لیا کہ اُنہیں ملازمت سے اُٹھا کر رخصت کر دیا۔

جسٹس شوکت علی کا بیان اور خطوط کسی توضیح یا تشریح کے محتاج نہیں۔
دونوں کا انگریزی متن دے دیا ہے تاکہ انگریزی خواندہ حضرات اصل مطالعہ کر لیں اور جو صرف اردو جانتے ہیں ان کے لئے ترجمہ کر دیا ہے۔

جسٹس شوکت علی کا اضافی بیان

مسٹر جسٹس ایم جمیل اصغر جو اس عدالت کے جج ہیں وہ جی او آر سٹیٹ لاہور میں ڈولنٹن روڈ پر میرے مکان کے عین سامنے رہتے ہیں۔ اس عدالت کی کرسی پر فائز ہونے سے پہلے وہ کچھ عرصہ راولپنڈی میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج بھی رہ چکے ہیں۔ وہ گاف کے شوقین کھلاڑی ہیں۔ اُن کے اور میرے مابین وقتاً فوقتاً جو گفت گو ہوئی اس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ جب راولپنڈی میں ڈسٹرکٹ وسیشن جج تھے اُس وقت اُن کی جنرل موسیٰ سے کافی رسم و راہ پیدا ہوگئی۔ جنرل موسیٰ اُن دنوں کمانڈر انچیف تھے اور دونوں راولپنڈی میں ایک ساتھ گاف کھیلا کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ مسٹر جمیل اصغر عید کے روز مجھے بھی اپنے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس لے گئے اور گورنر موسیٰ سے میرا تعارف کرایا۔ ہم وہاں دیگر مہمانوں کے ساتھ قریباً نصف گھنٹہ ٹھہرے رہے۔ ایک دوسرے موقعہ پر مسٹر جسٹس ایم جمیل اصغر نے جو جم خانہ گاف کے صدر بھی ہیں گورنر موسیٰ کو جم خانہ کی تقریب میں شمولیت کی دعوت دی۔ میں اِس دعوت میں تھا وہاں گاف جم خانہ کے لان میں۔ مسٹر جسٹس اصغر گورنر موسیٰ اور میں عشائیہ تناول کر رہے تھے کچھ اور مہمان بھی وہاں موجود تھے۔ لیکن تیس پینتیس منٹ تک میرے اور گورنر کے درمیان بات چیت رہی۔ میں گورنر موصوف سے دیگر مواقع پر بھی ملتا رہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے قبل ازیں بیان کیا ہے میرے مستقل ہو جانے کے ایک ہفتہ بعد بیگم آغا عبدالکریم شورش کاشمیری کا

مقدمہ اس بینچ کے حوالہ کر دیا گیا جس میں مَیں اور میرے فاضل برادر محترم بشیر الدین احمد شامل تھے۔

جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے بیگم آغا شورش کاشمیری کی رٹ درخواست کی منظوری برائے سماعت کے بعد مسٹر طارق اسماعیل خاں جو ان دنوں حکومت مغربی پاکستان کی وزارت داخلہ کے جائنٹ سیکرٹری ہیں میرے پاس آئے اور کہنے لگے "مجھے حکومت مغربی پاکستان کے چیف سیکرٹری شیخ اکرام الحق نے بلایا تھا اور شورش کاشمیری کے مقدمہ نظربندی کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ چیف سیکرٹری نے بتایا کہ گورنر موسیٰ شورش کاشمیری کا مقدمہ سننے والے بینچ کے رویہ سے ناخوش ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ صوبائی حکومت ان ججوں سے نپٹنا خوب جانتی ہے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ اس مقدمہ کی سماعت کرنے والے دونوں جج مستقل ہیں تو انہوں نے کہا صوبائی حکومت بینچ کو ہراساں کرنے کے لئے جارحانہ اقدامات اور کئی دوسرے ذرائع بروئے کار لا سکتی ہے۔" مسٹر طارق نے مزید بتایا کہ چیف سیکرٹری غیض وغضب کے عالم میں تھے بالخصوص میرے بارے میں انہوں نے نہایت سخت زبان استعمال کی۔ انہوں نے مناسب سمجھا کہ یہ پیغام مجھ تک پہنچا دیا جائے تاکہ مجھے کہیں گورنر کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

بعد ازاں میاں محمد اختر ایم پی اے جو احمد سعید کرمانی کے کافی قریب ہیں اور جو میرے بھی واقف کار ہیں، میرے پاس یہ پیغام لائے کہ گورنر موصوف نے احمد سعید کرمانی سے کہا ہے کہ مجھے مطلع کر دیا جائے کہ میں نے اس مقدمے کی سماعت منظور کر کے گورنر کو بہت بڑا صدمہ پہنچایا ہے حالانکہ انہوں نے میری مستقلی کے لئے پُرزور سفارش کی تھی۔

میں نے انہیں بتایا کہ گورنر کو قانونی اشکال کا صحیح طور پر علم نہیں۔ میرے

فاضل جج بھائی اور میں نے یہ اقدام قانون کے تقاضوں اور انصاف کے نفاذ کے لئے اپنے حلف کی تکمیل میں اُٹھایا ہے۔

عدالتی بنچ نے اس سوال پر تمام دلائل کو سُنا کہ آیا سکیشن ۳ (۲)، شق ۱۰ ایس آرڈیننس دوئم مجریہ ۱۹۶۸ء کے تحت ترمیم کے بعد بھی عدالت کو آئین کی دفعہ ۹۸ کے تحت جاری ہونے والے حکم کے قانونی جواز کا تعین کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ تو بنچ نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ عدالت اس کی مجاز ہے۔ اس نے آرڈی ننس کو ذیلی قانون کے زمرہ میں رکھا ہے جو آئینی دفعات پر قطعاً حاوی نہیں ہو سکتا۔

ہمارے بنچ کے نقطہ نظر کی سپریم کورٹ نے بھی توثیق کر دی اور یہ بات حقیقت کے طور پر ظاہر ہو گئی ـــــ اور تمام ملک میں کھلے بندوں کہی جا رہی تھی کہ اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کے دستور کی دفعہ ۹۸ میں ترمیم کی جانے والی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کا مسودہ تیار ہو چکا تھا، لیکن جیسے ہی یہ خبر عام ہوئی صدر پاکستان کو اخبارات کے ذریعہ تردید کرنا پڑی کہ وہ ترمیم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ اسی سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بار کونسل نے بھی اس ضمن میں ایک قرارداد پاس کی تھی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ دفعہ ۹۸ کے تحت ہائی کورٹ کو جو اختیارات حاصل ہیں انہیں کالعدم نہ کیا جائے۔

اس مسئلے کے بارے میں سابق وزیر قانون کی شہادت بھی ازبس ضروری ہے جو اس امر پر بہتر انداز میں روشنی ڈال سکتے ہیں کہ اُن کی ملک سے غیر حاضری کے دوران دستور کی دفعہ ۹۸ کے سلسلے میں کیا ہوا؟ یہ بات بھی پھیل چکی ہے کہ عدالت کے اس فیصلے پر حکومت ناخوش تھی۔

۱۹۶۸ء میں جب میں گرمیوں کی رخصت پر تھا مسٹر جسٹس ایم جمیل اصغر کو گورنر محمد موسیٰ نے بلا بھیجا۔ جسٹس موصوف اُن سے ملے اور وہاں ایک گھنٹہ تک

بیگم آغا شورش کاشمیری کے مقدمہ سے متعلق گفت گو رہی۔ مسٹر جسٹس ایم جمیل اصغر میرے گھر تشریف لائے اور کہنے لگے کہ گورنر رٹ کو منظور کرنے پر سخت ناراض ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ گورنر یہ کہہ رہے تھے کہ حکومت بے حد طاقتور ہے اور وہ ججوں کو کافی پریشان کر سکتی ہے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ بات میں آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ میں آپ کا دوست ہوں اور میرے لئے یہ مناسب ہوگا کہ میں ان حالات کی روشنی میں کوشش کروں کہ گورنر کے ہاتھوں مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے کیونکہ گورنر اس مقدمہ میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہم اس درخواست کو مسترد کر دیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے یہ گفت گو مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو من وعن سنا دی ہے۔ بعد ازاں مسٹر جسٹس بشیر الدین احمد کے سامنے میری موجودگی میں انہوں نے اسے دہرایا۔ میں نے چیف جسٹس کو اس گفت گو سے کما حقہ، آگاہ کر دیا۔

۱۶ اور ۱۷ دسمبر ۱۹۶۸ء کو چیف جسٹس نے میرے اور میرے سینئر رفیق سے ٹیلیفون پر گفت گو کی۔ ان کی بات سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ صوبائی حکومت کی طرف سے لاہور میں کسی نے ان سے رابطہ پیدا کیا ہے۔ ایک بار انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں بنچ سے ریٹائر ہو جاؤں۔ مسٹر جسٹس بشیر الدین احمد نے اس مسئلہ پر مجھ سے تبادلہ خیال کیا۔ ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ سارا قصور ایڈوکیٹ جنرل کا ہے اگر ہم اس بنچ سے ریٹائر ہو گئے تو ملک میں عدلیہ کا وقار خاک میں مل جائے گا۔

آخر کار میں نے ۱۷ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ہائی کورٹ بنچ کراچی کے ایڈیشنل رجسٹرار کے توسل سے چیف جسٹس کے نام ایک مراسلہ پی آئی اے کے ذریعہ روانہ کیا۔ جس کے ساتھ وہ عبوری احکام بھی منسلک تھے جو ہم اس وقت تک جاری کر چکے تھے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۶۸ء کی صبح جب ہمیں سماعت کے لئے عدالت میں جانا تھا چیف جسٹس کا ایک اور فون موصول ہوا جسے بنچ کے سینئر رکن مسٹر جسٹس بشیر الدین احمد نے سنا۔

جب واپس آئے تو ان کا چہرہ پژمردہ تھا۔ انہوں نے آتے ہی کہا آئیے ہم دونو بنچ سے ریٹائر ہو جائیں۔ میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگے چیف جسٹس فرما رہے تھے کہ ہم کوئی متنازعہ فیہ حکم جاری نہ کریں۔ جب میں نے اُن سے پوچھا کہ متنازعہ فیہ حکم سے آپ کی مراد کیا ہے ؟ تو کہنے لگے کہ وزیر متعلقہ کو عدالت میں طلب نہ کیا جائے۔

کراچی سے میں اور بشیر الدین احمد واپس لوٹے تو لاہور کے جج صاحبان سے معلوم ہوا کہ صوبائی وزیر قانون چیف جسٹس سے ملتا رہا ہے۔ چیف جسٹس نے ان ججوں کو بتایا تھا کہ وزیر قانون اُن سے کئی بار مل چکا ہے اور مقدمے کے بارے میں اکثر تذکرہ کرتا رہا ہے اس سے ہمارا یہ قیاس ٹھوس حقیقت کی صورت میں سامنے آگیا کہ چیف جسٹس صوبائی حکومت کی ایماء پر ہمیں ہدایات دیتے رہے ہیں۔

چیف جسٹس کی اقامت گاہ پر عید ملاپ پارٹی میں جہاں دس یا بارہ جج موجود تھے مسٹر جسٹس بشیر الدین احمد نے اس موضوع کو چھیڑا۔ لیکن بشیر کا موقف یہ تھا کہ اس مسئلے کا ججوں کی میٹنگ میں اگلے دن بھرپور جائزہ لیا جائے۔

چنانچہ چیف جسٹس کے عدالتی کمرے میں یہ میٹنگ منعقد کی گئی جو ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔ اس میں مسئلہ زیر غور کی ہر پہلو سے چھان پھٹک کی گئی۔ اور ہمارے بنچ پر حکومت جن ہتھکنڈوں سے دباؤ ڈال رہی تھی اُن سب کا ذکر ہوا۔

چیف جسٹس نے اجلاس میں اس امر کا برملا اعتراف کیا کہ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ صوبائی حکومت بنچ کو مشتعل کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی ہے۔ مسٹر جسٹس بشیر الدین احمد نے ججوں کے اس اجلاس میں یہ بھی بتایا کہ چیف، جسٹس نے اس مسئلے کے بارے میں اُن سے فون پر بات کی تھی اور صاف طور پر یہ کہا تھا کہ ہم کوئی متنازعہ فیہ حکم جاری نہ کریں۔ اور جب اِن سے اس کی وضاحت طلب کی گئی تو چیف جسٹس نے فرمایا کہ وزیر متعلقہ کو عدالت میں نہ بلایا جائے۔ چیف جسٹس اس کی تردید نہ کر سکے۔

ججوں کے اس اجلاس میں مجھ سے اور مسٹر جسٹس بشیر الدین احمد سے یہ دریافت کیا گیا کہ ہم متعلقہ جج کا نام بتانے پر آمادہ ہیں یا نہیں ؟ مسٹر جسٹس بشیر الدین احمد کی رائے تھی کہ ہمیں نام کا انکشاف کر دینا چاہیئے ۔ میرا عندیہ یہ تھا کہ ایسا نہ کیا جائے کیونکہ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو اس پر جھگڑا بڑھے گا اور ایک ناخوشگوار ماحول پیدا ہو جائے گا ۔ علاوہ ازیں مسٹر جسٹس انوار الحق نے اس اجلاس میں واشگاف طور پر کہا کہ وہ اس سلسلے میں چیف جسٹس آف پاکستان سے مل کر درخواست کریں گے کہ وہ ان کے ساتھ صدر پاکستان کے پاس چلیں تاکہ یہ چیز ان کے علم میں لائی جائے کہ ججوں کو ہراساں اور خوفزدہ کیا جا رہا ہے ۔ اسی بنا پر میرا یہ خیال تھا کہ جج کا نام ظاہر نہ کیا جائے ۔ جس سے مسٹر جسٹس بشیر الدین احمد بھی متفق ہو گئے ۔ البتہ گورنر موسیٰ نے جسٹس جمیل اصغر کے ذریعہ ہمیں جو دھمکیاں دی تھیں ، میں نے ان کی جملہ تفصیلات سے اس وقت کے وزیر قانون ایس ایم ظفر کو آگاہ کر دیا تھا ۔ بعد میں مجھے چیف جسٹس مغربی پاکستان کی گفت گو سے معلوم ہوا کہ وہ اور مسٹر ایس ایم ظفر صدر پاکستان سے ملے تھے اور انہیں صاف صاف بتا دیا تھا کہ ہائی کورٹ بینچ کو صوبائی گورنر نے خائف اور پریشان کرنے کی پوری کوشش کی ہے ۔ اس گفت گو کی تمام تفصیلات مسٹر ایس ایم ظفر ، سابق صدر پاکستان اور مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے معلوم کی جا سکتی ہیں ۔ اس کے بعد ایک بار چیف جسٹس نے اپنی رہائش گاہ پر مجھے بتایا کہ سابق صدر پاکستان نے انہیں اس بات سے آگاہ کیا تھا کہ انہیں میرا وہ مکتوب مل گیا تھا جس میں ان سے انٹرویو کی درخواست کی گئی تھی ۔ صدر پاکستان نے فرمایا تھا کہ وہ مجھے اس وقت بلائیں گے جب حالات پُرسکون ہو جائیں گے ۔ میں نے مسٹر جسٹس بشیر الدین احمد اور مسٹر جسٹس فضل غنی سے اس کا ذکر کر دیا تھا ۔

اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ میں نے ایک مرحلہ میں اس مقدمے کی سماعت سے دستبردار ہونے کے بارے میں پوری سنجیدگی سے غور کیا تھا ۔ لیکن یہ خیال میرے

ذہن میں پوری طرح راسخ ہو گیا تھا کہ مجھے دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہیئے اور نہ مقدمے کی سماعت سے دستبرداری صحیح ہو گی۔

جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے جونہی شیخ اکرام الحق صاحب نے قائم مقام گورنر کی حیثیت سے حلف وفاداری اٹھایا مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے مجھے بلا بھیجا۔ ہفتے کا دن تھا انہوں نے فرمایا کہ صوبائی گورنر مجھ سے ناراض ہیں اور مجھے صدر پاکستان سے ضرور ملنا چاہیئے۔ دوسرے دن مجھے اور مسٹر جسٹس فضل غنی کو بہاولپور کے لئے تیار کرنا تھا۔ ہم نے ایک ہی کار میں سفر کیا۔ راستے میں مسٹر جسٹس فضل غنی کو میں نے اس گفت گو سے آگاہ کر دیا جو میرے اور چیف جسٹس کے درمیان ہوئی تھی۔ یہاں میں اس امر کا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ رٹ درخواست کی سماعت کی منظوری کے بعد صوبائی حکومت نے اس مقدمے کو لپشاور یا کراچی منتقل کرانے کی درخواست بھی دی تھی۔ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہمارے بنچ سے یہ مقدمہ کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔

یہ افواہ بھی گشت کر رہی تھی کہ جسٹس بشیر الدین احمد یا مجھے اپیلاٹ صنعتی ٹربیونل کا چیئرمین مقرر کیا جا رہا ہے لیکن صدر پاکستان نے گورنر کی اس تجویز پر صاد نہ کیا ہمارے بنچ کو جس طرح مرعوب اور خائف کرنے کی حرکتیں کی گئیں پورے ملک میں اس کا چرچا عام ہو گیا اور کراچی کے دو روزانہ اخبارات یعنی "ڈیلی نیوز" اور "جنگ" نے اداریے سپرد قلم کئے جن کی نقول وقت آنے پر فراہم کر دی جائیں گی۔

شوکت علی

مورخہ ۲۸ جون سنہ ۱۹۶۹ء

لاہور
۲۶ اپریل ۱۹۶۹ء

خط بنام جسٹس محمد گل

سیکرٹری قانون حکومت پاکستان

محترمی جج صاحب!

۱۹۶۲ء کے دستور کی دفعہ ۱۲۸ (۵) کے تحت جو درخواست دائر کی گئی ہے آج آپ نے ہائی کورٹ میں میرے کمرے میں میرا بیان لیا۔ قانون کی اعلیٰ اور مقدس روایات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے عمداً صرف انہی واقعات کے تذکرہ پر اکتفا کیا جو عدالت میں ہوئے تھے۔ صوبائی حکومت نے جس حقیقی پس منظر کے ساتھ یہ شکایت کی ہے مجھے اس کی تمام متعلقہ تفصیلات کو بے نقاب کرنے کا حق حاصل ہے اور میں یہ حق اپنے لئے محفوظ رکھتا ہوں۔

جب ہم آغا شورش کاشمیری کا مقدمہ سماعت کر رہے تھے صوبائی حکومت کی طرف سے ہمارے بنچ کو ہر طرح سے خائف اور ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی۔ پورے کوائف بوقت ضرورت آپ کے گوش گذار کر دیئے جائیں گے۔

آپ کا مخلص
شوکت علی

بخدمت

مسٹر جسٹس محمد گل

سیکرٹری قانون، حکومت پاکستان

اسلام آباد

لاہور

۱۳ فروری ۱۹۶۹ء

خط بنام چیف جسٹس

پاکستان ڈیفنس رولز کے تحت آغا شورش کاشمیری کی نظر بندی کے مقدمے کی سماعت جس بنچ کو تفویض کی گئی ہے اُس کے ججوں سے جو نا روا سلوک روا رکھا گیا ہے عدلیہ کی ساری تاریخ بلکہ غیر ملکی تسلط کے دوران بھی اُس کی مثال نہیں ملتی۔ سماعت کے آغاز ہی میں عدالت پر اثر انداز ہونے کی کھلے بندوں کوششیں کی گئیں۔ جب بنچ کے ارکان متاثر نہ ہوئے تو انہیں یہ دھمکی دی گئی کہ ججوں کو ہراساں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ان دھمکیوں کا نتیجہ بھی خاطر خواہ نہ نکلا اور ججوں نے کوئی اثر نہ لیا تو بنچ کے ارکان کے اثاثہ کا خفیہ طور پر کھوج لگانا شروع کر دیا گیا۔

کراچی میں مقدمے کی سماعت کے دوران جب ہم نے دستبردار ہونے کے بارے میں فیصلہ کیا تھا تو حکومت کے قانونی مشیروں کا طرزِ عمل نہ صرف ہماری عزت اور وقار کے منافی تھا بلکہ اُن کا رویہ اشتعال انگیز بھی تھا۔ یہ رویہ جان بوجھ کر اختیار کیا گیا تھا کہ ہم مشتعل ہو جائیں تو انہیں انتقالِ مقدمہ کا جواز بہ آسانی ہاتھ آجاتے کیونکہ اس سلسلے میں اُن کی پہلی مساعی ناکام ہو چکی تھیں۔ جب ہمیں یہ پیغام ملا کہ ہم سماعت جاری رکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ہم متنازعہ فیہ فیصلہ نہ کریں یعنی صوبائی وزیر خزانہ و اطلاعات و نشریات کو بطور گواہ عدالت میں طلب نہ کریں تو ہم نے ریٹائر ہونے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

جب ہم فارغ ہو کر لاہور پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ صوبائی وزیر نے صدرِ پاکستان

کے نام ایک بیان منسوب کیا ہے جس میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر کسی جج نے وزیر کی طرف اہانت آمیز انگلی بھی اٹھائی تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ عدالت عالیہ کے منصفوں کے بارے میں حکومت کے اس رویہ کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ ہمیں مرعوب اور ہراساں کیا گیا ہمیں دھمکیاں دی گئیں۔ ہم نے یہ تمام تفصیلات ججوں کے اُس اجلاس میں بیان کر دی تھیں جو ایڈووکیٹ جنرل کے خلاف توہین عدالت کے مقدمہ کے سلسلے میں بنچ کی تشکیل کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ صوبائی حکومت نے یہ معاملہ سپریم جوڈیشل کونسل کے سپرد کر دیا ہے۔ جس کے بارے میں اب معلوم ہوا ہے کہ مسترد کر دیا گیا ہے۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہم عدلیہ کی آزادی کو ختم کرنے کے ان ہتھکنڈوں کا مقابلہ نہ کرتے تو ہم اپنے عہدوں کی مٹی خود اپنے ہاتھوں پلید کرتے۔ ہمارا یہ پختہ یقین ہے کہ حکومت نے اپنی ان حرکات سے عدالت کے لئے مشکل بنا دیا ہے کہ وہ بے خوف و خطر انصاف کے تقاضے پورے کرے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ یہ مسئلہ ججوں کے اجلاس میں پیش کیا جائے اور بعد ازاں پاکستان کے چیف جسٹس کے مشورہ سے صدر مملکت کی خدمت میں زیر بحث لایا جائے۔ یہ نہ صرف اس عدالت اور عدلیہ کے وسیع تر مفاد میں ہے بلکہ یہ معاملہ ملکی مفاد کے پیش نظر ان امن پسند شہریوں کے لئے بھی سود مند ہوگا جو انتظامیہ کے ہاتھوں لاچار اور بے بس ہو چکے ہیں۔ ان کی مظلومیت کا علاج عدالت ہی ہے جو ان سے ناانصافی کو انصاف و قانون کی روشنی میں دیکھتی ہے۔

آپ کا مخلص

(شوکت علی)

مسٹر ایس آئی حق چیف سیکرٹری کے بیان کا اقتباس

"اس مرحلہ میں مسٹر کرمانی خود کو بے حد مضبوط اور طاقت ور محسوس کر رہے تھے انہوں نے اپنے دیرینہ مخالفین سے دو دو ہاتھ کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ مسٹر شورش کاشمیری جن کے خلاف اُس کے دل میں ذاتی بغض و عناد اور انتقامی جذبہ موجزن تھا۔ اُن کا پہلا ہدف بنے۔ اس خرابی کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء کو یوم اقبال کی تقریب یونیورسٹی ہال میں منعقد کی گئی تو مسٹر کرمانی نے اپنے اجیروں کے ذریعہ اس اجلاس کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ اس اجلاس کی صدارت کے فرائض مغربی پاکستان کے چیف جسٹس سرانجام دے رہے تھے۔ آغا شورش کاشمیری نے اس مذموم حرکت کا سختی سے جواب دیا۔ مسٹر کرمانی نے گورنر کو ترغیب دے کر آغا شورش کاشمیری کو گرفتار کرا دیا۔ اُس کا پریس ضبط کرنے کے علاوہ ہفت روزہ "چٹان" بند کر دیا گیا۔ یہ سیاسی کوتاہ نظری کا ایک گھناؤنا طرز عمل تھا کہ پنجاب میں اس کا ردِ عمل خوفناک ہو گیا۔ جب ان احکام کے جاری ہونے کے بعد مجھے پتہ چلا میں نے اس امر کی نشاندہی کی کہ یہ سزا بے حد کڑی ہے ہمیں اوّل تو ایک وارننگ دینی چاہیئے تھی یا پرچے کی ضبطی کافی ہوتی۔ باقی جو کچھ ہوا وہ عوام سے مخفی نہیں۔ یہیں سے حکومت اور ہائی کورٹ کے درمیان ایک بڑے تصادم کی بنیاد پڑ گئی۔ اس دوران میں شورش کاشمیری نے دو دفعہ طویل عرصہ کے لئے بھوک ہڑتال کی اور دونوں دفعہ میری مداخلت کی بنا پر وہ موت کے بے رحم چنگل سے بچ نکلا۔

مسٹر کرمانی کے مشورے پر گورنر موسیٰ اس خیال پر سختی سے ڈٹ گئے کہ شورش کاشمیری

کو اندر ہی مرنا چاہیئے۔

میں نے اپنے فرائض کو محسوس کرتے ہوئے گورنر کو ہمیشہ یہ مشورہ دیا کہ ہمیں ہر حالت میں ایک مہذب انتظامیہ کا پختہ کردار ادا کرنا چاہیئے اگر شورش کاشمیری نظر بندی کے دوران وفات پا گیا تو وہ ایک سیاسی شہید کا رتبہ حاصل کرلے گا اور حکومت ملک کے علاوہ بین الاقوامی طور پر بڑی طرح بدنام ہوگی۔ میرے خیال میں اس طرح ملک میں جو اثرات رونما ہوں گے وہ ایک خطرناک صورتِ حال کی غمازی کریں گے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب شورش کاشمیری بھوک ہڑتال کے دونوں مواقع پر جان ہار رہے تھے اور ڈاکٹروں کی رائے میں موت چند گھنٹوں میں واقع ہونے والی تھی۔ نتیجتہً گورنر جھک گیا۔

(ایس آئی حق)

پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندَڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اوندا سوندا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪانئُو، ياچوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙَهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنيٰ e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاريِ تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعويٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳِئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. بين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصي ۽ ٽالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَبِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَ پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَ سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ کان وَڏِ کتاب خريد کَري کتابن جي ليکَکَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل کرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي کوشش دوران کَنهن بہ رُکاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار کَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو بوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها کن ٿا، موتي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالههَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،

جيکي بہ کٽين، جيکي بہ کٽين!

مون لاءِ بنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات کَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ-

اِن حسابَ سان اٽجاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ "هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن کري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو" ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **ڇو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽل گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ ٻين کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ڀاڪرِ پائي چيو تہ ”منهنجا يارُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)